ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈُوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
اقبالؒ

کتابُ التقدیر

(دُنیا کے مُشکل ترین مسئلہ کا قابلِ فہم بصیرت افروز حل)

پرویزؒ

طلوعِ اِسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ۵۴۶۶۰

نام کتاب	———	کتاب التقدیر
مصنف	———	علامہ غلام احمد پرویزؒ
شائع کردہ	———	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) گلبرگ ۲، لاہور ۵۴۶۶۰
طابع	———	خالد منصور نسیم
مطبع	———	النور پرنٹرز و پبلشرز، ۲/۳ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵۔
ایڈیشن اوّل	———	اکتوبر ۱۹۷۱ء
ایڈیشن دوم	———	جون ۱۹۷۵ء
ایڈیشن سوم	———	ستمبر ۱۹۸۶ء (بلاترمیم)
ایڈیشن چہارم	———	جون ۱۹۹۴ء (بلاترمیم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

کتابُ التّقدیر

تیسرا باب ـــ انسان

چھٹا باب ـــ "قوموں کی تقدیر"

ساتواں باب ـــ خیر و شر

گیارہواں باب ـــ ہدایت و ضلالت

تیرھواں باب
تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ

اٹھارواں اور آخری باب ۔ نگہِ بازگشت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دنیائے مذہب ہو یا جہانِ فلسفہ، آپ کسی سے پوچھئے کہ ان کے ہاں سب سے مشکل، پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ کونسا ہے تو ان کا ایک ہی جواب ہوگا ــــ مسئلہ تقدیر ــــ دیکھئے تو اس مسئلہ پر اتنا لٹریچر ملے گا جس سے انبار کے انبار لگ جائیں اور اسے پڑھئے تو نہ صرف یہ کہ بات کچھ پلے نہ پڑے، بلکہ آپ کا ذہن مزید شکوک و شبہات کی آماجگاہ اور آپ کا دل پہلے سے بھی زیادہ پیچ و تاب کا گرداب بن جائے۔ جب میرے سلسلۂ معارف القرآن کی آخری کڑی ــــ جہانِ فردا ــــ شائع ہو گئی، اور لغات القرآن اور مفہوم القرآن جیسی ضخیم اور بسیط تصانیف پہلے مکمل ہو چکی تھیں، تو میں نے سمجھا کہ فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا جو مقدس مشن میں نے اپنے سامنے رکھا تھا، بحمدہٖ اس کی اس حد تک تکمیل ہو گئی ہے، اور میری زندگی کا بقایا عرصہ تبویب القرآن کی ترتیب و تدوین کے لئے وقف رہے گا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ قارئین کی طرف سے، قرآنی نکات کی مزید وضاحت کے لئے جو استفسارات موصول ہو رہے ہیں، ان کا قریب نوے فی صد حصہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ، مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے۔ یہ سوالات، بلکہ یوں کہئے کہ اعتراضات، بیشتر نوجوان طبقہ کی طرف سے موصول ہوئے۔ ان کا ملخص یہ تھا کہ جو مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہو کہ انسان کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے، نہ وہ مٹ سکتا ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کچھ ہو سکتا، اس مذہب کو لے کر ہم مصافِ زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کیا کر سکتے ہیں؟ اور جس طبقہ نے قرآنِ کریم کا مطالعہ شروع کر دیا تھا ان کا اعتراض یہ تھا کہ ہمیں تو اس میں قدم قدم پر تضادات ملتے ہیں۔ کہیں وہ کہتا ہے کہ جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کر لے، جس کا جی چاہے گمراہ ہو جائے اور کہیں کہتا ہے کہ ہدایت اور

گمراہی سب خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اس قسم کے سوالات اور اعتراضات کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ اس مسئلہ کے متعلق میں نے مختلف مقامات پر جو کچھ جستہ جستہ لکھا ہے، وہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے ایک الگ، مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اگر اس گتھی کو نہ سلجھایا گیا تو میں نے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرآن کی طرف لانے کی جو کوشش کی ہے وہ سب بیکار ہو جائے گی اور یہ دین سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ زیرِ نظر کتاب کی تسوید کا جذبۂ محرکہ اسی احساس کی شدت تھی جس کا نتیجہ قارئین کے سامنے ہے۔

دیگر اہم مسائلِ حیات اور حقائقِ کائنات کی طرح، قرآنِ کریم نے اس مشکل ترین مسئلہ کو بھی، اپنی معجزانہ سلاست و بلاغت سے، واضح انداز میں اس طرح حل کر کے رکھ دیا ہے کہ اگر اسے صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس باب میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے لئے قرآنِ مجید میں گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہے اور قرآن فہمی کے سلسلہ میں حسبِ ذیل امور کا پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) عام انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب بالعموم ایک موضوع پر مشتمل ہوتی ہے اور مختلف ابواب میں منقسم۔ ان میں سے ہر باب، کتاب کے موضوع کے کسی ایک نکتہ کو واضح کرتا ہے اور خود مکتفی ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا باب، پھر تیسرا، حتیٰ کہ جب ہم آخری باب پر پہنچتے ہیں تو کتاب کا پورا موضوع مربوط شکل میں سامنے آجاتا ہے۔

قرآنِ کریم کا انداز اس سے مختلف ہے۔ وہ کسی ایک موضوع پر مشتمل کتاب نہیں بلکہ زندگی کے اہم ترین مسائل اور کائنات کے عمیق ترین حقائق کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک مختصر سی کتاب کو، ایسے کثیر اور متنوع مسائل و حقائق کا مہیمن بننا ہو، تو اس میں ان امور پر تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ، جہاں تک انسانی زندگی کے لئے راہ نمائی کا تعلق ہے، اس میں، اسے تو بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، لیکن حقائقِ کائنات اور غوامضِ حیات کے متعلق اشارات سے کام لیا گیا ہے اور ان کی تفصیلات تک پہنچنا، انسانی علم و بصیرت اور فکر و تدبر پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نیز، اس میں ایک مسئلہ سے متعلق، ایک ہی مقام پر پوری بحث نہیں کی جاتی۔ اس کا انداز یہ ہے کہ ایک بات بنیادی طور ایک جگہ مذکور ہے۔ اس کی مزید وضاحت کسی دوسری جگہ کی گئی ہے، اضافہ کہیں اور آیا ہے۔ استثناء کا ذکر کسی اور مقام پر ہے۔ اس اندازِ بیان کو قرآن "تصریفِ آیات" کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لانے سے، ایک بات کی وضاحت کرنا۔

ایک ایسی کتاب کے لئے جسے تمام نوعِ انسان کے لئے، ہمیشہ کے لئے مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات قرار پانا تھا، یہی اندازِ بیان کس طرح نہایت مناسب اور بہترین تھا، اس کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت صرف اتنا واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن فہمی کا طریقہ یہ ہے کہ جو مسئلہ آپ کے زیرِ نظر ہو، اس کے متعلق قرآنِ کریم نے جہاں جہاں، اور جو کچھ کہا ہے، وہ سب، بیک وقت آپ کے سامنے ہونا چاہیئے۔ اس طرح آپ اس مسئلہ کو قرآنی روشنی میں صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔ آیات کو الگ الگ پڑھنے سے قرآن کا مقصود و مطلوب کماحقہٗ سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ میں نے قرآنِ کریم کو اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ایک عمر کی محنتِ شاقہ کے بعد لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو اسی طریق سے مرتب کیا ہے۔ مسئلۂ تقدیر کے متعلق بھی میں نے قرآنِ کریم سے جو کچھ سمجھا ہے اسی طریق سے سمجھا ہے اور زیرِ نظر کتاب میں، اسے اسی طریق سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) قرآنِ کریم کے مطالب تک پہنچنے کے راستے میں، دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ہم اسے (بالعموم) تراجم کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ، دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ دعوےٰ آپ کو تعجب انگیز سا نظر آئے گا لیکن ہے یہ مبنی بر حقیقت ــــ قرآنی الفاظ کے مرادفات دنیا کی کسی زبان میں نہیں مل سکتے ــــ میں نے اس حقیقت کو 'مفہوم القرآن' کے تعارف میں بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس کا مطالعہ کریں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ مسلم اور غیر مسلم اربابِ علم و بصیرت نے کس طرح اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ قرآنِ مجید کے الفاظ کا ترجمہ ممکن نہیں۔ قرآنی الفاظ کا **مفہوم** سمجھا اور سمجھایا جاسکتا ہے، ان کا **ترجمہ** نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہی وہ بنیادی حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر میں نے مفہوم القرآن مرتب کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کسی نے اسے پڑھا، بہ طیبِ خاطر اس امر کا اعتراف و اظہار کیا کہ اس سے قرآنِ کریم سمجھ میں آنے لگ گیا ہے۔

آئندہ صفحات میں آپ آیاتِ قرآنی کے سلسلہ میں یہ لکھا پائیں گے کہ اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے لیکن اس کا مفہوم یہ۔ اس سے میرا یہ مقصود نہیں کہ آیت کا وہ "ترجمہ غلط ہے"۔ جب آیاتِ قرآنی کا ترجمہ ممکن ہی نہیں تو اس کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۱۶/۹۳)۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ــــ "اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے، جسے

چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے"۔ آپ قرآنِ مجید کے کسی نسخہ کو اٹھایئے اس میں آپ کو یہی ترجمہ ملے گا۔ حتیٰ کہ آپ عربی زبان کے لغت کی رُو سے بھی دیکھیں گے تو ان الفاظ کا یہی ترجمہ کیا جائے گا۔ لیکن جب ہم اس "تصریفِ آیات" کی رُو سے (جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے) اس آیت کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ جو مفہوم اس ترجمہ کی رُو سے متعین ہوتا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں بلکہ قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ لہٰذا جب تک ہم قرآنِ مجید کے مختلف مقامات کی روشنی میں (مَنْ يَّشَآءُ) کا مفہوم متعین نہیں کریں گے، اس آیت کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں نے لغات القرآن میں، قرآنی الفاظ کا مفہوم، عربی زبان کی مستند کتبِ لغت اور قرآنی آیات کی روشنی میں اسی طرح مرتب کیا ہے، اور پھر اسی انداز سے پورے قرآنِ مجید کا مفہوم متعین کر کے، اسے مفہوم القرآن میں شائع کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں آیات کے تراجم اور ان کے مفہوم کا فرق اسی نہج سے سامنے لایا گیا ہے۔

(۳) قرآن فہمی کے سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآنِ مجید نے اپنے من جانب اللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی دیا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں، کہیں تضاد نہیں (۴/۸۲)۔ اس دعوے کی روشنی میں، قرآنِ کریم کی کسی آیت کا ایسا مفہوم صحیح نہیں قرار پا سکے گا جو اس کی کسی دوسری آیت کے خلاف ہو۔ اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ جب قرآنِ کریم کی کوئی ایک آیت آپ کے سامنے آئے تو آپ دیکھیں کہ اس کا جو مفہوم آپ لے رہے ہیں، وہ قرآنِ مجید کے کسی دوسرے مقام سے متضاد تو نہیں۔ میں نے قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرنے میں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے اور اس طرح بتایا ہے کہ قرآنِ مجید میں کہیں کسی جگہ، کوئی اختلاف نہیں۔ کوئی تضاد نہیں۔ جہاں ہمیں کوئی اختلاف نظر آتا ہے وہ ہماری کوتاہیٔ تدبّر کا نتیجہ ہے۔ مزید غور و فکر اور تفحص و تجسّس سے وہ اختلاف رفع ہو سکتا ہے۔

(۴) قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ آپ پہلے سے قائم شدہ اعتقادات اور تصورات کو اپنے قلب و دماغ سے الگ کر کے، قرآنِ کریم کی طرف آئیں۔ اگر آپ کے ذہن میں پہلے سے کوئی عقیدہ یا نظریہ راسخ ہوگا تو آپ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، قرآن سے اس عقیدہ یا نظریہ کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح قرآنِ کریم کے صحیح مطالب آپ کی سمجھ میں نہیں آسکیں گے۔ اُس نے اِلَّا اللہ سے پہلے جو لَآ اِلٰهَ کی شرط عائد کی ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ "خدا تک پہنچنے" کی شرطِ اولیں یہ ہے

کہ آپ اپنے قلب و دماغ کو ہر غیر خداوندی تصور سے پاک اور صاف کریں۔ جب تک حریم کعبہ سے انسانوں کے خود تراشیدہ معبودوں کو نکالا نہیں جاتا' اس میں خدا کو نہیں بسایا جا سکتا۔ یہ منزل ہوتی ہے بڑی کٹھن' لیکن قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔

آیندہ صفحات میں آپ یہ بھی لکھا دیکھیں گے کہ "دین' جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو....." دین اور مذہب کی اس تفریق کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ جو نظامِ حیات' خدا کی طرف سے' بذریعہ وحی' حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتا تھا' اسے الدّین کہا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب اس دین میں انسانی تحریفات راہ پا لیں تو وہ دین نہیں رہتا' مذہب بن جاتا ہے۔ مذہب ہوتا تو ہے انسانوں کا خود ساختہ لیکن اسے منسوب کیا جاتا ہے خدا کی طرف۔ مذہبی پیشوائیت اس طرح عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی' اور خدا کے نام پر' ان کے دل و دماغ پر اپنا تسلّط قائم رکھتی ہے۔ اگر کوئی شخص مذہب کے کسی عقیدہ یا مسلک کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو مذہبی پیشوا یہ کہہ کر عوام کو مشتعل کر دیتے ہیں کہ یہ تمہارے دین کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے لئے دلیل یہ دیتے ہیں کہ جو کچھ یہ کہتا ہے' وہ تمہارے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔ اس طرح اس کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے عائد کر کے لوگوں کو اس کی طرف سے برگشتہ کر دیتے ہیں تاکہ کوئی اس کی آواز پر کان نہ دھرے۔ یوں بھی معتقدات (خواہ وہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں) انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں جنھیں وہ آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جو دین' خدا نے بوساطت نبی اکرمؐ' عطا کیا تھا' کچھ عرصہ کے بعد اس میں انسانی خیالات کی آمیزش شروع ہو گئی اور اس طرح وہ رفتہ رفتہ مذہب کی سطح پر آ گیا۔ اب وہی مذہب ہم میں مروّج ہے لیکن ہم میں اور دیگر اہلِ مذاہب میں ایک بنیادی فرق ہے اور یہی فرق ہے جس سے ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ اس مذہب کو پھر سے دینِ خداوندی میں تبدیل کر لیا جائے۔ وہ فرق یہ ہے کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب ــــ جس میں دین اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے' بلا تحریف موجود ہے۔ یہ خصوصیت دنیا کے کسی اور مذہب کو حاصل نہیں۔ اس وقت آسمان کے نیچے خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی کتاب اپنی اصلی شکل میں' قرآن کے سوا کوئی نہیں۔ لہٰذا' اگر ہم چاہیں کہ اپنے مروّجہ مذہب کو پھر سے دینِ خداوندی میں بدل لیں' تو اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہو گا کہ اپنے مروّجہ عقائد و مسالک کو قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھیں۔ جو اس کے

مطابق ہوں انھیں باقی رکھا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انھیں مسترد کر کے ان کی جگہ صحیح قرآنی عقائد اختیار کر لئے جائیں۔ میری کوششوں کا منتہیٰ یہی ہے کہ خدا کا عطا کردہ دین، پھر سے قوم کے سامنے لایا جائے۔ زیرِ نظر تصنیف بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے ـــــ اور میرے نزدیک بڑی اہم کڑی کیونکہ تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ہماری تباہیوں کے اسباب میں ایک بنیادی سبب **تقدیر** کا غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ اس غارت گرِ دین و دانش عقیدہ نے اس سراپا عمل و حرکت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ قارئین سے میری گذارش ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے اپنی گہری توجہ کا مرکز بنائیں، اس لئے کہ **تقدیر** کا مروّجہ عقیدہ ہمارے ہاں صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہے اور ہمارا جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ اسے قرآنی تصور سے بدلنے کے لئے بڑے گہرے غور و تدبر ہی کی نہیں بلکہ گہرا سا صبر و سکون اور کوہ تمثال ثبات و استقامت کی بھی ضرورت ہوگی۔

میں نے اس کتاب کو ان حضرات کے لئے لکھا ہے جو مسئلۂ **تقدیر** کو قرآنِ کریم سے سمجھنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس میں نہ فلسفیانہ مباحث کو چھیڑا ہے، نہ متکلمین کی موشگافیوں سے بحث کی ہے۔ اس پیچیدہ ترین مسئلہ کو، قرآنِ مجید کی روشنی میں، سیدھے سادے انداز سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ نیز میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ اس کا اسلوبِ تحریر بھی زیادہ سے زیادہ عام فہم رہے۔ اگرچہ ایک اہلِ قلم کے لئے اپنا اسلوبِ نگارش بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے، بالخصوص عمر کے آخری حصّہ میں۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کر سکیں گے۔

آیات کے حوالوں کے لئے، اوپر سورۃ کا نمبر اور نیچے آیت کا نمبر دیا گیا ہے۔ مثلاً (۳/۱۵) سے مراد ہے سورۂ آلِ عمران کی پندرھویں آیت۔ جہاں آیت درج نہیں کی گئی بلکہ اس کا صرف حوالہ دیا گیا ہے، آپ قرآنِ مجید کے کسی نسخے سے آیت خود نکال کر دیکھ لیں۔ چونکہ قرآنِ کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں ایک آدھ کا فرق ہوتا ہے اس لئے آپ حوالے کے لئے ایک دو آیات پیچھے یا آگے دیکھ لیں گے تو مطلوبہ آیت مل جائے گی۔

آخر میں، اس امر کا اعتراف و اظہار ضروری سمجھتا ہوں (جیسا کہ میں اپنی ہر تصنیف میں ضروری سمجھا کرتا ہوں) کہ جو کچھ آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے وہ فہمِ قرآن کی ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا بہر حال امکان ہے۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہو المراد اور اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو آپ قرآنِ کریم پر از خود غور فرمائیں۔ بحث و تمحیص سے میں ہمیشہ مجتنب رہا کرتا ہوں۔ اگر میری اس کوشش سے کسی ایک فرد کے دل میں بھی قرآنِ مجید کی صحیح بات اُتر گئی تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

والسلام

پرویز

۲۵/بی۔ گل برگ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب التقدیر

پہلا باب

پس منظر

انسان نے جب کرۂ ارض پر آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو سخت نامساعد ماحول میں گھرے ہوئے پایا۔ چاروں طرف مہیب جنگلات جن میں نہایت خوفناک، وحشی اور خونخوار درندے اور دیگر مہیب عظیم الجثہ حیوانات، اردگرد سر بفلک پہاڑ اور ان کی بھیانک چٹانیں، سامنے ناپیداکنار سمندر اور اس کی دہشت انگیز تلاطم خیزیاں۔ دوسری طرف پُرشور دریا، ندی، نالے اور ان کی تباہ کن طوفان انگیزیاں۔ مسلسل بارشیں، اولے، برفباری اور ان کے ساتھ لرزہ انگیز گرج، چمک اور کڑک۔ اِدھر اُدھر ہیبت ناک کوہِ آتش فشاں اور ان سے اُبلنے والا آتشیں سیلاب، زیرِ زمین زلزلوں کے عفریت اور بالائے سر، بجلیوں کی ناگنیں۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، تباہیوں اور بربادیوں کے یہ بے پناہ سامان اور ان میں گھرا ہوا بے کس، بے بس، نہتا، کمزور و ناتواں، بے سروسامان انسان! اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کچھ کیوں ہو رہا ہے، کیسے ہو رہا ہے اور اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے قانون سے ناآشنا، اور فطرت کی قوتوں کے مسخر ہو جانے کے امکان سے ناواقف تھا۔ بنابریں وہ ہر تباہ کن واقعہ کو ایک حادثہ (ACCIDENT) تصور کرتا اور اس حادثہ کو محض اتفاق (CHANCE)

کا نتیجہ قرار دیتا۔ اس سے آگے اس کا ذہن جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ جو انسان، حادثات اور اتفاقات کے ایسے خطرناک ہجوم میں گھرا ہوا ہو، اور ان کی مدافعت کا اس کے پاس کوئی سامان اور ذریعہ نہ ہو،

انسان کا پہلا تصوّر

تو وہ اپنے آپ کو لامحالہ مجبور تصوّر کرے گا۔ چنانچہ یہ پہلا تصوّر تھا جو اپنے متعلق انسان نے قائم کیا۔ یعنی یہ کہ انسان اس دنیا میں مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے اختیار میں کچھ نہیں۔

کمزور و ناتواں، بےکس اور بےبس، بے سہارا اور بے ذریعہ، مجبور و مقہور انسان کے نزدیک، کسی مہیب اور خطرناک قوّت سے مدافعت کا طریقہ ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اس قوّت کے سامنے جھک جائے، روئے، گڑگڑائے اور اس طرح اس سے رحم کی درخواست کرے۔ اس ابتدائی دَور کے انسان نے، ان مہیب قوّتوں کی تباہی سے بچنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا۔ علی الصّبح، افقِ مشرق سے آتشیں گولہ نمودار ہوا تو یہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آسمان سے بادل کی گرج، بجلی کی چمک اور رعد کی کڑک، روح فرسا ہوئی تو یہ ان کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ دریا کی کف آلود طغیانیاں دہشت افزا ہوئیں تو اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ اس نے کبھی شیر کو دیوتا بنایا کبھی سانپ کو۔ کہیں اگنی (آگ) دیوی کی پوجا کرنے لگ گیا؛ کہیں اِندر (بارش) دیوتا کی پرستش۔ اس طرح، زندگی کے متعلق اس نے ایک اور تصوّر قائم کیا اور وہ یہ کہ خطرات سے حفاظت کے لئے، کسی صاحبِ قوّت ہستی سے رحم کی درخواست کرنا اور اس طرح اس سے مدد کا طالب ہونا چاہیئے۔ ماہرینِ علم الانسان (ANTHROPOLOGIST)۔ تاریخ انسانیت کے اس دور کو عہدِ پرستش (AGE OF WORSHIP) سے تعبیر کرتے ہیں۔

پرستش کا تصوّر

لیکن ظاہر ہے کہ ذہنِ انسانی کے اس تصوّر کا، کائناتی حوادث پر تو کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ انھیں اپنے قاعدے کے مطابق رونما ہونا تھا — اور وہ اس طرح رونما ہوتے رہتے تھے۔ اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جاتا کہ کسی دیوی دیوتا کی پوجا کے بعد کوئی واقعہ ان پرستاروں کے حسبِ منشا ظہور پذیر ہو گیا تو وہ ان کے اس عقیدہ کی پختگی کا موجب بن جاتا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو وہ مجبور تو اپنے آپ کو سمجھتے ہی تھے، صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے۔

ان میں سے کچھ زیرک لوگوں نے، ان کی اس بےبسی سے فائدہ اٹھایا اور ان سے کہا کہ جس طرح ہم کہتے

ہیں، اس طرح کرو تو دیکھو، یہ دیوی دیوتا کس طرح تمہاری مرادیں پوری نہیں کرتے؟ اس طرح جادو، گنڈے، ٹونے، ٹوٹکوں کا وجود عمل میں آیا۔ اس دور کو تاریخِ انسانیت میں 'عہدِ سحر' (AGE OF MAGIC)

عہدِ سحر

کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے، انسان میں اپنی قوت کے احساس کی کچھ نمود ہوئی۔ یعنی یہ کہ انسان، فوق الفطرت قوتوں سے اپنی مرضی کے مطابق بھی کچھ کرا سکتا ہے لیکن اس سے بھی ان (متذکرہ بالا) تصورات میں کچھ فرق نہ آیا۔ یعنی یہ کہ انسان دنیا میں مجبور ہے اور خطرات سے حفاظت کے لئے اسے فوق الفطرت قوتوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے جسے یا تو پرستش کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور یا جادو کے زور سے۔ یہ اُس انسان کا ذکر ہے جو وحی کی راہ نمائی سے محروم تھا اور کائنات اور خود اپنی ذات کے متعلق، اپنے ذہن سے تصورات قائم کرتا تھا۔ اس قسم کے تصورات کو بعد میں مذہب (RELIGION) کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا۔ یہ تصورات آپ کو دنیا کے ہر مذہب میں ملیں گے، خواہ وہ مذہب قدیم قبائل میں مروج ہو اور خواہ مہذب اقوام میں؛ مذہب کی اصل واساس ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے۔

وحی کی رُو سے عطا شُدہ تصوّرات

اس کے برعکس، فوق الفطرت قوت، کائنات اور انسان کے متعلق کچھ تصورات، وحی کی رُو سے عطا ہوئے۔ ان تصورات کی رُو سے:

(۱) یہ کارگہ کائنات نہ یونہی اتفاقی طور پر وجود میں آ گیا ہے اور نہ ہی یہ حادثات اور اتفاقات کا ہنگامی مجموعہ ہے۔ اسے ایک حکیم وعلیم ہستی نے ایک متعیّن پروگرام کے مطابق پیدا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایسے محکم قوانین متعیّن کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کی ہر شے سرگرمِ عمل ہے۔ اس خالقِ کائنات اور واضعِ قوانین کو اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ قوانین، خارجی کائنات کو بھی محیط ہیں، انسان کی تمدنی زندگی کو بھی، اور خود ایک فرد کی اپنی ذات کو بھی۔ یعنی تخلیقِ خداوندی کا کوئی گوشہ ان قوانین کے دائرے سے باہر نہیں۔

(۲) انسان کے علاوہ، کائنات کی ہر شے، ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کو، ان کی "فطرت" سے تعبیر کیا جاتا ہے جسے بدلنے کا انھیں اختیار نہیں۔ لہٰذا، کائنات میں جو واقعہ رونما ہوتا ہے وہ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں اسے

قانونِ علّت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) کہا جاتا ہے' اور انسانی دنیا میں قانونِ مکافاتِ عمل، جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل (حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا ایک متعیّن نتیجہ مرتّب ہوتا ہے۔ اس کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔

(۳) انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ' اشیائے کائنات سے متعلق قوانین کا علم حاصل کر سکے۔ جب وہ ان قوانین کا علم حاصل کرلے گا جن کے مطابق فطرت کی قوتیں سرگرمِ عمل ہیں، تو وہ ان قوّتوں کو مسخر کر سکے گا' اس بنا پر' کائنات میں' انسان مجبور و مجہول نہیں' اشیائے کائنات مجبور ہیں۔ اسے اشیائے کائنات سے ڈرنے کی ضرورت نہیں' اشیائے کائنات کو اس سے "خوف کھانے" کی ضرورت ہے۔ اشیائے کائنات اس کی خادم اور ساجد ہیں' اور یہ اشیائے کائنات کا مخدوم و مسجود۔

انسان قوانینِ فطرت کا علم' مشاہدہ' مطالعہ' تجربہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ اسے' دورِ حاضر کی اصطلاح میں' علومِ سائنس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی اپنی زندگی سے متعلق قوانین کا علم (یعنی اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے متعلق قوانین نہیں بلکہ اس کی انسانی زندگی سے متعلق' قوانین کا علم) اسے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے' جواب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ یہ قوانین بھی فطرت کی طرح غیر متبدل اور محکم ہیں۔

(۴) انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق یہ ہے کہ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں جو ان سے متعلق ہیں لیکن انسان اس باب میں مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو اپنی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر کرے اور جی چاہے اپنے لئے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے۔

جبر اور اختیار

اس حد تک تو انسان صاحبِ اختیار ہے (کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے یا ان کے خلاف چلے) لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ اپنی روش کا نتیجہ بھی اپنی مرضی کے مطابق برآمد کرلے۔ اس کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہی مرتّب ہوگا۔ بالفاظِ دیگر' اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو سنکھیا کی ڈلی نگل جائے اور چاہے مصری کی' لیکن اسے اس کا اختیار نہیں کہ نگل تو جائے سنکھیا کی ڈلی اور اس کے نتائج پیدا کرلے مصری کی ڈلی کے سے۔ نتیجہ قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مرتب ہوگا جسے بدلنے کا انسان کو اختیار نہیں۔ اس قانون کا حیطۂ اقتدار' انسان کے موجودہ' اور اس کے مرنے کے بعد کی زندگی پر یکساں حاوی ہے۔

خدا وہ قادرِ مطلق ہستی ہے جس نے، اپنے پروگرام کے مطابق، ان قوانین کو مقرر کیا اور اب ان پر اسکا ایسا کنٹرول ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ ان کے مطابق مرتّب ہوتا چلا جاتا ہے. قانون تو محض ایک فارمولے کا نام ہوتا ہے — یعنی اگر ایسا کرو گے! تو ایسا ہو گا — اس فارمولے کے اندر از خود کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جس سے نتیجہ اس کے مطابق مرتّب ہوتا ہے. یہ قوت، اس فارمولے یا قانون کے خالق کے ہاتھ میں ہوتی ہے. کسی قانون کے زندہ حقیقت بننے اور رہنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پسِ پشت جو قوت کار فرما ہے وہ ہمیشہ زندہ اور پایندہ رہے. یعنی وہ حیّ وقیوم ہو.

دین اور مذہب کا فرق

یہ تصورات جس نظامِ حیات کی اصل و اساس قرار پاتے ہیں، اسے الدّین کہہ کر پکارا جاتا ہے. اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ دین، مذہب کی ضد ہے اور اس کے خلاف چیلنج. قرآنِ کریم نے ان تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گی. انہی تفاصیل سے وہ مسئلہ تقدیر سلجھ اور نکھر کر سامنے آجائے گا جسے مذہب کی دنیا نے اس قدر پیچیدہ اور لاینحل بنا رکھا ہے.

دوسرا باب

خُدا کا تصوّر

خُدا، اس وقت بھی خدا تھا جب یہ کائنات ظہور میں آئی تھی اور اُس وقت بھی خدا رہے گا جب یہ سلسلہ باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا، "خدا کی دنیا" اس کی تخلیق کردہ کائنات ہی نہیں، اس سے ماورا اور بھی ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی جہت سے "خدا کی دو دنیاؤں" کا ذکر کیا ہے۔ ایک کا نام ہے عالمِ امر، جو خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماوراء ہے، اور دوسرا ہے عالمِ خلق، جو خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (۷/۵۴)۔ آگاہ رہو کہ عالمِ خلق اور عالمِ امر دونوں خدا کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ قانون کا تعلق عالمِ خلق سے ہوگا، عالمِ امر سے نہیں۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول (EFFECT) بغیرِ علّت (CAUSE) کے وجود میں آسکتا ہے اور نہ کوئی شے، کسی پہلے سے موجود مسالہ (MATERIAL) کے بغیر وجود پذیر ہوسکتی ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے لیکن اس کا تعلق عالمِ خلق سے ہے، عالمِ امر سے نہیں۔ خدا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ یعنی اس نے اسے، کسی پہلے سے موجود مسالہ کے بغیر پیدا کر دیا۔ اس کا یہ فیصلہ کہ ایسی کائنات ظہور میں آنی چاہیئے اور پھر اس کا یہ عمل، جس سے اس نے اسے پیدا کر دیا، قانونِ علّت و معلول اور (دنیا میں) نظامِ تخلیق و تولید کے یکسر خلاف ہے۔ ان امور کا تعلّق عالمِ اَمر سے ہے جس میں کوئی قانون نہیں، بلکہ خدا کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہی "خدا کی وہ دنیا" ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (۲۲/۱۴) وہ اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق جیسا چاہے کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۱/۱۰۷)۔ یقیناً تیرا رب اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ

عالمِ امر

يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (۵/۱)۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس قسم کا چاہے فیصلہ کرتا ہے۔ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۲۲/۱۸)۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔

تخلیق کے اس اوّلیں مرحلہ کے متعلق (جس میں کائنات کو، کسی سابقہ مسالہ کے بغیر، عدم سے وجود میں لایا گیا) کہا کہ

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (۲/۱۱۷)

اس نے کائنات (ارض و سما) کو پہلی بار پیدا کیا۔ وہ جب کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے فقط اتنا کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ (اس طرح وہ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔)

یہاں خدا کو بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ اسے فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (۶/۱۴) کہیں کہا گیا ہے کہ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ۔ (۳۰/۱۱)۔ خدا اشیائے کائنات کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور انھیں گردشیں دے کر مزید تخلیقی مراحل طے کرتا ہے۔

تخلیق کے معنی

واضح رہے کہ خَلْقٌ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو ماپنا، اس کا اندازہ کرنا۔ کسی شے کا توازن و تناسب درست کرنا۔ اس اعتبار سے خَلْقَ کے معنی ہوں گے مختلف عناصر میں تناسب و توازن پیدا کر کے، ایک خاص انداز سے اور پیمانے کے مطابق کسی چیز کو بنانا۔ جہاں تک اشیائے کائنات کو پہلی بار (بغیر کسی سابقہ مسالہ کے) بنانے کا تعلق ہے، وہ خدا کے عالمِ امر سے متعلق ہے اور اس میں خدا کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن اس طرح پیدا شدہ اشیاء کے باہمی امتزاج سے نئی نئی چیزوں کی تخلیق، انسان بھی کر سکتا ہے، اور کرتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے خدا کو اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ کہا ہے۔ (۲۳/۱۴ ؛ ۳۷/۱۲۵)۔ یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حُسن و رعنائی اور صحیح ترین توازن و تناسب کے ساتھ پیدا کرنے والا۔ ایک مقام پر کہا ہے کہ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنی مخلوق میں، اپنی مشیت کے مطابق، اضافے بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ اضافے بطریقِ ابداع بھی ہو سکتے ہیں

یعنی پہلی بار نئی نئی اشیائے کائنات کی تخلیق۔ اور مختلف اشیاء کی ترتیبِ نو و ترکیبِ جدید سے نئی اشیاء کی تخلیق بھی۔ غالبؔ کے الفاظ ہیں۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

یا اقبالؒ کے الفاظ میں:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

عالمِ اَمر کی خصوصیات

تخلیق کا یہ پہلا مرحلہ (جس میں اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لایا جاتا اور انہیں مختلف خصوصیات کا حامل بنایا جاتا ہے) خدا کے عالمِ اَمر سے متعلق ہے۔ اس کے متعلق نہ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا اور کیسے ہوتا ہے، نہ ہی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز کو فلاں خصوصیت کا حامل کیوں بنایا گیا۔ ایسا کیوں کیا گیا کہ آگ حرارت پہنچائے اور پانی (عام حالات میں) نشیب کی طرف بہے۔ سنکھیا کو ہلاکت آفریں اور پانی کو ممد حیات کیوں بنایا گیا۔ شہد کو شیرینی اور نمک کو نمکینی کیوں عطا کی گئی۔ کائنات کو ایسا کیوں بنایا گیا، ویسا کیوں نہیں بنایا گیا۔ یہ سب کچھ فاطرِ کائنات نے اپنے اختیارِ مطلق اور ارادۂ کامل کے مطابق کیا۔ اس کے لئے وہ نہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند تھا اور نہ کسی کے صلاح مشورے کا محتاج۔ یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق صرف اس نے اتنا بتایا کہ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۲۴/۴۵)۔ (و دیگر متعدد مقامات) وہ جیسے چاہتا ہے، تخلیق کرتا ہے۔ لفظ یَشَآءُ کی نسبت سے اُسے "مشیّتِ خداوندی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کی اس مشیّت کو نہ ہم سمجھ سکتے ہیں، نہ اس کے متعلق کوئی سوال کر سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور ایسا کیوں نہیں؟

یہ ہے خدا کا عالمِ اَمر — يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ — اور يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کا عالم۔ اس کے متعلق اس نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ سلسلۂ کائنات کو اس نے بالحق پیدا کیا ہے (۱۶/۳) باطل نہیں بنایا (۳/۱۹۰)۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم مختلف علومِ کائنات کی رُو سے تحقیق و تفحص کریں اور یہ دیکھیں کہ یہ کس طرح بالحق ہے، باطل نہیں — لیکن یہ جداگانہ موضوع ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کے عالمِ امر کی کنہ و حقیقت ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے کیونکہ وہ ہمارے تصوّر کے سلسلۂ قوانین

(علّت و معلول) سے ماورار ہے۔
اب ایک قدم آگے چلئے۔

خدا نے اپنی مشیّت کے مطابق کائنات کی تخلیق کردی اور اس منزل میں پہنچ کر، اس نے اپنے پروگرام میں ایک عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ یہاں خُدا نے اپنے اَمر کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی چار دیواری میں محدود کر دیا۔ یہ مقام بڑے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔

تقدیر

قرآنِ کریم میں "قانون" کا لفظ نہیں آیا۔ اُس زمانے کے عربی لٹریچر میں بھی یہ لفظ، ان معانی میں، بہت کم نظر آتا ہے۔ اس کے بجائے قرآن میں ایک اور مادہ (ROOT) استعمال ہوا ہے جو اپنی معنیت کے اعتبار سے، قانون سے بھی زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ مادہ ہے (ق۔ د۔ ر) قدر۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں، اندازہ یا پیمانہ۔ قَدَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہیں، میں نے اس چیز کو ماپا۔ اس کا اندازہ کیا اور قَدَرَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ کے معنی ہیں، اس نے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ رکھ کر ماپا اور اس طرح اندازہ کیا کہ وہ اس کے برابر ہے یا نہیں، یا ان دونوں کا باہمی تناسب کیا ہے۔ قَدَّرْتُ عَلَیْهِ الثَّوْبَ کے معنی ہیں میں نے اس شخص کے ماپ کے مطابق کپڑے بنائے۔ لہٰذا، تقدیر کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا پیمانے یا اندازے کے مطابق فِٹ ہو جانا۔ اور مِقْدَارٌ، اس پیمانے یا ماڈل یا (PATTERN) کو کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی چیز بنائی جائے۔ جَآءَ عَلٰی قَدَرٍ کے معنی ہیں وہ اندازے یا پیمانے پر پورا اُترا۔ قَدَارٌ اس شخص کو کہتے ہیں جو مناسب اور معقول قد کا ہو۔ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ اَلْمُقْتَدِرُ اس شخص کو کہتے ہیں جو اندازہ کر کے بتلائے کہ کھیت سے غلّے کی کتنی مقدار پیدا ہونے کی اُمید ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قَدْرٌ یا تَقْدِیْرٌ کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ۔ یا کسی چیز کا اندازے اور پیمانے پر پورا اُترنا۔

چونکہ کسی چیز کو ایک خاص پیمانے اور اندازے کے مطابق بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس چیز پر پوری پوری مقدرت حاصل ہو، اس لئے قَدَرْتُ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں مجھے اس قدر قوت حاصل تھی کہ میں اس چیز کو اپنے پیمانے کے مطابق بنا دیتا۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالمِ امر میں ہر فیصلہ یا ہر کام، خدا کے اختیارِ مطلق اور ارادۂ کامل کے ماتحت سرانجام پاتا ہے۔ وہاں کوئی لگا بندھا قانون نہیں جس کے مطابق ہر فیصلہ صادر ہو۔ لیکن عالمِ خلق میں خدا کا امر قاعدے اور قانون کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔

خدا کا اَمر قوانین کا پابند ہوگیا

وَ کَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ خدا کا امر پیمانوں کے قالب میں ڈھل گیا۔ وہ مقررہ اندازوں کا پابند ہو گیا۔ اور اس طرح قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ خدا نے ہر شے کے لئے ایک پیمانہ مقرر کر دیا۔

"ہر شے کے لئے پیمانہ مقرر کر دیا۔" کا مطلب کیا ہے، اس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ پانی درجۂ انجماد پر سیال سے ٹھوس ہو جاتا ہے۔ ایک خاص درجۂ حرارت پر وہ پھر ٹھوس سے سیال ہو جاتا ہے۔ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ جس برتن میں ڈالو اس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ زیادہ حرارت پہنچائی جائے تو وہ بخارات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بخارات ہَوا سے ہلکے ہوتے ہیں اس لئے وہ فضا میں بلند ہو جاتے ہیں انھیں بادل کہا جاتا ہے۔ ایک خاص درجے کی ٹھنڈک پہنچنے پر، وہ بخارات پھر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور پانی چونکہ ہَوا سے بھاری ہوتا ہے اس لئے وہ (بارش کی شکل میں) زمین پر برس جاتے ہیں۔ انھیں "پانی کے پیمانے" کہا جائے گا۔ یا یہ کہ ایک خاص مقدار تک پانی پیاس بجھاتا ہے اور ممدِ حیات ہے لیکن اسی کی افراط انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہے (جیسے ڈوب کر مر جانا)۔ یہ بھی پانی کے پیمانے ہیں۔ یا مثلاً کھجور کا درخت برسوں کے بعد جا کر پھل دیتا ہے اور کیلا چھ مہینے میں بارآور ہو جاتا ہے۔ یہ ان کے پیمانے ہیں۔ ببول کے بیج سے، بے ثمر کانٹے دار درخت اُگتا ہے اور آم کے بیج سے "ثمرِ بہشت" ـــــ انگبیں کے بھرے ہوئے گلاس ـــــ

بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ جس چیز کو قرآن نے قَدْر کہہ کر پکارا ہے اسے ہماری اصطلاح میں قانونِ فطرت (LAW OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ لہذا، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ

قوانینِ فطرت

شَیْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق وہ وجود میں آتیں، بڑھتی، پھولتی، پھلتیں اور اس کے بعد معدوم ہو جاتیں (یا کوئی دوسری ہیئت اختیار کر لیتی ہیں)۔ دیکھئے قرآنِ کریم کی مختلف آیات سے یہ حقیقت کس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔

(۱) انسانی بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں کہا کہ اس کا آغاز نطفہ سے ہوتا ہے جو ایک محفوظ مقام (عورت کے بیضہ) میں قرارگیر ہو جاتا ہے۔ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۱-۲۲/۷۷)۔ وہ ایک معلوم اندازے یا پیمانے تک وہاں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ مدت ہے جس تک جنین رحمِ مادر میں رہتا ہے اور اس کے لئے فطرت کا قانون مقرر ہے۔ اس کے بعد ہے۔ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ (۲۳/۷۷)۔ یہ پیمانے (قوانین) ہم نے مقرر کئے ہیں۔ ہم بہترین پیمانے مقرر کرنیوالے ہیں۔ (ضمناً یہاں سے "قَادِرٌ" کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں — "پیمانے مقرر کرنے والا"— دوسری جگہ (۲۵/۵۴ میں) "قَادِرٌ" کی بجائے قَدِیْرٌ آیا ہے)۔

جنین کے لئے ان پیمانوں کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ بعض اوقات رحمِ مادر میں بچہ ناتمام رہ جاتا ہے اور اکثر اوقات وہ مکمل ہو کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہے وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ (۱۳/۸)۔ خدا کے ہاں ہر شے کے لئے پیمانے مقرر ہیں۔

(۲) بارش کے متعلق کہا کہ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ (۲۳/۱۸ ؛ ۴۳/۱۱) اور ہم بادلوں سے ایک مقدار کے مطابق بارش برساتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ بارش برستی ہے تو فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا (۱۳/۱۷)۔ ندی نالے اپنے اپنے ظرف (قدر۔ پیمانوں) کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔

(۳) زمین کی پیداوار کے متعلق بھی کہا کہ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ (۴۲/۲۷)۔ اس کی پیداوار ایک اندازے کے مطابق ہوتی ہے جسے خدا کی مشیت نے مقرر کیا ہے (مَا يَشَآءُ کا مفہوم آگے چل کر بیان کیا جائے گا)۔ اسی سلسلہ میں ان چار موسموں کا بھی ذکر آیا ہے، جن میں مختلف فصلیں اُگتی ہیں۔ وَ قَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ (۴۱/۱۰)۔ خدا نے زمین کے لئے چار فصلوں کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

(۴) اجمالی طور پر تمام اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (۲۵/۲)
اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کے لئے اندازہ اور پیمانہ مقرر کر دیا۔ بلکہ ہر شے کو پیدا ہی ایک خاص پیمانے کے مطابق کیا۔ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۵۴/۴۹)۔ سورۃ الاعلیٰ کی وہ دو آیتیں بڑی غور طلب ہیں جن میں کہا ہے کہ اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ (۸۷/۳-۲)۔ خدا نے ہر شے کی تخلیق کا آغاز کیا۔ پھر اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے، اس کا تناسب قائم کیا۔ پھر اس کے لئے ضروری پیمانے مقرر کئے اور اس کے اندر اس امر کی راہ نمائی رکھ دی کہ وہ ان پیمانوں کے مطابق اپنی نشوونما کس طرح کرے۔

(۵) اب آپ اس گوشے کی طرف آئیے جس میں اس لفظ (قدر) کا مفہوم عصرِ حاضر کی اصطلاح میں (قانونِ فطرت) کے مطابق زیادہ وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں (اب) ابتدائی جماعتوں کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ دن اور رات، ایک دوسرے کے بعد کس طرح آتے ہیں۔ یہ زمین کی گردش کا نتیجہ ہیں اور اس کی گردش ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہو رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دن اور رات (طلوع اور غروبِ آفتاب) کے اوقات اس حتم و یقین کے ساتھ متعین کر لئے جاتے ہیں کہ ان میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں پڑتا۔ اس کے متعلق کہا کہ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۷۳/۲۰)۔ اللہ نے دن اور رات کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اسی طرح چاند کے متعلق کہا وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ (۱۰/۵)۔ خدا نے اس کی منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔

اس کے بعد دیکھئے کہ لفظ تقدیر کے معنی کس قدر واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ کہا کہ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ـــــ سورج (نظامِ شمسی) بھی اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۶/۳۸)۔ یہ اس خدا کا مقرر کردہ قانون (تقدیر) ہے جو ہر بات کا علم بھی رکھتا ہے اور بڑے غلبہ کا مالک بھی ہے۔ دوسرے مقام پر مختلف اجرامِ فلکی کے بالعموم اور ستاروں کے بالخصوص تذکرہ کے بعد کہا۔ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۴۱/۱۲)۔ (یہ خدائے عزیز و علیم کے مقرر کردہ پیمانے، قوانین، ہیں) ان تصریحات سے واضح ہے کہ تقدیر کے معنی قانونِ فطرت کے ہیں، نہ کہ "انسان کی قسمت" کے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ ان آیات میں ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ

کہا گیا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کی رُو سے تقدیر کے معنی ہیں اندازہ یا پیمانہ عطا کرنا، مقرر کرنا۔ "خدا کی تقدیر" کے معنی ہوں گے خدا کی طرف سے مقرر کردہ پیمانے یا قوانینِ خداوندی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تقدیر کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ہمارے ہاں یہ لفظ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے! یعنی قرآنِ کریم کی رُو سے 'تقدیر' خدا کی ہے۔ "انسان کی تقدیر" کہنا ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائلِ حیات کے متعلق بہت سی الجھنوں، پیچیدگیوں اور کشمکشوں کی وجہ الفاظ کا غلط استعمال یا ان کا غلط مفہوم ہے اور قرآنِ کریم کے سمجھنے کا صحیح طریق یہی ہے کہ اس کے الفاظ، اصطلاحات یا تصورات (CONCEPTS) کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے[1]۔

تقدیر خدا کی ہے، انسان کی نہیں

خدا کی یہ تقادیر (قوانینِ فطرت) پہلے سے مقرر ہیں۔ (انھیں عالمِ امر میں متعین کیا گیا تھا)۔ اور "کتابِ فطرت" یا صحیفۂ کائنات میں مرقوم۔ اسی کو خدا نے "کتابِ مبین" کہا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے ـــ خدا جانتا ہے کہ بحر و بر میں کیا ہے اور کوئی پتہ کسی درخت سے نہیں گرتا کہ اس کا اُسے علم نہ ہو۔ اور نہ ہی زمین کی تاریکیوں میں پنہاں کوئی دانہ ایسا ہوتا ہے جو اس کے حیطۂ علم سے باہر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ (۶/۵۹) کوئی رطب و یابس (اشیائے کائنات کی جزئیات تک) ایسی نہیں جو "کتابِ مبین" میں نہ ہوں۔ یعنی خدا کی طرف سے مقرر کردہ قوانینِ فطرت، کائنات کے پتّے پتّے پر تحریر اور ذرّے ذرّے پر منقوش ہیں (۱۷/۵۸) جس کا جی چاہے انھیں پڑھ لے۔ اسی کو علم الطبیعیات ـــ سائنس ـــ کہا جاتا ہے۔ اسی جہت سے ان قوانین کو بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ کہا گیا ہے۔ (۱۵/۲۱)۔ یعنی وہ قوانین جن کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (نیز ۱۵/۴)۔ آدم کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ اسے "علم الاسماء" دیا گیا ہے، تو اس سے مراد، علمِ اشیائے کائنات ہی ہے۔

---

[1] میں نے 'لغات القرآن' میں، قرآنی الفاظ، اصطلاحات اور تصورات کا مفہوم اسی طریق سے متعین کیا ہے اور انہی مفاہیم کے مطابق پھر مفہوم القرآن (مکمل) مرتب کیا ہے۔

قوانینِ خداوندی غیر متبدّل ہیں

قانون (LAW) کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ

IF ________ THEN ________ ALWAYS

حکم اور قانون میں فرق

"اگر ایسا کرو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہمیشہ ہوگا"۔ یہ آخری شرط، قانون کی اساس اور بنیاد ہے۔ حکم کے معنی فیصلہ کے ہیں۔ ایک آقا اپنے ملازمین کو وقتاً فوقتاً حکم دیتا رہتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابھی اس نے ایک حکم دیا ہو اور اس کے بعد دوسرا حکم، جو پہلے حکم سے مختلف ہو۔ لہٰذا، احکام ان فیصلوں کو کہا جائے گا جو بدلتے رہیں یا جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

لیکن جب کوئی حکم (فیصلہ) ایسی شکل اختیار کرلے کہ اس میں تبدیلی کا امکان نہ رہے تو اسے قانون کہا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر، قانون، غیر متبدّل فیصلے کو کہا جائے گا۔ خدا نے، اشیائے کائنات کے متعلق جو فیصلے کئے ہیں ــــ یعنی ان کے پیمانے مقرر کئے ہیں، وہ غیر متبدّل ہیں۔ قوانینِ فطرت کا یہی غیر متبدّل ہونا ہے جس پر سائنس کی رفیع و عظیم عمارت استوار ہے اور جس پر اعتمادِ کُلّی کے سہارے (جسے قرآن کی اصطلاح میں توکّل کہا جاتا ہے) زمینی انسان، چاند کی سیر کرکے شاداں و فرحاں واپس آجاتا ہے۔ نہیں! بلکہ یہ کہئے کہ قوانینِ فطرت کا یہی غیر متبدّل ہونا ہے، جس کی بنیاد پر خود کائنات کی حیرت فروش عمارت اس ثبات و استحکام کے ساتھ قائم ہے اور اس کی محیّر العقول مشینری اس حسن و خوبی اور نظم و نسق سے مصروفِ حرکت و عمل۔

کَلِمَۃُ اللّٰہِ اور سُنَّتُ اللّٰہِ

قانونِ خداوندی کے لئے قرآن میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ـ ایک کلمۃ اللہ اور دوسرے سُنّت اللہ۔ قرآن پر تدبّر سے ان دونوں میں یہ فرق سامنے آجاتا ہے کہ کلمہ، قانون کی نظری حیثیت ہے۔ جسے فارمولا کہا جاسکتا ہے اور سنت اللہ اس فارمولا کی عملی شکل۔ یعنی جب وہ نظری قانون، عملی پیکر اختیار کرے تو اسے سنت اللہ سے تعبیر کیا جائے گا ــــ یعنی وہ روش جس پر خدا چل رہا ہے، یا جس پر وہ کائنات کو چلا رہا ہے۔ یہ دونوں غیر متبدّل ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۶/۳۴)۔ کلمات اللہ (قوانینِ خداوندی)

کو کوئی بدل نہیں سکتا (نیز ۶/۱۱۶) ؛ (۱۸/۲۷)۔ دوسری جگہ ہے لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔ کلمات اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

سُنّت اللہ کے سلسلہ میں سورۂ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ○ (۳۳/۶۲)۔ خدا کی یہی سنّت (روش) اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں بھی رہی ہے (اور یہی قوم مخاطب کی صورت میں بھی رہے گی)۔ تو سنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔ (نیز ۴۰/۸۵) ؛ (۴۸/۲۳)۔ دوسرے مقامات پر تبدیل کی جگہ تحویل کا لفظ آیا ہے۔ یعنی روشِ خداوندی اپنا رُخ تک نہیں بدلتی۔ (۱۷/۷۷ ؛ ۳۵/۴۳)۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالمِ خلق میں آکر، خدا کا امر "قدر مقدور" ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ مقرر کردہ پیمانوں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔ اسی کو قرآن میں سنّت اللہ کہا گیا ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸)۔ خدا کی روش اقوامِ سابقہ کے بارے میں بھی یہی رہی ہے۔ یہ اس لئے کہ (عالمِ خلق میں) خدا کا امر، پیمانوں کے ظروف میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ غیر متبدل قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

حق کے معنی

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ حق، ان تعمیری نتائج کو کہتے ہیں جو منفعت بخش ہوں اور ٹھوس شکل میں سامنے آجائیں۔ سوال یہ ہے کہ خدا کا یہ دعوئے کہ کارگہ کائنات اس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ اس سے انسان کے لئے نفع رساں نتائج محسوس شکل میں ظہور میں آئیں، ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر کس طرح سامنے آسکتا ہے۔ اس کے لئے کہا کہ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۱۰/۸۲)۔ خدا اپنے قوانین کے ذریعے حق کو حق ثابت کر دیتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۴۲/۲۴)۔ خدا اپنے قوانین کے ذریعے باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو ثبت کر دیتا ہے۔ یہ چیز، ان تغیرات کی رُو سے جو کائنات میں، قوانینِ فطرت کے مطابق ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، سامنے آجاتی ہے لیکن اس کے لئے بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے ——

خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے، ہزار ہزار سال (۲۲/۴۷) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال۔ (۷۰/۴) کا ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان کے دست و بازو، کائناتی کی قوتوں کے رفیق بن جائیں، تو وہی نتائج

دنوں میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ یعنی، خارجی کائنات میں، سائنس کے انکشافات اور ایجادات کی رُو سے، اور انسانوں کی دنیا میں، قوانینِ خداوندی کے مطابق نظامِ مملکت قائم کرنے سے۔ لیکن یہ موضوع دوسرا ہے، اس لئے یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے[1]۔ اس طرح احقاقِ حق سے، خدا کا امر پورا ہوتا چلا جاتا ہے۔ سورۃ الطلاق میں ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمۡرِہٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا ۝ (۶۵/۳)۔ یقیناً اللہ اپنے امر کو (یعنی اس پروگرام کو جسے اس نے عالمِ امر میں متعین کیا تھا) تکمیل تک پہنچا کر رہتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر دیئے تھے۔

اشیائے فطرت مجبور ہیں

یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں۔ اب اسی سکّے کے دوسرے رُخ کی طرف آئیے جہاں سے یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اشیائے فطرت، ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہیں جو ان کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس مضمون کی آیات قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ملیں گی کہ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ۝ (۱۶/۴۹)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوٰت) میں جو کچھ ہے، وہ خدا کے حضور (قوانینِ خداوندی کے سامنے) سجدہ ریز ہے۔ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب اس کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور کسی کو اس سے مجالِ سرتابی اور یارائے سرکشی نہیں۔ کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوۡنَ (۲/۱۱۶)۔ سب اس کے تابعِ فرمان ہیں۔ کہیں ہے سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۵۷/۱)۔ کائنات کی ہر شے اس پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے جو اس کے لئے خدا نے مقرر کیا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "اسلام کیا ہے؟" یا انگریزی تصنیف ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے، اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو حسبِ ذیل نتائج سامنے آئیں گے :۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رُو سے وہ ان پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔

(۲) اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

(۳) یہ قوانین "قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" ہیں۔ یعنی ان کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) قصۂ آدم میں جو کہا گیا ہے کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (۲/۳۱)۔ "ہم نے آدم کو تمام "اسما" کا علم دے دیا۔" تو اس سے مراد علمِ اشیائے کائنات یعنی قوانینِ فطرت اور اشیائے کائنات کی خصوصیات و تاثیرات کا علم ہے۔ جب انسان، ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو فطرت کی قوتیں اس کے کنٹرول میں آجاتی ہیں۔ قصۂ آدم میں اسے "ملائکہ کے سجدہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲/۳۴)۔

قرآنِ کریم نے ان تمام تصریحات کو چند جامع الفاظ میں سمٹا دیا ہے، جہاں کہا ہے کہ وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ۔ (۴۵/۱۳)۔ خدا نے تمام اشیائے کائنات کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ تم ان سے فائدے حاصل کر سکو۔ انہیں اپنے کام میں لا سکو۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ٥ (۴۵/۱۳)۔ جو قوم بھی اس حقیقت پر غور و فکر کرے گی وہ اس میں، (کائنات میں انسان کا مقام متعین کرنے کے لئے) بڑی واضح نشانیاں پائے گی۔

ہم نے دیکھ لیا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور وہ یہ کہ خدا کا امر (جو کسی قاعدے، اور ضابطے کا پابند نہیں تھا) "امرِ مقدور" ہو گیا۔ یعنی وہ مطلق اختیار کے بجائے قانون بن گیا اور قانون بھی ایسا جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں

بالفاظِ دیگر، اس مرحلہ میں خدا نے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کر لیں۔ خدا کے لئے "پابندی" کے تصوّر سے احساس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس نے خود ہی ایسا کیا اور کہا ہے، تو ہمارے لئے ایسا

تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیئے ــــ اور "باک" کے کیا معنی؟ جب یہ ایک حقیقت ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں (کہ قوانینِ خداوندی غیر متبدل ہیں) تو اسے تسلیم کرنا ہی صداقت شعاری ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۵۴ - ۶/۱۲)۔ اس نے رحمت کو اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ قرآنِ کریم میں کَتَبَ کا لفظ ان مقامات پر آیا ہے، جہاں کسی بات کو کسی پر فرض (یعنی لازم) قرار دیا گیا ہو۔ جیسے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔ یعنی یہ فریضہ خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا، كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ کے معنے یہ ہوئے کہ خدا نے اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کی ہوئی ہے۔ دوسری جگہ ہے حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۱۰۳)۔ مومنین کو مصائب و آلام سے محفوظ رکھنا، خدا نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ یہاں حَقًّا عَلَيْنَا کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۳۰/۴۷)۔ مومنین کی مدد کرنا ہمارے اوپر واجب ہے۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ (۵۸/۲۱)۔ خدا نے یہ لکھ رکھا ہے (فیصلہ کر رکھا ہے) کہ ہم اور ہمارے رسول ضرور غالب رہیں گے۔

خدا کی یہ رحمت، مومنین کی نجات، فتح و نصرت، غلبہ و تمکن، (جنہیں خدا نے اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے) کن شرائط سے مشروط ہے، اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ خدا نے خود اپنے اوپر بھی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ ان پابندیوں کو "خدا کا وعدہ" بھی کہا گیا ہے۔ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا (۱۶/۳۸)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے جس کا ایفا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم قرار دے رکھا ہے۔ (نیز ۳۱/۹ ؛ ۳۵/۵ ؛ ۴۰/۵۵ ؛ ۴۰/۷۷)۔ ان "وعدوں" کے متعلق اس نے بالتصریح کہہ دیا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوگی۔ وَعْدَ اللّٰهِ ۔ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳۰/۶)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اور یاد رکھو کہ خدا اپنے وعدوں کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ (نیز ۳/۱۹۳)۔

خدا کے وعدے

خدا کے یہ "وعدے" درحقیقت اس کے مقرر کردہ قوانین ہیں اور ان کی خلاف ورزی نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں

ہوگی۔ یہ ہے مراد اس "پابندی" سے، جو خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ اس پابندی کی ایک نمایاں مثال خود قرآن میں دی گئی ہے۔ یہ واضح ہے کہ خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے لیکن، اس کے بعد اس نے اشیائے کائنات کے لئے غیر متبدّل قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ انہی قوانین میں سے ایک قانونِ تولید ہے جس کی رو سے حیوانات اور انسانی بچّے کی پیدائش، نر و مادہ کے اختلاط سے ہوتی ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ابن اللہ (خدا کے بیٹے) تھے۔ خدا نے اس عقیدے کی تردید کی ہے اور جس دلیل کے ساتھ اس کی تردید کی ہے وہ بصیرت کے ہزار سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس نے کہا کہ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ خدا، اس تمام سلسلۂ کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ وہ اپنے تخلیقی پروگرام کے لئے علّت و معلول کے قانون کا پابند نہیں تھا۔ لیکن تخلیقِ کائنات کے بعد جب اس نے علّت و معلول کا قانون نافذ کر دیا، تو اب اس کے خلاف، وہ خود بھی کچھ نہیں کرتا۔ بیٹے کی پیدائش کے لئے اس کا قانون یہ ہے کہ نر و مادہ (میاں بیوی) کے اختلاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں، خدا کا بیٹا ہے۔ اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ" (۶/۱۰۲)۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اتنا نہیں سوچتے کہ خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جب اس کی بیوی ہی نہیں ؟

آپ نے غور فرمایا کہ اس دلیل میں، خدا نے کتنی عظیم حقیقت بیان کر دی ہے۔ یعنی یہ درست ہے کہ وہ بَدِیْعُ السمٰوٰت و الاَرْض ہے۔ وہ بغیر کسی سابقہ (موجودہ) مسالہ کے، اور بلا پابندیٔ قانونِ علّت و معلول، کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے، لہذا، اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ اپنے ہاں ایک بیٹا بھی اس طرح پیدا کر لے، لیکن، جب اس نے بچّے کی پیدائش کے لئے ایک قانون بنا دیا، تو اس قانون کی خلاف ورزی وہ خود بھی نہیں کرتا ——— وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن ایسا کرتا نہیں۔

ایک اعتراض کا جواب

اور اس میں (کہ وہ ایسا کر سکتا ہے، لیکن ایسا کرتا نہیں) ایک بہت بڑا نکتہ پوشیدہ ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر خدا کو بھی قوانین کا پابند تسلیم کر لیا جائے تو وہ قادرِ مطلق نہیں رہتا، مجبور ہو جاتا ہے اور یہ خدا کی شان کے خلاف ہے لیکن ایسا سمجھنا سطح بینی اور غلط نگہی کا نتیجہ ہے۔ مجبور وہ ہوتا ہے جو کسی دوسرے کی طرف

سے عائد کردہ پابندی کا پابند ہو۔ لیکن جو خود اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرے، اسے مجبور نہیں کہا جاتا۔ اگر آپ کو حکماً کہا جائے کہ آپ ہر روز صبح تین میل کا چکر لگائیں، تو آپ اس حکم کی تعمیل جبراً کریں گے۔ لیکن اگر آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ ہر روز صبح کے وقت، تین میل کی سیر کیا کریں گے اور پھر آپ التزاماً سیر کریں، تو اسے آپ پر جبر نہیں کہا جائے گا۔ اپنے وعدوں کا ہمیشہ ایفا کرنے والا، اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والا، بات کا پکا، قول اقرار کا پورا، مردِ مجبور نہیں کہلاتا، اصول پرست اور قابلِ اعتماد کہلاتا ہے۔ اس لئے، خدا نے اگر، اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق کے باوجود، اپنے اوپر خود کچھ پابندیاں عائد کرلی ہیں، تو اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے میں نقص واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو، بلکہ، اس کے صاحبِ عزمِ صمیم ہونے کی دلیل ہے کہ وہ سب کچھ کرسکنے کے اختیارات اور قدرت رکھنے کے باوجود اپنے اصول کو نہیں توڑتا، اپنے وعدے سے نہیں پھرتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اور سچ پوچھئے تو خدا ہونا زیبا ہی اسے دیتا ہے، جو اس قدر لامحدود اختیارات اور لا انتہا قوتوں کا مالک ہونے کے باوجود، اتنی شدّت سے بات کا پکا اور وعدے کا سچّا (اصولوں کا پابند) رہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر اعتمادِ کلّی کیا جاسکتا ہے۔ یاد رکھئے! خدا ایسا کرسکتا تھا کہ کائنات کو پیدا کردیتا لیکن اس کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرّر نہ کرتا۔ وہ ایسا کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا کیا نہیں۔ اس نے اس کے لئے قوانین مقرّر کردیئے۔

پھر وہ ایسا بھی کرسکتا تھا کہ اپنے متعیّن کردہ قوانین کو جب جی چاہے بدل دے لیکن اس نے کہا کہ ہم، ایسا کرسکنے کے باوجود، ایسا کریں گے نہیں۔ یہ ہے خدا کا صحیح تصوّر۔

لیکن خدا کا یہ تصوّر دینؔ کا عطا کردہ ہے، جسے مذہب کا خوگر انسان اپنا نہیں سکتا یا اپنانا چاہتا نہیں۔

مذہب کے تصوّر کا خدا

جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے، مذہب انسان کے عہدِ طفولیّت میں پیدا شدہ تصوّرات کا مجموعہ ہے جب وہ (بچّے کی طرح) ہنوز قانون کے تصوّر سے ناآشنا تھا۔ انسان اب بالغ ہوچکا ہے اور عقل و فکر کی رُو سے، خدا کے اس تصوّر کو (APPRECIATE) کرسکتا ہے جو دینؔ نے عطا کیا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت کا مفاد اسی میں ہے کہ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیّت میں رہے، اس لئے وہ لوگوں کو اس طرف آنے نہیں دیتے۔ وہ انسانی ذہن میں اس قسم کے خدا کا تصوّر راسخ کرنا چاہتے ہیں جس سے وہ، درمیانی واسطہ بن کر، لوگوں کی "مرادیں پوری کرادیں" اور یوں عوام سے اپنی خدائی منواتے رہیں۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت نے، ملوکیّت کا تصوّر عام کیا ــــ یا یوں کہئے کہ ملوکیّت اور

مذہبی پیشوائیت نے گٹھ جوڑ کرلیا ـــ اور بادشاہ کے ذی اقتدار ہونے کا ثبوت یہ دیا کہ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ وہ جو جی میں آئے کرے اور جیسا چاہے حکم دیدے۔ اس قسم کے نظامِ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے تابع زندگی بسر کرنے والا انسان، احکام کا پابندی کا تصور تو کرسکتا ہے، قانون کی اطاعت کا نہیں۔ مذہب کی گرفت کس قدر سخت اور ذہنِ انسانی پر اس کے اثرات کس قدر گہرے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو لوگ، ملوکیت یا ڈکٹیٹرشپ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرکے، قانون کی حکمرانی کا نظامِ سیاست قائم کرنے کے لئے جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں، وہ بھی جب پرستش گاہوں میں آتے ہیں تو خدا کو قانون کے مطابق حکومت کرنیوالے صاحبِ اقتدار کی بجائے، آمرِ مطلق کی شکل میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں ـــ یہ ہے مذہب کی سحر آفرینی! یعنی اپنی دنیا میں قانون کی حکمرانی اور خدا کی خدائی میں کامل لاقانونیت!! دین، اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ یعنی یہ کہنے کے لئے کہ انسانوں کی تمدنی زندگی کا نقشہ خارجی کائنات کا سا ہونا چاہیے، جہاں قاعدے اور قانون کی حکمرانی ہے اور جس میں کوئی اپنی من مانی نہیں کرسکتا۔ (اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

باب سوم

انسان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی دوسری منزل میں، اس کے امر نے قانون کی شکل اختیار کرلی اور اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئیں اور خود خدا نے یہ عہد کر لیا کہ وہ ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔ یہ عالمِ تخلیق کا بہت بڑا انقلاب تھا لیکن اس سے بھی بڑا انقلاب ایک اور تھا ـــــ اور وہ تھا انسان کی تخلیق ـــــ قوانین تو انسان کے لئے بھی متعین کئے گئے لیکن انسان کو ان کی اطاعت کے لئے مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اسے اختیار دیا گیا کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ آپ غور کیجئے کہ یہ، خدا کے تخلیقی پروگرام میں، کتنا عظیم انقلاب تھا۔

(۱) خدائے جلیل، لامحدود اختیارات کا مالک، قادرِ مطلق لیکن اس نے اپنے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل قرار دے کر، اپنے اوپر آپ پابندی عائد کرلی۔

(۲) اشیائے کائنات ان قوانین کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئیں۔ اور

(۳) انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا۔

انسان۔ صاحبِ اختیار و ارادہ

مجبور کے سامنے صرف ایک راستہ ہوتا ہے جس پر اسے طوعاً و کرہاً چلنا ہوتا ہے لیکن صاحبِ اختیار اُسے کہتے ہیں جس کے سامنے ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) ہوں، اور اسے اس کا اختیار ہو کہ وہ ان میں سے جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ اسے حقِ انتخاب یا (CHOICE) کہا

جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی تخلیق کے متعلق کہا کہ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ (۹۰/۱۰)۔ اور ہم نے اسے دو راستے دکھا دیئے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳)۔ ہم نے اسے زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔ اب یہ اس کے اپنے فیصلے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اختیار کر لے یا اس پر چلنے سے انکار کر دے۔ اسی کی وضاحت دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورۃ النجم میں ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○ (۵۳/۳۹) انسان کو وہی کچھ حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ "کوشش" کا محرک جذبہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے۔ اس لئے متعدد مقامات پر بتایا کہ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کا وہ ارادہ کرے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ "جو شخص دنیا کے مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کا ارادہ کرے اسے ہم وہی مفادات دے دیتے ہیں اور جو شخص مستقبل کی خوشگواریوں کا ارادہ کرے اور پھر ان کے حصول کے لئے کوشش کرے تو ہم اسے اس کا مطلوب عطا کر دیتے ہیں۔ یہ جہانِ سعی و عمل ہے، جو جس میدان میں کوشش کرتا ہے اس میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے ...وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (۱۷/۲۰-۱۸)۔ ہم نے اپنی بخشائشوں کے راستے میں بند نہیں لگا دیئے۔ وہ سب کے لئے کھلی ہیں۔ جس کا جی چاہے اپنی سعی و عمل سے انہیں حاصل کر لے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ (۴/۱۳۴)۔ جو قریبی مفادات حاصل کرنے کا ارادہ کرتا ہے (تو اس سے کہہ دو کہ) خدا کے ہاں قریبی مفادات بھی ہیں اور مستقبل کی خوشگواریاں بھی۔ تم جو کچھ حاصل کرنے کا ارادہ کرو گے، وہی کچھ تمہیں مل جائے گا۔ (نیز ۲۵/۶۲)۔

جیسا کہ آئندہ باب (مکافاتِ عمل) میں تفصیلاً بتایا جائے گا، انسان کو اس کے تمام اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور اس کی یہی وہ ذمہ داری ہے جس کی وجہ سے اس کے اعمال کے نتائج اس کے سامنے آتے ہیں۔ اعمال کی جزا و سزا کا سارا نظام اسی محور کے گرد گردش کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی کام کا ذمہ دار وہی قرار پا سکتا ہے جو اسے اپنے اختیار و ارادہ سے سرانجام دے۔ جس سے مجبوراً کوئی کام کرایا جائے اسے

انسان کی ذمہ داری

اس کا ذمّہ دار ٹھہرایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس بنا پر قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ مجبور اور صاحب اختیار وارادہ، دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۷۵۔ ۷۶/ ۱۶)۔ یہی وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ اگر کسی سے کفر کا بھی کوئی کام جبراً کرایا جائے تو اس سے اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ مؤاخذہ اسی عمل کا ہوگا جو اپنے اختیار وارادہ سے کیا جائے۔ (۱۶/۱۰۶)۔ دوسری جگہ ہے کہ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳/۵)۔ اگر تم سے بھول چوک سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ گرفت اس کی ہوگی جس میں تمہارے دل کا ارادہ شامل ہو۔ یہی اصول اس نے، دنیاوی قانونِ عدل کے سلسلہ میں بھی متعیّن کیا ہے، جس کی رُو سے اس نے قتلِ عمد اور قتلِ خطا میں فرق کیا ہے، اور دونوں کی سزائیں الگ الگ تجویز کی ہیں ۔ قتلِ عمد کی سزا سخت اور قتلِ خطا کی نرم۔ (۹۲۔ /۴)۔

قصّۂ آدم ــــ جبر واختیار کی وضاحت

قرآنِ کریم نے "جبر اور اختیار" کے مسئلہ کو 'قصّۂ آدم' کے تمثیلی انداز میں نہایت دل نشین طریق سے حل کر دیا ہے۔ خدا نے آدم کو بھی ایک حکم دیا اور ابلیس کو بھی۔ آدم سے بھی اس حکم کی معصیت سرزد ہوئی (خلاف ورزی ہوئی) اور ابلیس سے بھی۔ جب آدمؑ سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے جھکی ہوئی نگاہوں سے کہا کہ

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا .... (۷/۲۳)۔

اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کر لی ہے۔

ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نادم ہیں، شرمسار ہیں۔ یعنی آدم نے اس کا اعتراف کیا کہ اس معصیت کا ذمّہ دار وہ خود ہے۔ چونکہ اس نے اپنی ذمّہ داری کا اعتراف کیا اور محسوس کر لیا کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے، اس کے لئے اصلاحِ خویش اور بازآفرینی کے امکانات روشن ہو گئے۔ اس سے کہا گیا کہ کوئی بات نہیں۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (۲/۳۸)۔ ہم تمہاری طرف راہ نمائی بھیجتے رہیں گے۔ تم میں سے جو بھی اس کا اتباع کرے گا، وہ خوف و حزن سے مامون رہے گا۔ اسی کو فردوسِ گم گشتہ

کی بازیابی کا امکان کہا جاتا ہے۔ قرآن نے اسے غلطی سے لغزش کے بعد توبہ سے تعبیر کیا ہے۔ (۱۶/۱۱۹)

اس کے برعکس، جب ابلیس سے یہی سوال کیا گیا کہ (تم نے حکمِ خداوندی سے سرتابی کیوں برتی ہے۔) تو اس نے خدا سے کہا کہ میں نے سرتابی کیسے برتی ہے۔ اَغْوَیْتَنِیْ۔ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (۷/۱۶ ؛ ۱۵/۳۹)۔ میں تو بندۂ مجبور ہوں۔ مجھے نہ اطاعت کا اختیار ہے نہ معصیت کا۔ یہاں سب کچھ تیرے حکم سے ہوتا ہے۔ تو نہ چاہتا تو میں سرکشی کس طرح اختیار کر سکتا تھا۔ چنانچہ جب ابلیس نے اپنے عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تجھ میں اصلاحِ خویش اور بازآفرینی کا امکان ہی نہیں۔ فَاِنَّکَ رَجِیْمٌ (۱۵/۳۴)۔ تو اپنی بازآفرینی کے امکانات سے بہت دُور چلا گیا۔ تو "مذؤم و مدحور" ہے۔ (۷/۱۸)۔ دھتکارا ہوا، ذلیل و خوار۔ ابدی مایوسی تیرا "مقدر" ہے۔ (ابلیس کے معنی ہی مایوس کے ہیں)۔ یعنی جو اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے، وہ اپنی حالت میں تبدیلی کیسے کر سکتا ہے۔ یہی اس کی ابدی مایوسی کی دلیل ہے۔

کفار و مشرکین کی روش

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ ابلیس نے جو کہا تھا کہ "اگر تو نہ چاہتا تو میں معصیت شعار کیسے ہو جاتا۔" یہی روش دنیا میں کفار اور مشرکین کی ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے اعمال کا ذمہ دار اپنے آپ کو قرار نہیں دیتے بلکہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کی مشیت میں ایسا نہ ہوتا، تو ہم کفر و شرک کی روش کیسے اختیار کر سکتے تھے؟ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا .... (۶/۱۴۹)۔ جب تو ان مشرکین سے کہے گا کہ تم نے یہ کیا روش اختیار کر رکھی ہے، تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی تھی۔ اگر خدا ایسا نہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء و اجداد۔ ان کے جواب میں خدا نے کہا کہ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ○ (۶/۱۴۹)۔ ان سے کہدو کہ جو کچھ تم کہتے ہو، تمہاری اپنی قیاس آرائیاں اور جہالت ہے۔ حقیقت کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ سورۂ زخرف میں ہے کہ جب تم ان سے یہ سوال کرتے ہو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰھُمْ ط اگر خدا کو منظور ہوتا تو ہم کبھی ان معبودانِ باطل کی عبادت نہ کرتے۔ ہم کیا کریں۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ انسان اُس کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں۔ کہا کہ مَا لَھُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ ق

اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ؁ (۲۰/۴۳)۔ یہ یکسر جہالت ہے، حماقت ہے، کذب ہے، افترا ہے۔

سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ جب ان سرمایہ داروں سے کہا جاتا ہے کہ اپنی دولت کو کھلا رکھو تاکہ ان غریبوں کو بھی روٹی مل سکے تو یہ کفار مومنین سے کہتے ہیں۔ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗ ۔ واہ! تم یہ عجیب بات کہتے ہو۔ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ بھوکے نہ رہیں تو وہ انھیں ضرور رزق دے دیتا۔ ان کے بھوکے ننگے رہنے سے صاف ظاہر ہے کہ خدا یہ چاہتا ہی نہیں کہ انھیں روٹی کپڑا ملے۔ سو خدا تو یہ چاہتا ہے کہ یہ ننگے بھوکے رہیں اور تم ہم سے کہتے ہو کہ ہم ان کے روٹی کپڑے کا انتظام کریں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ خدا کی مشیت کے خلاف ہوگا۔ یہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہوگا۔ ہم تو اس کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے اس کے جواب میں کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (۳۶/۴۷) ان سے کہو کہ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ تم بڑے ہی گمراہ ہو۔

خدا کی مرضی

یہاں ایک ثانیہ کے لئے رکئے اور سوچئے کہ ہم جو اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی یہی تھا۔ اس کی مرضی ہی ایسی تھی۔ یہی اس کی مشیت تھی۔ وہ چاہتا ہی یہ تھا۔ اگر اس کی مرضی نہ ہوتی تو ایسا ہو کیسے سکتا تھا۔ لہذا، یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی منشار کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہاں کسی کے دم مارنے کی جا نہیں۔ ہم اٹھتے بیٹھتے یہ کچھ کہتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جو جتنا زیادہ کہتا ہے کہ "مرضیِ مولا بر ہمہ اولیٰ" اسے اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب سمجھا جاتا ہے۔ اور جو یہ تلقین کرتا ہے کہ

مرضیٔ یار کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں (حسرت موہانی)

وہ اتنا ہی خدا پرست تصور کیا جاتا ہے — تو آپ سوچئے کہ قرآن ایسا کہنے والوں کے متعلق کیا کہتا ہے؟ قرآنِ مجید کی آیات آپ کے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ خود کسی نتیجہ پر پہنچ جایئے — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ یہ کفار اور مشرکین (ابلیس کے اتباع میں) یہ کہتے ہیں کہ انسانی دنیا

انسانی دنیا میں انسان کی مشیت

میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور خدا انسانوں سے یہ کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا

مَا شِئْتُمْ (۴۰/۴۱)۔ تمہاری دنیا میں تمہاری "مشیت" کارفرما ہے۔ تم جس طرح جی چاہے کرو۔ ہم نے تمھیں صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ہم یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے معاملات میں دخیل ہو کر اور اپنی مشیت کو تم پر مسلّط کر کے، تمہارے اختیار و ارادہ کو سلب کر لیں۔ اگر ہم نے اسے سلب کرنا ہوتا تو اسے عطا ہی کیوں کرتے۔ یہ تمہارا اپنی ذمہ داری سے فرار ہے جو تم صاحبِ اختیار ہوتے ہوئے اپنے آپ کو مجبور کہتے ہو۔

لیکن اس نے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ کے ساتھ ایک اور بات بھی کہی ہے جس سے انسان کے اس اختیار کے بعد جبر کا ایک گوشہ سامنے آ جاتا ہے۔ کہا کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (۴۰/۴۱)۔ تم جو کچھ چاہو کرو لیکن اتنا سمجھ لو کہ تمہارا ہر عمل ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے ایک خاص نتیجہ مرتّب کرے گا۔ تمھیں

اختیار میں جبر

اس کا تو اختیار ہے کہ تم جو کام جی چاہے کرو، لیکن جب تم سے ایک عمل سرزد ہو گیا تو اس کے بعد تمھیں اس پر اختیار نہیں رہے گا کہ تم اس کے نتیجہ کو روک لو یا اس میں تبدیلی پیدا کر دو۔ یہ چیز تمہارے حیطۂ اختیار سے باہر ہو گی۔ دو راستوں میں سے کسی ایک راستہ پر چلنے کا تمھیں اختیار ہے لیکن تمھیں اس کا اختیار نہیں کہ تم راستہ تو (الف) اختیار کرو اور چاہو کہ اس سے پہنچ جاؤ اس منزل پر جس کی طرف دوسرا راستہ (ب) لے جاتا ہے (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) تمھیں اس کا تو اختیار ہے کہ تم سنکھیا پھانک لو یا مصری کی ڈلی کھاؤ لیکن تمھیں اس پر اختیار نہیں کہ تم کھاؤ تو سنکھیا اور اس سے نتیجہ پیدا کر لو مصری کی ڈلی کا۔ ہم نے تمہارے ہر کام کا نتیجہ مرتّب کرنے کے لئے قانون متعیّن کر رکھا ہے۔ جس قسم کا کام تم کرتے ہو اسی کے مطابق ہمارا قانون تم پر منطبق ہو جاتا ہے تاکہ اس کام کا متعیّن نتیجہ مرتّب ہو جائے۔ پہل کرنا (INITIATIVE) تمہارے ہاتھ میں ہے، ہمارا قانون تمہارے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔

جیسا انسان خود ہو جائے اس قسم کا قانون اس پر منطبق ہو گا

قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو متعدد مقامات پر واضح کیا ہے۔ بنی اسرائیل کی بے راہ رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵)۔ جب انھوں نے ٹیڑھی راہیں اختیار کر لیں تو خدا (کے قانونِ مکافات) نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے۔ ان سے کہا گیا کہ اب

خدا کا آخری رسول آگیا ہے۔ تم اس کا ساتھ دو گے تو تمہاری ذلّت و خواری کی سزا کی مدت ختم ہو جائے گی لیکن اِنْ عُدْتُّمْ ـــ عُدْنَا (۱۷/۸)۔ اگر تم پھر اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ گئے تو ہم بھی اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جائیں گے اور تم اسی عذاب میں پھر ماخوذ ہو جاؤ گے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۵۱/۹)۔ جو صحیح راستے سے اپنا رُخ موڑ لیتا ہے، ہم اس کا رُخ اسی طرف کر دیتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ۔ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۹/۱۲۷) پھر وہ جب صحیح راستے سے پھر گئے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو پھیر دیا۔ سورۂ النساء میں ہے کہ جو لوگ رسول کا اتباع اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہیں تو نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (۴/۱۱۵)۔ تو جن کی راہ وہ اختیار کر لیتے ہیں ہم بھی انہیں انہی کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲)۔ جو ہمیں یاد رکھتا ہے ہم بھی اسے یاد رکھتے ہیں۔ جو ہمارے دین کے شرف و مجد کے لئے کوشش کرتا ہے ہم بھی اسے صاحبِ شرف و مجد بنا دیتے ہیں۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) جو ہماری مدد کرتا ہے ہم بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسان جو راستہ اپنے لئے تجویز کرتا ہے اس کے مطابق خُدا کا قانون اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ نے اس حقیقتِ کبریٰ کو نہایت حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ جب (تقدیر کے متعلق بات کرتے ہوئے) کہا ہے کہ

حرفے باریکش بہ رمزے مضمر است	تو اگر دیگر او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا	سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست	قلزمی! پائندگی تقدیرِ تست

قوموں کا تبدیلئ احوال

قرآنِ کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جو قانون افراد پر منطبق ہوتا ہے، اسی کے مطابق قوموں کی "تقدیر" بھی بدلتی رہتی ہے۔ یعنی کوئی قوم جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرتی ہے اسی کے مطابق اس کی خارجی حالت میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے سورۂ الرعد میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱؛ ۸/۵۳)

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ کسی قوم کے پاس ہو خدا اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ

قوم اپنی نفسیات میں خود تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔

یعنی افراد کی طرح اقوام کے عروج و زوال اور موت و حیات کے لئے بھی خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ کوئی قوم جس قسم کی روش اختیار کرلیتی ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر منطبق ہوجاتا ہے اور اس قوم کی روش کا نتیجہ مرتب کردیتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی پچھلے باب میں ملے گی جس کا تعلق قوموں کے عروج و زوال سے ہے)۔

لفظ تقدیر کی مزید وضاحت

تصریحاتِ بالا سے "تقدیر" کا مفہوم واضح ہوگیا ہوگا۔ لفظ "تقدیر" کے صحیح مفہوم کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا گیا ہے، اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (۶/۹۷)۔ خدا نے رات کو آرام کے لئے اور سورج اور چاند کو (وقت کے) حساب و شمار کا ذریعہ بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی "تقدیر" ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ "یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔" اسی طرح سورۂ یٰسین میں ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (۳۶/۳۸)۔ اور سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی "تقدیر" ہے۔ تیسری جگہ ہے۔ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ قلے وَحِفْظًا ط ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○ (۴۱/۱۲)۔ اور ہم نے تمہاری قریبی فضا میں جگمگاتے چراغ (ستارے) روشن کردیئے اور انھیں تمہاری حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی تقدیر ہے۔ اجمالاً سورۂ فرقان میں ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ○ (۲۵/۲)۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر ان کے لئے "تقدیر" مقرر کردی۔ یہاں بھی "تقدیر" سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ سورۂ الدھر میں جنّت کے آبخوروں کے متعلق ہے۔ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ○ (۷۶/۱۶)۔ یہ آبخورے چمکدار چاندی کے ہوں گے اور انھیں خاص پیمانوں کے مطابق بنایا گیا ہوگا۔

قرآنِ کریم میں انہی مقامات پر تقدیر کا لفظ آیا ہے اور اس کے معنی بالکل واضح ہیں۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ پیمانے، یا قوانینِ خداوندی، جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اس سے واضح

ہے کہ جن معنوں میں یہ لفظ (تقدیر) ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے وہ اس کے قرآنی مفہوم کے بالکل خلاف ہے۔
"انسان کی تقدیر"، "اس کی تقدیر"، "میری تقدیر"؛ یہ سب غلط ہے۔ تقدیر تو صرف خدا کی ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی۔ لہٰذا انسانوں کی صورت میں ہم یہ کہیں گے کہ

تقدیر، خدا کا وہ قانون ہے جو انسان کی حالت کے مطابق اس پر
وارد ہو جاتا ہے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کر لے، اس قسم
کی خدا کی تقدیر (خدا کا قانون) اس پر منطبق ہو جاتا ہے۔

جو شخص آگ میں انگلی ڈالتا ہے، خدا کی یہ تقدیر اس پر وارد ہو جاتی ہے کہ وہ جلن اور سوزش کی تکلیف میں مبتلا ہو اور جب وہ اس پر مرہم لگا لیتا ہے تو خدا کی یہ تقدیر اس پر منطبق ہو جاتی ہے کہ اُسے راحت اور سکون حاصل ہو جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست — زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

حضرت عمر فاروقؓ کی تصریح

اسی حقیقت کی وضاحت حضرت عمرؓ کا وہ واقعہ کرتا ہے کہ جب ایک جگہ طاعون پھیلا تو آپ نے کہا کہ اس بستی کو چھوڑ کر جنگل میں چلے جانا چاہیئے۔ اس پر حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا کہ افر ار من قدر اللہ۔ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ نعم۔ ہاں! افر من قضاء للہ الی قضاء اللہ۔ میں خدا کی (ایک) تقدیر سے بھاگ کر (دوسری) تقدیر کی طرف جانا چاہتا ہوں — طاعون زدہ علاقہ میں رہ کر، اور اس طرح اس کی متعدی فضا سے متاثر ہو کر طاعون میں مبتلا ہو جانا، یہ بھی خدا کی تقدیر (قانونِ خداوندی) کے مطابق ہوتا ہے اور اس جگہ کو چھوڑ کر صاف فضا میں چلے جانا اور یوں اس خطرہ سے محفوظ ہو جانا، یہ بھی خدا کی تقدیر (قانونِ خداوندی) کے مطابق ہوتا ہے۔ اب یہ چیز انسان کے اپنے اختیار کی ہے کہ وہ خدا کی کونسی تقدیر اپنے اوپر وارد کرانا چاہتا ہے۔ وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے کہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ جس شخص کا ارادہ مستحکم ہوتا ہے وہ اپنی روش کو اپنی مرضی کے مطابق بدلتا ہے۔ اور چونکہ، جس قسم کی اس کی روش ہوگی اسی قسم کی خدا کی تقدیر اس پر وارد ہوگی، اس لئے مستحکم ارادوں کا مالک انسان، اپنی مرضی کے مطابق خدا کی تقدیر اپنے اوپر وارد کراتا ہے۔ اس کے برعکس، کمزور ارادے کے انسان کی روش، خارجی اثرات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے یہ اس کے اختیار کی بات نہیں ہوتی کہ خدا کی کسی قسم کی تقدیر (کونسا قانونِ خداوندی) اس پر وارد ہو۔ بالفاظِ دیگر، وہ نباتات وجمادات کی طرح، مجبور ہوتا ہے۔ فلہذا، تقدیر کے تابع رہتا ہے اور صاحبِ عزم صمیم تقدیر کو اپنی مرضی کے تابع رکھتا ہے۔ ؏

تو اگر دیگر شوی او دیگر است

یہ ہے تقدیر کا قرآنی مفہوم۔ یہ مفہوم اس مفہوم میں کیسے تبدیل ہوگیا جو اب ہمارے ہاں

یہ مفہوم کیسے بدل گیا؟

لیا جاتا ہے، اسے آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ جہاں بتایا جائے گا کہ قرآن کا عطا کردہ دین، کس طرح مذہب میں بدل گیا۔ یہ وہ بنیادی تبدیلی تھی جس سے، خدا، کائنات اور انسان کے متعلق دین کے تصورات، مذہب کے تصورات میں بدل گئے۔ اس سے خدا، قانون کے مطابق حکومت کرنے والے صاحبِ اقتدار کے بجائے، ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کر گیا اور انسان، صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق کے بجائے تقدیر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی بنا دیا گیا اور مذہبی پیشوا، اس جیل خانے کے داروغے بن کر بیٹھ گئے ـــــ یہ داستان ہے بڑی الم انگیز اور یہ حدیث ہے بڑی دلگداز۔ لیکن اس کے بیان کرنے کا موقعہ آگے چل آئیگا۔

عقیدہ جبر کے سلسلہ میں ایک اصولی بحث

دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے، انسان کو مجبور تصور کرنے والے (یعنی عقیدہ جبر کے مؤید) قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی اپنے عقیدہ کی تائید میں دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان آیات کے متعلق آئندہ ابواب میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ لیکن اس سلسلہ میں جو اصولی بحث چھیڑی جاتی ہے، مناسب معلوم

ہوتا ہے کہ اسے اس مقام پر سامنے لالے آیا جائے تاکہ اصولی حیثیت سے بات یہیں واضح ہو جائے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ

(۱) وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ..... (۳۱/۳۴)۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں واقع ہو گی۔ (۱۸/۲۳)

(۲) اور خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ (۲/۲۵۵ و دیگر مقامات) یعنی خدا لوگوں کے حال سے بھی باخبر ہوتا ہے اور مستقبل سے بھی۔ پہلی آیت سے بھی یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ جب انسان سب کچھ اپنے ارادے کے مطابق کرتا ہے تو اس کے لئے یہ متعین کرنا کیا مشکل ہے کہ وہ کل کیا کرے گا۔ یہ صورت تو اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان مجبور ہو، اس لئے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب ہو گا کہ میں کیا جانوں کہ میں کل کیا کروں گا۔ جو کچھ مجھ سے کرایا جائے گا وہی کچھ میں کروں گا۔

مستقبل کا علم

یہ دلیل بنیادی طور پر غلط ہے۔ انسان بے شک صاحبِ اختیار و ارادہ ہے، لیکن اس کا اختیار لامحدود نہیں۔ وہ بہت سے ایسے حالات سے مشروط ہوتا ہے جس کے متعلق وہ قبل از وقت یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور بہت سے ایسے مؤثرات سے اثر پذیر ہوتا ہے جس پر اسے انفرادی طور پر اختیار نہیں ہوتا۔ اگر انسان کسی ایسی دنیا میں رہتا جہاں نہ بیرونی حوادث اور واقعات اس کی زندگی کو متاثر کر سکتے اور نہ ہی دوسرے انسانوں کے اعمالِ حیات واقعات کا رُخ موڑ سکتے، تو وہ یہ کہہ سکتا تھا کہ میں مستقبل میں کیا کروں گا۔ لیکن انسان ایک ایسی دنیا میں بستا ہے جہاں وہ قدم قدم پر خارجی حوادث اور معاشرتی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ اگر سوال صرف خارجی کائنات کے حوادث کا ہوتا، تو بھی ہم کہہ سکتے تھے کہ کارگہِ کائنات کے اسرار و غوامض کے متعلق جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جائے گا، وہ مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کا علم قبل از وقت حاصل کر سکنے کے قابل ہو جائے گا۔ مثلاً جس طرح وہ آج تیقن سے کہہ سکتا ہے کہ چاند یا سورج گہن کب لگے گا، اسی طرح وہ زلزلہ کا وقت اور مقام بھی قبل از وقت متعین کر سکے گا لیکن انسان کی مشکل یہ ہے کہ وہ ایسے (دیگر) انسانوں کے انبوہ میں گھرا ہوا ہے جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادے کا مالک ہے اور ان کے فیصلوں کا اثر دیگر افراد پر بھی پڑتا ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ امریکہ کی برسرِ اقتدار

آنے والی پارٹی یا وہاں کے صدر کا انتخاب اقوامِ عالم کی بساطِ سیاست کو ہلا کر، اور دنیا کی منڈیوں کو کپکپا کر رکھ دیتا ہے۔ ایسی دنیا میں بسنے والا انسان، یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ چاند کہہ سکتا ہے کہ میں کس وقت اور کہاں سے طلوع ہونگا۔ سورج کہہ سکتا ہے کہ میں کس وقت اور کس نقطہ پر غروب ہوں گا۔ انسان بالیقین نہیں کہہ سکتا کہ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوگی۔ اس سے انسان کے مجبور ہونے پر دلیل نہیں لائی جا سکتی۔ اس سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ متمدن دنیا میں ایک فرد کا فیصلہ بہت سے ایسے عناصر سے مشروط اور ایسے عوامل سے محصور ہوتا ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا اس لئے وہ مستقبل کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ قرآن کریم نے جو غور و فکر اور عقل شعور سے کام لینے کی اس قدر تاکید کی ہے تو اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے "تا بحدِ امکان" احوال و ظروف کا اندازہ کرلے اور مختلف عناصر و عوامل کا جائزہ لے لے۔ لیکن وہ ایسا تا بحدِ امکان ہی کر سکتا ہے، حتم و یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف کہ خدا لوگوں کے حال سے بھی باخبر ہوتا ہے اور مستقبل سے بھی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مستقبل کے متعلق علم اسی شے کا ہو سکتا ہے جو مجبور ہو۔ جس کی کیفیت یہ ہو کہ وہ جس وقت جی چاہے اپنا ارادہ بدل دے، اس کے مستقبل کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔

علمِ خداوندی

مثال کے طور پر، ایک ماہرِ علم الافلاک سو سال پہلے یہ (PREDICT) کر سکتا ہے کہ چاند کو گہن کب لگے گا، لیکن دس سائنٹسٹ بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکھی جو اس وقت یہاں بیٹھی ہے، اُڑنے کے بعد کہاں جا بیٹھے گی۔ لہٰذا، جب خدا جانتا ہے کہ انسان کل کیا کرے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ انسان صاحبِ اختیار نہیں، مجبور ہے۔

یہ دلیل ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ علمِ الٰہی کے مسئلہ کا تعلق، زمان (TIME) کے مسئلہ سے ہے اور فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے مسئلۂ زمان، از حد پیچیدہ اور مشکل ہے (جیسا کہ پیش لفظ میں کہا جا چکا ہے) میری کوشش یہ ہے کہ اس کتاب میں منطقیانہ موشگافیوں اور فلسفیانہ نکات آفرینیوں سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے اور ہر بات کو نہایت آسان اور سہل انداز میں پیش کیا جائے۔ بنا بریں، ہم مسئلۂ زمان کی پیچیدگیوں میں الجھے بغیر اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ انسانی علم اور علمِ خداوندی میں بنیادی فرق ہے۔ قرآنِ کریم نے، اختلافِ لیل و نہار (رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آنے)

کو عظیم نشانیاں (آیات) قرار دیا ہے اور گردشِ شمس و قمر کو حساب و شمار کا ذریعہ بنایا ہے۔ یہی وہ "حساب و شمار" ہے، جس سے ہم وقت (TIME) کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ورنہ، درحقیقت، ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی وجود نہیں۔ نیند میں جب ہم اس گردشِ لیل و نہار سے بے خبر ہو جاتے ہیں، تو وقت کا احساس ہی باقی نہیں رہتا۔ برگسان کے الفاظ میں، ماضی، حال اور مستقبل، وہ گرھوں کے نشان ہیں جنھیں ہم نے محض بغرضِ سہولت، وقت کے گز پر لگا رکھا ہے۔ خدا ان تعینّات سے بلند ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک وقت کی یہ تقسیم اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اس کے سامنے (اقبال کے الفاظ میں) وقت ایک "ابدی حال" (ETERNAL NOW) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم اس حقیقت کو مثال کے ذریعے بھی سمجھا نہیں سکتے کیونکہ ہم، اپنے ہوش و خرد میں ہوتے ہوئے، وقت کے احساس سے بلند نہیں ہو سکتے۔ البتہ، مکان، (SPACE) کے ضمن میں، ایک مثال سے بات (تھوڑی بہت) واضح کی جا سکتی ہے۔ ہم گھر کے صحن میں بیٹھے ہوں تو دیوار کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہو، وہ ہمارے لئے غیب ہوگا ــــ یعنی ہماری نگاہوں سے اوجھل ــــ لیکن جو شخص چھت پر بیٹھا ہو اس کے لئے پسِ دیوار واقعات، غیب نہیں بلکہ "شہادت" ہوں گے۔ یعنی آنکھوں کے سامنے واقع ہونے والی بات ــــ خدا نے جب کہا ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی بلندیوں سے سب کچھ دیکھ رہا ہے جہاں کوئی شے اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔ جسے تم غیب کہتے ہو، اس کے نزدیک وہ بھی "شہادۃ" ہوتا ہے۔

جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، جب تک ہمارے ہوش و حواس قائم رہتے ہیں، جب تک ہم عقل و شعور سے کام لیتے ہیں، ہم ماضی، حال اور مستقبل کے امتیاز سے بالا نہیں ہو سکتے۔ ہم اس امتیاز سے بلند اس وقت ہوتے ہیں جب ہمارے ہوش و حواس معطل اور عقل و شعور مفقود ہوں۔ اگر کوئی شخص تین دن تک مسلسل سویا رہے، تو جاگنے کے بعد وہ کبھی نہیں بتا سکے گا کہ اس دن کون سی تاریخ ہے ــــ اور چھ مہینے یا سال بھر تک بے ہوش رہنے والا، مہینے اور سال تک کا تعین نہیں کر سکے گا۔ غالبؔ نے اس حقیقت کو بڑے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ ؎

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

مختصراً، ہم عقل و شعور سے بیگانہ ہونے کے بعد، ماضی، حال اور مستقبل کے تعینات سے بالا ہوتے ہیں ـــــ اسے "بالا" نہیں بلکہ بے خبر کہنا زیادہ صحیح ہوگا ـــــ لیکن خدا، اپنے کامل علم کے ساتھ، ان تعینات سے بلند ہوتا ہے۔ اس کے سامنے ازل سے ابد تک کا زمانہ (PRESENT) کی حیثیت رکھتا ہے۔

آسان ترین الفاظ میں بات سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ انسان، ہر آن اپنا ارادہ اور فیصلہ بدلنے کا اختیار رکھتا ہے لیکن خدا کو اس کا علم ہوتا ہے کہ وہ اپنا فیصلہ کیا بدلے گا۔ اس لئے انسان تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا لیکن خدا اسے جانتا ہے۔

پیش گوئیاں محض ظن و قیاس ہیں

لہذا، جو لوگ انسانوں کے مستقبل کے متعلق خبریں بتاتے (پیشگوئیاں کرتے) ہیں وہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔ جب انسان خود اپنے متعلق حتم و یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا، تو کوئی دوسرا انسان اس کے متعلق ایسا کس طرح کہہ سکتا ہے۔ انسانوں کے متعلق اس قسم کی خبریں دینے والوں سے کہئے کہ (انسان تو بہت بڑی چیز ہے) وہ ذرا یہ بتائیں کہ یہ مکھی جو اس وقت یہاں بیٹھی ہے، اس کے بعد اڑ کر کہاں بیٹھے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری پیش گوئیاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ جب کوئی شخص مکھی کے متعلق اس قسم کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تو صاحبِ ارادہ انسان کے متعلق (خدا کے سوا) کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل کیا کرے گا۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو، تابعِ ستارہ نہیں

کاہن اور منجم

قرآن کہتا ہے کہ انسان کے دورِ طفولیت میں، کاہن، منجم، رمّال یہ دعوے کر کے کہ وہ آسمانوں کی خبریں لاتے ہیں، سادہ لوح انسانوں کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کر لیا کرتے تھے۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد کے دَور میں، جب انسانیت اپنے عہدِ شباب کو پہنچ رہی ہے، اس قسم کے دعوے کرنے والوں کو، علم کی بارگاہ سے "آتشیں کوڑے" (شِہَابًا رَّصَدًا۔ ۸-۹/۷۲) پڑیں گے۔

یہ دین (اسلام) کے دَور کی باتیں تھیں۔ اس کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل

دین مذہب میں بدل گیا

ہو گیا تو خود ہمارے ہاں بھی، کاہنوں (پیشگوئیاں کرنیوالوں) منجموں، رمالوں، فال نکالنے والوں، کے عفریتی لشکر در آئے اور وہ صاحبِ عزم و اختیار انسان، جس نے اپنی **تقدیر** خود اپنے ہاتھ سے لکھنی تھی، اپنے ہاتھ دوسروں کو دکھا دکھا کر، اپنی قسمت معلوم کرنے کے چکر میں پھنس گیا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو، ناخوب، بتدریج وہی، خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

چوتھا باب

قانونِ مکافاتِ عمل

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ طبیعی کائنات میں قانونِ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) بطور اصولِ اساسی کارفرما ہے۔ اس کے ساتھ، دوسرا اساسی اصول، قانونِ وحدتِ کائنات (UNIFORMITY OF NATURE) ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قانونِ علت و معلول ساری کائنات میں یکساں طور پر کارفرما رہتا ہے۔ ایک سبب (CAUSE) جن حالات میں، کسی ایک مقام پر کسی ایک وقت، ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے، کائنات میں، جب اور جہاں وہ حالات موجود ہوں گے، وہ سبب ویسا ہی نتیجہ پیدا کرے گا۔ انسانی دنیا میں اس قانون کو، عالمگیر قانونِ مکافاتِ عمل کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انسانی زندگی کی دو سطحیں

انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک تو دیگر اشیائے کائنات کی طرح طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE)۔ اس میں انسان پر بھی وہی قوانین حاوی ہوتے ہیں جو دیگر حیوانات کو محیط ہوتے ہیں۔ انسانی بچے کی پیدائش، دیگر حیوانات کے بچوں کی طرح ہوتی ہے۔ جن عناصر و عوامل پر عام حیوانات کی زندگی اور نشو و نما کا دار و مدار ہے، انسان کی زندگی اور نشو و نما بھی انہی کی رہینِ منت ہے ــــ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، صحت، بیماری، سلسلۂ تولید و تناسل، موت وغیرہ سب طبیعی قوانین کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ، حیوانات کی صورت میں جن بنیادی خصوصیات کو جبلت (INSTINCTS) کہا جاتا ہے، انہی بنیادی خصوصیات کا حامل انسان بھی ہوتا ہے ــــ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF PRESERVATION) جذبۂ

تغلّب (SELF - AGGRESSION) اور جذبۂ افزائشِ نسل (SELF - REPRODUCTION) یہ جذبات بنیادی جبلّتیں قرار دیئے جاتے ہیں اور عام حیوانات اور انسانوں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔

لیکن انسانی زندگی کی ایک سطح اور بھی ہے، جو حیوانی یا طبیعی زندگی سے بلند و بالا ہے۔ اس زندگی کا حامل انسانی جسم نہیں ہوتا بلکہ ایک اور شے ہے جسے انسانی ذات یا نفس HUMAN PERSONALITY کہا جاتا ہے۔

انسانی ذات

انسانی ذات، قوانینِ طبیعی کے تابع نہیں ہوتی لیکن قوانین کے احاطہ سے یہ بھی باہر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ایک اور ضابطۂ قانون ہوتا ہے جنہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ دیانت، امانت، صداقت، جائز و ناجائز کی تمیز، حق و باطل کا امتیاز وغیرہ کا تعلق انہی اقــدار سے ہے۔ انسانی اعمال میں ان اقدار کے انعکاس (REFLECTION) کا نام کیرکٹر ہوتا ہے۔ حیوانات میں صرف (BEHAVIOUR) ہوتا ہے، کیرکٹر انسانی زندگی کا خاصہ ہے۔

طبیعی قوانین کا علم فطرت کے مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ وغیرہ سے حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن مستقل اقدار خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور اب قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جس طرح انسان کے طبیعی افعال کا نتیجہ طبیعی قوانین کے مطابق مرتب ہوتا ہے، اسی طرح اس کے انسانی اعمال کا نتیجہ مستقل اقدار سے متعلق قوانین کے مطابق منودار ہوتا ہے۔ اسے عالمگیر قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ انسان کی جس منفرد خصوصیّت کو اس کا اختیار و ارادہ کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت انسانی ذات کی خصوصیّت ہے۔ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اس میں ضعف اور اضمحلال واقع ہوجاتا ہے۔ نشو و نما یافتہ ذات کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ایسے انسان کا ارادہ مستحکم ہوتا ہے۔ یہی نشو و نما یافتہ ذات، طبیعی جسم کی موت کے بعد، آگے چلتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کہا جاتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ جس طرح انسان کے طبیعی افعال کا اثر اس کے طبیعی جسم پر پڑتا ہے اسی طرح اس کے ان اعمال کا اثر جن کا تعلق مستقل اقدار سے ہے، اس کی ذات پر پڑتا ہے ــــ اور یہ سب اثرات، قوانینِ خداوندی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے میری کتاب ـ جہانِ فردا ـــ ملاحظہ کیجئے۔

تین قسم کے قوانین

انسانی زندگی میں تین قسم کے قوانین کارفرما ہوتے ہیں ۔

(۱) طبیعی قوانین جن کا تعلق انسان کے طبیعی جسم سے ہوتا ہے۔

(۲) تمدنی قوانین، جنہیں حکومت کے قوانین یا معاشرہ (سوسائٹی) کے آداب و دساتیر کہا جاتا ہے ـــــ اور

(۳) مستقل اقدار (یا اخلاقی قوانین) جن کا تعلق انسانی ذات سے ہوتا ہے۔ ان ہر سہ دوائر حیات میں انسان اپنے افعال و اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کی یہی ذمہ داری ہے جس کی بنا پر وہ ان کے نتائج و عواقب کا سزاوار قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے دو دوائر میں ایسا ہو سکتا ہے (اور ایسا ہوتا ہے) کہ ایک فرد کو ایسے امور کے نتائج بھی بھگتنے پڑتے ہیں جن کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا۔ مثلاً راہ چلتے چلتے، کوئی شخص اسے دریا میں دھکا دے دیتا ہے اور وہ ڈوب کر مر جاتا ہے۔ یا اچانک وہ پُل ٹوٹ جاتا ہے جس پر سے وہ گزر رہا تھا۔ یا مثلاً نظم و نسق کی خرابیوں کی وجہ سے ملک میں قحط پڑ جاتا ہے۔ سیلاب آجاتا ہے۔ یا کسی وجہ سے جنگ چھڑ جاتی ہے۔ ان امور کا ذمہ دار کوئی فردِ واحد نہیں ہوتا لیکن افرادِ معاشرہ کو ان کے عواقب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

لیکن تیسرا دائرہ (جس تعلق انسانی ذات سے ہے) ایسا ہے جس میں ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار آپ ہوتا ہے اور ان کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ اس خمیازہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہر عمل (حتیٰ کہ اس کے خیالات تک) کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا چلا جاتا ہے ـــــ اسی کو اس کا اعمالنامہ کہتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد، یہ دیکھئے کہ انسان کے اجتماعی اعمال ہوں یا انفرادی، قرآنِ کریم ان سب کا ذمہ دار انسان کو قرار دیتا ہے۔ ان میں کوئی دائرہ بھی ایسا نہیں جس میں وہ یہ کہتا ہو کہ انسان مجبور واقع ہوا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی اس تقدیر یا قسمت کے مطابق ہوتا ہے جو پہلے سے طے شدہ، مقدر یا لکھی ہوئی ہے ـــــ انسان (انفرادی یا اجتماعی طور پر) اپنے اختیار و ارادہ سے ایک فیصلہ کرتا ہے اور اس فیصلہ کے مطابق عمل۔ اور اس کے عمل کا نتیجہ خدا کے مقرر کردہ قوانین

کے مطابق مرتب ہوجاتا ہے۔ طے شدہ، یا مقدّر، یا پہلے سے لکھا ہوا، قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اُسے (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) "تقدیرِ خداوندی" کہا جائے گا، نہ کہ انسان کی تقدیر۔ باقی رہی اس کی "قسمت"، سو اس کی قسمت یا نصیب اس کے اعمال کے وہ نتائج ہوتے ہیں جو تقدیرِ الٰہی (قوانینِ خداوندی) کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

ان امور کی تفصیل آئندہ سطور میں آپ کے سامنے آئے گی۔

---

(۱) نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا (۲/۲۰۲)

تمہارا نصیب تمہارے اپنے اعمال سے مرتب ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم نے بنیادی اصول یہ بتایا ہے کہ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ .... (۲/۸۱). جس کسی نے بھی غلط کام کئے اور اس کی خطاؤں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا، تو یہ لوگ اہلِ جہنم ہیں۔ ان کی امیدوں کی کھیتیاں جل کر راکھ ہوجائیں گی۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ .... (۲/۸۲)۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے صلاحیت بخش کام کئے تو وہ اہلِ جنت ہیں۔

دوسری جگہ ہے .... ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ..... (۲/۲۸۱)۔ جو کچھ کوئی کرتا ہے اسے اس کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے (نیز ۳/۲۴ ؛ ۳/۱۶۰ ؛ ۴۰/۱۷)۔ لیکن اس میں انسان کا ارادہ ضروری ہے۔ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ (۲/۲۲۵)۔ مؤاخذہ اس پر ہوگا جو اپنے دل کے ارادے سے وہ کام کرے۔ جو کام کسی سے جبراً کرایا جائے اس کا وہ ذمہ دار قرار نہیں پاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک آیت ہی اس امر کے ثبوت کے لئے کافی ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، انسان صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے، مجبور نہیں۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى .... (۶/۱۶۵)۔ جو شخص کوئی کام کرتا ہے اس کا خمیازہ وہی بھگتتا ہے۔ یاد رکھو۔ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ ہر ایک اپنا اپنا

بوجھ اٹھاتا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داری کی بابت مسئول ہوتا ہے۔ اسی کا اعادہ دیگر مقامات میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۷/۱۵؛ ۱۸/۳۵؛ ۳۹/۷؛ ۳۸/۵۳)۔

سورۃ النجم میں ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ (۳۹/۵۳)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ سعی و عمل کرے۔ وہ اپنی محنت کے ثمرات کا مستحق ہے۔ لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (۱۵/۲۰)۔ صحیح معاشرہ کا قیام اس لئے ضروری ہے تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ مل سکے۔ فَلَا کُفْرَانَ لِسَعْیِہٖ ج...... (۲۱/۹۴)۔ کسی کی محنت بلا نتیجہ نہ رہ جائے۔ وَ کَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا (۷۶/۲۲)۔ تمہاری محنت بھرپور نتائج برآمد کر سکے۔ (۱۸-۱۷/۲۱)۔

افراد کی طرح، اقوام کی زندگی کے لئے بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ لَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ج وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۲/۱۳۴)۔ تمہارے اسلاف (اقوامِ گذشتہ) نے جو کچھ کیا اس کا خمیازہ انھوں نے بھگتا۔ جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے سامنے آئیں گے۔ تم سے اتنا بھی نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔ (نیز ۲/۱۴۱)۔ اس لئے کہ قانونِ مکافاتِ عمل یہ ہے کہ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ ہر شخص صرف ان اعمال کے نتائج کا ذمہ دار ہے جنھیں وہ خود کرتا ہے ــــ اچھے کاموں کے اچھے نتائج۔ بُرے کاموں کے بُرے۔ وَیْلٌ لَّھُمْ مِّمَّا یَکْسِبُوْنَ ۝ (۲/۷۹)۔ لوگوں پر تباہیاں ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَھِیْنَۃٌ (۷۴/۳۸)۔ ہر شخص اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہے۔ اس نے اپنے اعمال کے بدلے میں اپنے آپ کو رہن کر دیا ہوا ہے۔

---

(۲) جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝ (۹/۸۲)

جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے

قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا کوئی عمل (صحیح یا غلط) اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طبیعی دنیا، اور خود انسان کی طبیعی زندگی میں چونکہ یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے، اس لئے اس میں نہ کوئی مغالطہ ہوتا ہے، نہ شک و شبہ ــــ جو آگ میں اُنگلی ڈالتا ہے اس کی انگلی جل جاتی ہے۔

جو پانی پیتا ہے اس کی پیاس بجھ جاتی ہے لیکن مستقل اقدار کے سلسلہ میں چونکہ انسانی اعمال کے نتائج محسوس طور پر سامنے نہیں آتے اس لئے یہ سمجھنے میں دشواری ہو جاتی ہے کہ ان کے نتائج فی الواقعہ مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں ـــــ روٹی کھانے سے بھوک مٹ جاتی ہے، اسے تو ہر شخص جانتا ہے، لیکن یہ کہ رزقِ حرام (چوری اور بے ایمانی سے حاصل کردہ روٹی) سے انسانی ذات کی تباہی ہو جاتی ہے، اسے جاننا مشکل ہے۔ مادی نظریۂ حیات چونکہ انسانی ذات کا قائل ہی نہیں، اس لئے وہ اقدار کے نتائج کو بھی نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک قوانین صرف وہی ہیں جنھیں سوسائٹی تسلیم اور نافذ کرتی ہے اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سوسائٹی کے نظامِ عدل کی رُو سے سامنے آسکتے ہیں۔ جو کام سوسائٹی کی نگاہوں سے اوجھل رہیں، یا جو امور سوسائٹی کے قوانین کی رُو سے جرم ہی نہ ہوں، ان کے نتائج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ جو اس وقت ساری دنیا میں جرائم عام ہو رہے ہیں اور دھوکا دہی، فریب کاری، بددیانتی، سلب و نہب، غصب و استحصال کی وبائیں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہیں، تو اس

دنیا میں جرائم کی کثرت کا بنیادی سبب

کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں انسانی ذات کا یقین باقی نہیں رہا۔ ان کے نزدیک زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے لیکن قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا محور انسانی ذات پر ایمان ہے اس لئے اس نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ انسان کا کوئی عمل ـــ خواہ اس کا تعلق اس کی طبیعی زندگی سے ہو اور خواہ اس کی ذات سے ـــــ بے نتیجہ نہیں رہتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کارگہِ کائنات اسی مقصد کے لئے سرگرمِ عمل ہے کہ انسان کا کوئی کام نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہے۔ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ (۴۵/۲۲)۔ اللہ نے کائنات (ارض و سماوات) کو بالحق پیدا کیا ہے اور اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے کاموں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ مل جائے اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے سرگرمِ عمل ہے تاکہ غلط روش اختیار کرنے والوں کے کاموں کا نقصان رساں نتیجہ ان کے سامنے آجائے اور اچھے کام کرنے والوں کا خوشگوار نتیجہ ـــ سورۂ یونس

میں ہے کہ خدا کا تخلیقی پروگرام — یعنی اشیائے کائنات کو پہلی بار وجود میں لانا (مبداء) اور پھر انھیں گردشیں دے دے کر نئی نئی ہیئت میں تبدیل کرنا، معاد اس لئے ہے کہ جو لوگ مستقل اقدارِ حیات کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں، انہیں ان کاموں کا بدلہ عدل و انصاف کے مطابق مل جائے اور جو لوگ ان سے انکار کریں اور سرکشی برتیں ان کا انجام تباہی ہو (۱۰/۴)۔ اسی کا اعادہ (۱۱/۷)؛ (۱۸/۷)؛ (۲/۶۷) میں کیا گیا ہے۔

سورۂ نساء میں ہے کہ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (۴/۱۲۳)۔ جو شخص بھی کوئی غلط کام کرے گا، اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۹/۸۲؛ ۹/۹۵؛ ۱۴/۵۱؛ ۱۶/۹۶-۹۷؛ ۱۷/۴۰) جو کچھ بھی انسان کے سامنے آتا ہے وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

کہیں کہا گیا ہے کہ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۳۴/۳۳)۔ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا۔ اس کا اعادہ مختلف مقامات میں کیا گیا ہے۔ مثلاً (۷/۱۴۷؛ ۵۲/۱۶؛ ۵۶/۲۴؛ ۸۳/۳۶)
کسی جگہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں سامنے لایا گیا ہے کہ اَنِّیْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ ...... (۳/۱۹۷)۔ خدا کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔ کہیں کہا ہے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۱۲/۹۰؛ ۳/۱۴۴)۔ جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں خدا ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

میزانِ عمل

اسی بنیادی اصول کو سمجھانے کے لئے کہا کہ انسان کے ہر عمل کا وزن ہوتا ہے اور وزن کرنے کے لئے میزانیں (دھرم کانٹے) کھڑی کی جاتی ہیں۔ جن میں اعمالِ انسانی کا ذرہ ذرہ تلتا ہے۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ...... (۲۱/۴۷)۔ اور ہم ظہورِ نتائج کے وقت، عدل کی میزانیں کھڑی کریں گے اور اس طرح کسی شخص پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہوگا۔ جن لوگوں کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکتا ہوگا ان کی زندگی خوشگوار طور میں گزرے گی۔ جن کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ (۲۳/۱۰۲-۱۰۳)۔ ہر انسانی عمل کا ذرہ ذرہ ترازو میں تُل جائے گا۔ (۳۱/۱۶)؛ (۳۴/۳)؛ (۹۹/۷-۸)؛ (۱۰۱/۶-۵)۔

اعمال تولے جائیں گے اور وزن کی پرچی ہر ایک کے ہاتھ میں دے دی جائے گی کہ وہ دیکھ لے کہ

اس کا حساب کیا ہوا ہے۔ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○ (۹/۹۴؛ ۹/۱۰۵؛ ۱۰/۲۳؛ ۱۰/۱۰۱)۔ اس حساب کی رُو سے، جس نے اپنی ذات کی مناسب نشوو نما کر لی ہوگی اس کی کھیتی پروان چڑھ جائے گی۔ جس نے اسے پست جذبات سے دبا کر، پژمردہ کر دیا ہوگا، وہ تباہ ہو جائے گا۔ (۹۱/۱۰-۹)۔

ان قرآنی نصوص کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے یا وہ ایک ایسی مخلوق نظر آتا ہے جسے اپنے کسی کام پر کوئی اختیار نہیں اور جو کچھ اس کے لئے طے کر دیا گیا ہے وہ طوعاً کرہاً اسے (ایک مشین) کی طرح سرانجام دیئے جاتا ہے؟

مجبور کے کام کی جزا اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

(۳) اِقْرَأْ كِتَابَكَ (۱۷/۱۴)

تو اپنا اعمال نامہ پڑھ

اوپر جس حقیقت کو ترازو کی مثال سے سمجھایا گیا ہے، قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں اسے اعمال نامہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ کہا کہ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ (۱۹/۷۹؛ ۲۱/۹۴)۔ انسان جو کچھ کہتا ہے ہم اسے لکھ لیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم نے انسان کے آگے پیچھے محافظ اور نگران مقرر کر رکھے ہیں جو اس کے تمام اعمال کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ (۱۳/۱۱؛ ۵۰/۱۸)۔ دوسرے مقام پر انہیں کراماً کاتبین کہا گیا ہے۔ (۸۲/۱۱)۔ "نہایت معزز لکھنے والے" یہ ریکارڈ کہیں چھپا کر نہیں رکھا گیا۔ یہ ایک کتابِ مبین (۱۰/۶۱) کھلی ہوئی اور واضح کتاب ہے

یہ کتابِ مبین کہیں باہر نہیں رکھی۔ خود انسان کے سینے میں ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔" اس وقت وہ لپٹا ہوا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جائے گا اور انسان سے کہا جائے گا کہ اِقْرَأْ كِتَابَكَ۔ تو اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھ۔ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۷/۱۴-۱۳)۔ خود پڑھ لے اور اپنا حساب بھی آپ ہی کر لے۔ تو اپنا حساب کرنے کے لئے آپ کافی ہے۔ اس فہرستِ جرائم کے ثبوت میں کسی خارجی گواہ کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ انسان اپنے خلاف خود آپ گواہی دے گا اور اپنے غلط اعمال

کے جواز میں خودفریبی کے جھوٹے بہانے، جنھیں وہ اس سے پہلے تراشا کرتا تھا، ان کی خودہی تردید کردے گا۔ (۱۴/۷۵)۔

یہ ہے وہ ریکارڈ جس کے متعلق کہا کہ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ (۲۳/۶۲)۔ "ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچی سچی بات کہہ دیتی ہے۔ کہیں غلطی نہیں کرتی۔" اور یہی وہ کتاب ہے جسے دیکھ کر مجرم چیخ اٹھے گا (۱۸/۴۹)۔ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝ (۷۸/۴۰)۔ اور بصد حسرت و یاس کہے گا کہ اے کاش! میں ذی شعور، صاحبِ اختیار و ارادہ انسان ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا تو اس مؤاخذہ سے بچ جاتا! ــــ مؤاخذہ تو صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کا ہوتا ہے، پیکرِ آب و گل کا نہیں ہوتا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان کا ہر عمل ــــ حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک (۴۰/۱۹) ــــ کے اثرات محفوظ رہتے ہیں اور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے، اپنے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا اعمال نامہ اس کے اپنے ہاتھ کی دستاویز ہوتی ہے جسے وہ اپنی ذات کی لوحِ مبین پر نقش کرتا رہتا ہے۔ وہ دنیا میں ایک صاف سلیٹ، لوحِ سادہ، لے کر آتا ہے اور پھر اس پر "اپنی تقدیر" آپ لکھتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں؛

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں

---

(۴) اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (۱۷/۷)

اعمال کے نتائج غیر منتقل ہوتے ہیں

جب عمل کا مدار ہر شخص کے اپنے اختیار و ارادے پر ہو، تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں بھی کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی آپ اس نتیجہ (جزا و سزا) کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، آپ اپنی کمائی (روپیہ پیسہ) تو دوسروں کو دے سکتے ہیں اور عند الضرورت دوسرے

لے بھی سکتے ہیں، لیکن اگر آپ ہر روز، صبح، سیر کو جائیں اور اس سے آپ کی صحت اچھی ہو جائے تو آپ اپنی اچھی صحت کو کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے، نہ ہی آپ کسی دوسرے کی صحت مستعار لے سکتے ہیں۔ اسی طرح، آگ میں انگلی ڈالنے سے جلن کی جو تکلیف آپ کو ہوگی، اسے آپ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں کر سکتے۔ نہ کسی کی سفارش آپ کو اس سے نجات دلا سکتی ہے۔ نہ ہی آپ کسی کو کچھ دے دلا کر اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں ـــ یہ ہیں اعمال کے وہ نتائج جو نہ کسی کی طرف منتقل کئے جا سکتے ہیں، نہ کسی سے مستعار لئے جا سکتے۔ "صحت" کی مثال تو ہم نے محض سمجھانے کی خاطر دی ہے۔ دراصل کہنے کی بات یہ ہے کہ اعمالِ انسانی کے جو اثرات فردِ متعلقہ کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ ناقابلِ انتقال ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) عمل کا مدار انسان کے ارادہ پر ہوتا ہے اور جب ایک فرد کے ارادے میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا، تو اس کے نتیجہ میں کوئی اور کیسے شریک ہو سکے گا؟ اسے انسانی ذات کی انفرادیت۔ (INDIVIDUALITY) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، مجبور کا اپنا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے کسی عمل کا نتیجہ اس کی ذات پر کیسے مرتب ہو سکتا ہے؟ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مجبور، خود اپنے عمل کے نتیجہ کا بھی مستحق یا سزاوار نہیں ہوتا، چہ جائیکہ کوئی دوسرا اس میں شریک ہو۔

انسانی ذات کی انفرادیت

صاحبِ اختیار و ارادہ انسانی ذات کی اس انفرادیت کے متعلق قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر تصریح کی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۱۷/۷)۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ بھی تمہاری اپنی ذات کو ہوگا اور اگر غلط کام کرو گے تو ان کا نقصان بھی تمہیں ہی اٹھانا ہوگا۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۤءَ فَعَلَيْهَا (۴۱/۴۶)۔ جو صلاحیت بخش کام کرتا ہے اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے۔ جو تخریبی کام کرتا ہے اس کا وبال بھی اس کے اپنے اوپر پڑتا ہے۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (۴۱/۴۶)۔ خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ (نیز ۴۵/۱۵) وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (۲۹/۶)۔ جو بھی جدوجہد کرتا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کرتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (۱۰/۲۳)۔ اسے لوغ

انسان! تم اگر قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتو گے تو اس کا نقصان تمہاری اپنی ذات کو ہوگا۔ (نیز ۱۱/۴)۔
سورۃ انعام میں ہے۔ قَدْ جَآءَ كُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ (۶/۱۰۵)۔ تمہاری طرف، تمہارے رب کی جانب سے واضح اور روشن راستے آ گئے ہیں۔ سو جو شخص آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ اور جو اندھوں کی طرح آنکھیں بند کر کے چلے گا، تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام پر ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے کہ "اے نوعِ انسان! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آگیا ہے۔ پس جو کوئی اس کے پیش کردہ صحیح راستے پر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جو اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے (غلط) راستے اختیار کر لے گا' اس کا نقصان وہ خود اٹھائے گا۔ (۱۰/۱۰۸)۔ (نیز ۱۷/۱۵؛ ۳۰/۴۴؛ ۳۱/۱۲)۔

اسی سکّہ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کے عمل کے جو نتائج اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں، وہ کسی دوسرے کے مٹائے مٹ نہیں سکتے۔ بالفاظِ دیگر، جزا اور سزا کے معاملہ میں کوئی دوسرا مداخلت کر ہی نہیں سکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کی ہے۔ مثلاً (۲/۴۸) میں کہا گیا ہے کہ "اعمال کے نتائج کے سلسلہ میں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کسی کام نہیں آسکتا۔ نہ ہی اس معاملہ میں شفاعت (سفارش) کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کچھ دے دلا کر

یہ کاروباری معاملہ نہیں

اس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نہ ہی کوئی کسی کی مدد کر سکتا ہے۔" (نیز ۲/۱۲۳)۔ دوسری جگہ ہے کہ نتائجِ اعمال کا معاملہ، کاروباری نہیں ہے کہ انہیں قیمتاً خرید لیا جائے۔ نہ ہی اس باب میں کسی کی دوستی کام آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی کسی کی شفاعت کر سکتا ہے۔ (۲/۲۵۴)۔ اور اس باب میں کسی کی استثناء نہیں۔ حتیٰ کہ، اور تو اور، خود حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ (۱۰/۱۵؛ ۹/۱۳)۔ اگر میں بھی ان قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے نتیجہ سے مجھے بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے خائف ہوں۔

انسانی ذات کی یہی انفرادیت تھی ــــ یعنی ہر ایک کا اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہونا ــــ جس کے پیشِ نظر نبی اکرمؐ نے اپنے مخالفین سے برملا کہہ دیا کہ اس بارے میں جھگڑا کرنے کی کیا

ضرورت ہے۔ وَلَنَآ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ (۲/۱۳۹)۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ لَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّآ اَجۡرَمۡنَا وَلَا نُسۡـَٔلُ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۳۴/۲۵)۔ نہ تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے کون کون سے جرائم کئے۔ نہ ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا۔ لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ۝ (۱۰۹/۶)۔ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے لئے ہمارے اعمال کے ہمارے لئے۔ لِّىۡ عَمَلِىۡ وَلَـكُمۡ عَمَلُكُمۡ‌ ۚ اَنۡتُمۡ بَرِيۡٓـُٔوۡنَ مِمَّاۤ اَعۡمَلُ وَاَنَا بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (۱۰/۴۱)۔ میرے اعمال میرے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم میرے اعمال کے ذمّہ دار نہیں۔ میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔

اعمال کے نتائج کا ذمّہ دار تو اس کو قرار دیا جا سکتا ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے ان اعمال کا مرتکب ہوا ہو۔ جس سے مجبوراً کوئی کام کرایا جائے وہ اس کا ذمّہ دار کس طرح ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں خدا بھی دخل نہیں دیتا۔ البتہ وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کون کس قسم کا کام کرتا رہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ۝ (۲/۲۳۷)۔ "خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔" وہ ان سے باخبر ہے۔ (۲/۲۳۴)۔ کسی کا کوئی کام بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔ (۲/۱۴۴)۔ حتیٰ کہ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا فِىۡٓ اَنۡفُسِكُمۡ (۲/۲۳۵) جو کچھ تمہارے دل میں ہوتا ہے، اللہ کو اس کا بھی علم ہوتا ہے۔

"خدا تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے" سے مراد یہ ہے کہ انسان کا کوئی عمل خدا کے قانونِ مکافات کی زد سے باہر نہیں رہ سکتا۔ انسان کا ہر عمل اس کے دائرے کے اندر ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ مُحِيۡطٌ (۳/۱۱۹)۔ اسی لئے انسان کا کوئی کام بھی نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ہر ایک کو اپنے اعمال کا نتیجہ خود بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ وہ اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے۔

پانچواں باب

مصائب و آلام

اس قسم کے واقعات آپ کے سامنے آئے دن آتے رہتے ہیں۔ مثلاً،

(۱) اگر کوئی مریض شفایاب ہو جائے تو اس کے لواحقین بڑے فخر اور مسرت سے کہیں گے کہ ہم نے اس کے علاج کے لئے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ فلاں حکیم کا علاج کیا۔ فلاں ڈاکٹر سے مشورہ لیا۔ آخر الامر اسے فلاں دوائی سے آرام آیا۔

لیکن اگر وہ مریض مر جائے تو کہا جائے گا کہ ہم نے اپنی طرف سے تو بہت کوشش کی۔ اس کے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔ کیا کیا جائے۔ وہاں دم مارنے کی جا نہیں۔

(۲) اگر لڑکا امتحان میں کامیاب ہو جائے تو یہ اس کی محنت کا ثمر ہوگا لیکن اگر وہ فیل ہو جائے تو کہا جائے گا کہ اس نے تو اپنی طرف سے بڑی محنت کی تھی لیکن خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔

(۳) اگر مقدمہ میں کامیابی ہو جائے تو اسے اپنے حسنِ تدبر اور وکیل کی محنت اور مہارت کا تصدق ٹھیرایا جائے گا، لیکن اگر اس میں ناکامی ہو جائے تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیا جائے گا کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔

(۴) حتیٰ کہ اگر کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہو تو اس پر جشنِ مسرت منایا جائے گا اور اگر علی التواتر دو تین لڑکیاں گھر میں آ جائیں تو بچی کی ماں کو یہ کہہ کر دلاسا

کامیابی اپنی کاریگری سے، ناکامی خدا کی مرضی سے

دلایا جائے گا کہ اچھا بہن! صبر کرو۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی۔ اس پر کسی کا زور تھوڑا چل سکتا ہے؟

یعنی انسان اپنے آپ کو شکست اور ناکامی کی صورت میں مجبور تصور کرتا، اور ایسے واقعات کو خدا کی مرضی پر محمول کرتا ہے، لیکن کامیابیوں اور کامرانیوں میں وہ اپنے آپ کو مجبور نہیں محسوس کرتا۔ انھیں اپنی ہنرمندی اور کاریگری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان نے اپنے عہدِ طفولیت میں، اپنے آپ کو، اپنے نامساعد ماحول کے مقابلہ میں بے بس پایا تھا تو اسے کسی فوق الفطرت قوت کا خیال آیا تھا۔ لہٰذا، شکست اور ناکامی میں اپنے آپ کو مجبور تصور کرنا اور مصائب و آلام کو خدا کی طرف منسوب کرنا، ذہنِ انسانی کے انہی ابتدائی نقوش کے اثرات ہیں، جنھیں "مذہب" نے زندہ رکھ چھوڑا ہے۔ اور اس کی تائید اس قسم کی "مقدس سندوں" سے کرتا رہتا ہے کہ عَرَفْتُ اللّٰہَ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ[1] میں نے اللہ کو اپنی اسکیموں کے ناکام رہ جانے سے پہچانا ہے اور چونکہ درد و غم اور حزن و ملال، مشرقی شاعری کی جان ہیں، اس لئے شعراء اس قسم کے تصورات میں، یہ کہہ کر، اور بھی زہر بھر دیتے ہیں کہ ؎

جو نہیں آشنا مصیبت کا   درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا   جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا

وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے
اُسے معلوم کیا خدا کیا ہے

اور اس کے بعد تصوف نے اس میں ایسی رنگ آمیزی کی کہ یہ عقیدہ، ایک "مسلمہ حقیقت" بن گیا۔ آیئے ہم دیکھیں کہ خدا کا دین اس باب میں کیا کہتا ہے۔

مصیبت کے معنی

"مُصِیْبَۃٌ" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ (ص۔ و۔ ب) ہے۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کا اترنا اور اتر کر اپنے مستقر تک جا پہنچنا۔ اس اعتبار سے، ہر واقعہ یا حادثہ کو "مصیبت" کہا جائے گا لیکن قرآنِ کریم میں یہ لفظ (مُصِیْبَۃٌ) حَسَنَۃٌ کے مقابلہ میں آیا ہے۔ (۹/۵۰)۔ اس لئے، عام طور پر اس کے معنی ناخوشگوار واقعہ کے لئے

---

[1] اس قول کو حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ یہ، صوفیا میں سے کسی کا قول نظر آتا ہے۔

جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مصائب و آلام (ناخوشگوار واقعات) خدا کی طرف سے ظہور پذیر ہوتے ہیں یا یہ انسان کے اپنے (انفرادی یا اجتماعی) اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم اس سوال کا جواب بڑی وضاحت سے دیتا ہے۔

مصائب اپنے اعمال کا نتیجہ

سورۂ شوریٰ میں ہے۔ وَ مَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ (۴۲/۳۰)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ ان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اَنّٰی ھٰذَا ___ یہ کیسے آ گئی۔ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ کہا کہ قُلۡ ھُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ (۳/۱۶۴)۔ ان سے کہہ دو کہ یہ خود تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں۔ خود تم ہو۔ سورۂ نحل میں ہے۔ فَاَصَابَھُمۡ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا (۱۶/۳۶)۔ خود ان کے بُرے اعمال، مصیبتیں بن کر ان کے سامنے آ گئے۔

غلط کاموں کے نتائج برآمد ہونے کے لئے خدا کا مقرر کردہ طریق یہ ہے کہ پہلے یہ نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے رہتے ہیں اور ایک مدت کے بعد وہ محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں (اسے مُہلت

مُہلت کا وقفہ

کا وقفہ یا قانونِ تدریج و امہال کہا جاتا ہے)۔ سورۂ زمر میں ہے، یہ لوگ اس وقت اپنی من مانی زندگی بسر کر کے خوش ہو رہے اور قوانینِ خداوندی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد وَ بَدَا لَھُمۡ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوۡا وَ حَاقَ بِھِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَھۡزِءُوۡنَ ٥ (۳۹/۴۸)۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس کے نتائج اُبھر کر ان کے سامنے آجائیں گے۔ اور جس قانونِ مکافات کی یہ ہنسی اڑا رہے ہیں، وہ انھیں چاروں طرف سے گھیر لے گا۔

قرآنِ کریم نے عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کے لئے ایک بڑی معنی رس اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بعد میں سامنے آتا ہے۔ قرآن اُسے یوں سمجھاتا ہے گویا انسان اس نتیجہ کو، اپنی روانگی سے پہلے آگے بھیج دیتا ہے۔ وہ آگے جا کر اس کا انتظار کرتا ہے اور جب یہ، اس کے بعد، وہاں پہنچتا ہے، تو اسے اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے۔ اس کے لئے اس کی اصطلاح ہے بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡھِمۡ۔ جو کچھ ان کے

ہاتھ ان کے لئے پہلے سے آگے بھیج دیتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ جو جرائم یہ لوگ اس وقت کر رہے ہیں ہم انھیں ایک ایک کر کے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ جب یہ سفرِ زندگی میں آگے بڑھیں گے تو ان کے نتائج ان کے سامنے آجائیں گے۔

بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ

اس وقت ان سے کہا جائے گا۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ (۳/۱۸۱)۔ یہ نتائج (مصائب) کہیں خارج سے نہیں ٹپک پڑے۔ یہ وہی ہیں جنہیں تم نے پہلے سے بھیج رکھا تھا۔ یہ آگے آگے آئے ہیں۔ تم ان کے پیچھے پیچھے آئے ہو۔ دوسری جگہ انھیں مَا اَسْلَفَتْ کہہ کر پکارا گیا ہے (۱۰/۳۰)۔ یعنی جو اس راستے سے تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔

سورۂ حج میں ہے کہ ان لوگوں کی غلط روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی تباہ و برباد۔ اور جب ان کی یہ حالت ہوگی تو ان سے کہا جائے گا' ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ (۲۲/۱۰)۔ یہ وہی کچھ تو ہے جو تم نے اپنے لئے پہلے بھیجا تھا۔ سورۂ قصص میں بنی اسرائیل کے متعلق ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے جسے انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے پہلے سے بھیجا ہوتا ہے تو یہ چیخنے چلّانے لگ جاتے ہیں۔ (۲۸/۴۷)۔ نیز (۴/۶۲)۔

سورۂ روم میں ہے کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب انھیں کامیابیاں اور خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں تو ان پر اتراتے ہیں اور جب مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو سخت مایوس اور افسردہ ہو جاتے ہیں حالانکہ انھوں نے یہ مصیبتیں اپنے لئے خود اپنے ہاتھوں پہلے سے بھیج رکھی تھیں۔ (۳۰/۳۶)۔ [اس کا اعادہ (۴۲/۴۸) میں بھی کیا گیا ہے]۔ سورۂ الفجر میں ہے کہ جب انسان اس تباہی کو اپنے سامنے دیکھے گا جو مرگ آفریں ہوگی تو باصد حسرت و یاس پکارے گا کہ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (۸۹/۲۴)۔ اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیج رکھا ہوتا۔

مصائب و آلام ہی نہیں بلکہ زندگی کی جو خوشگواریاں انسان کو حاصل ہوتی ہیں، انھیں بھی اس نے اپنے لئے پہلے سے بھیج رکھا ہوتا ہے۔ سورۂ مزمّل میں ہے۔ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (۷۳/۲۰)۔ جو خوشگواریاں بھی تم

اپنے لئے پہلے سے بھیجو گے، انہیں تم اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔

مندرجہ بالا آیات میں بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ کہا گیا ہے۔ یعنی جو کچھ تمہارے ہاتھوں نے پہلے سے بھیجا ہو۔ بعض مقامات میں مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ کہا گیا ہے (۵/۸۰) یعنی جو کچھ ان کی ذات نے ان کے لئے آگے بھیج رکھا ہے۔ قرآنِ کریم، انسانی اعمال کا ذمہ دار اس کی ذات کو قرار دیتا ہے جو اس کے اختیار و ارادہ کا سرچشمہ ہے۔ اور اس لئے اس کے اعمال کے نتائج کی سزاوار بھی اس کی ذات ہی کو قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (۵۹/۱۸)۔ انسانی ذات کو چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا آگے بھیجا ہے؛ ظہورِ نتائج کے سلسلہ میں کہا کہ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ (۸۲/۵)۔ اس وقت ہر ذات کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے کیا کچھ آگے بھیجا ہے اور کیا کچھ پیچھے چھوڑ آئی ہے، اس لئے کہ یہ سب کچھ اس کے "نامۂ اعمال" میں درج تھا۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَهُمْ (۳۶/۱۲)۔ یہ لوگ، سفرِ زندگی میں، اپنے جو نقوشِ قدم پیچھے چھوڑتے ہیں اور جو کچھ آگے بھیجتے ہیں، ہم ان سب کو لکھتے جاتے ہیں۔ وَ كُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۳۶/۱۲)۔ اور ہر شے کا اندراج ایک واضح صحیفہ میں ہوتا رہتا ہے جو ان کے آگے آگے چلتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، انسان پر جو مصیبت بھی آتی ہے، وہ اس کے اپنے (انفرادی یا اجتماعی) اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں؛ بنی اسرائیل کی تباہی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ۝ (۲/۷۹)۔ ان کی تباہی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔ وہ ہلاک اس لئے ہوئے کہ وہ ظالم اور فاسق تھے۔ (۲/۵۹)۔ وہ ذلت و خواری کے عذاب میں ماخوذ ہوئے کیونکہ انھوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ (۲/۶۱ ؛ ۳/۱۱۱)۔

اور ایک بنی اسرائیل ہی کی کیا تخصیص ہے، یہ خدا کا عالمگیر قانون ہے کہ ذلت و خواری

ذلّت و خواری

انسان کے اپنے غلط اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے ہر وہ قوم جس کی کیفیت یہ ہو کہ، وہ ضابطۂ قوانین کے ایک حصّہ کو مانے اور دوسرے حصّے کے ماننے سے

انکار کردے، اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ۝ (۲/۸۵). کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل و خوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس پر اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائے گا. (نیز ۲/۱۱۴؛ ۹-۱۰/۲۲).

سورۂ فجر میں اس حقیقت کو بڑے دلنشین انداز میں سامنے لایا گیا ہے. کہا کہ جب انسان ذلیل و خوار ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ رَبِّیْٓ اَهَانَنِ (۱۶- ۱۹/ ۸۹). خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا. اس کے جواب میں کہا کہ ان سے کہہ دو کہ یہ صحیح نہیں. خدا کسی کو یوں ہی ذلیل نہیں کیا کرتا. تم ذلیل ہوئے ہو اپنے غلط اعمال کے نتیجہ میں. تمہاری حالت یہ تھی کہ معاشرہ میں جو لوگ تنہا رہ جاتے تھے تم ان کی عزت نہیں کرتے تھے. جن لوگوں کی چلتی ہوئی گاڑی رک جاتی تھی، تم ان کی روٹی کا انتظام نہ خود کرتے تھے نہ دوسروں کو ایسا کرنے کے لئے کہتے تھے. جو کچھ تمہیں باپ دادا سے وراثت میں ملتا تھا تم اس کے واحد مالک بن بیٹھتے تھے. تم نے ایسا معاشی نظام قائم کر رکھا تھا جس میں بڑا سرمایہ چھوٹے سرمائے کو کھینچ کر اپنی طرف لے آتا تھا. یہ تھی تمہاری ذہنیت اور یہ تھا تمہارا نظام جس کا نتیجہ یہ ذلت و خواری ہے. اور اس کے باوجود تم شکایت کر رہے ہو کہ خدا نے تمہیں ناحق، بلاوجہ ذلیل کر دیا. خدا کسی کو ناحق ذلیل نہیں کیا کرتا. (نیز ۴-۱۰/۹۲).

"خدا کسی کو ناحق ذلیل نہیں کرتا." اس لئے کہ کسی کو ناحق ذلیل کرنا تو ظلم ہے، اور خدا کبھی کسی پر ظلم نہیں کرتا. اس حقیقت کو قرآن نے بے شمار مقامات پر واضح کر دیا ہے.

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ جو لوگ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں ان کی کھیتیاں پروان نہیں چڑھ سکتیں. وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہیں. اور اس کے بعد ہے وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۳/۱۱۶). اللہ ان پر ظلم نہیں کرتا. وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں. سورۂ توبہ میں مختلف اقوامِ سابقہ کی تباہیوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (۹/۷۰). ان کی یہ تباہیاں اور بربادیاں اس لئے نہیں ہوئی تھیں کہ خدا نے ان پر ناحق ظلم کیا تھا. یہ اس لئے واقع ہوئی تھیں کہ انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی. اس کو (۱۱/۱۰۱) میں دہرایا گیا ہے. (نیز ۱۶/۳۳ اور ۲۹/۴۰) میں. سورۂ یونس میں بتایا گیا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ

شَیْئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ (۱۰/۴۴)۔ خدا انسانوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا۔ انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں جس کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ خدا لاانتہا قوّتوں کا مالک ہے اور انسان اس کے پیدا کردہ بندے جن کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ اس لئے اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جانا چاہیئے کہ وہ اپنی ضعیف و ناتواں مخلوق پر ظلم اور زیادتی کرے گا۔ لوگوں پر جو مصیبتیں اور تباہیاں آتی ہیں ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ یہ ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ وَ اَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (۱۰/۲۲)۔ خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ بندوں پر ظلم کرنا تو ایک طرف' وہ اس کا کبھی ارادہ تک نہیں کرتا۔ وَ مَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ (۴۰/۳۱)۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا سوچو تو سہی۔ مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ .... (۴/۱۴۷)۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت کو تسلیم کرو اور انھیں دل سے قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرو' تو خدا کو تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟ خدا کی "نفسیاتی کیفیت" (معاذاللہ)' (SADISTS) کی نہیں جو دوسروں کو ناحق ستا کر اور اذیت پہنچا کر ذہنی لذت لیتے ہیں۔ اس لئے اس کا تصور تک بھی نہ کرو کہ خدا کسی کو یونہی' بلا وجہ تکلیف پہنچاتا ہے۔ انسانوں کو تکالیف ان کی اپنی غلط روش کی وجہ سے پہنچتی ہیں ــــ اس کو "اپنے آپ پر ظلم کرنا" کہتے ہیں

خدا کے ہاں ہر بات کا فیصلہ حق و انصاف کے مطابق ہوتا ہے۔ وَ قُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْحَقِّ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ وُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ۔ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۶۹-۷۰/۳۹)۔ اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی۔

اعمالِ انسانی کے ظہورِ نتائج کے سلسلہ میں ہے کہ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ (۱۷/۴۰)۔ اس دن ہر شخص کو اس کے کاموں کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ــــ اُس دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ قُضِیَ بَیْنَھُمْ بِالْقِسْطِ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ (۱۰/۴۷)۔ ان کا عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ ہوگا' اور کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ (نیز ۱۰/۵۴)۔

اس سلسلہ میں سورۂ نسآء کی دو آیات بڑی غور طلب اور معنی رس ہیں۔ عہدِ رسالت مآب

کے ایک گروہ کی معکوس ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ. انھیں جب خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ ہمیں خدا کے ہاں سے ملی ہیں.

سورۂ نساء کی دو آیات

اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو رسول اللہ سے کہتے ہیں کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے. کہا کہ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۴/۷۸)۔ ان سے کہہ دو کہ اس قسم کی تفریق و تخصیص صحیح نہیں. حسنات و مصائب سب خدا کی طرف سے ہیں ۔اس کے بعد ہے کہ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا. ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور جو جی میں آتا ہے، کہتے چلے جاتے ہیں۔

اس کے بعد انہیں بات سمجھائی گئی کہ یاد رکھو۔ مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ (۴/۷۹)۔ جو مصیبت تم پر آتی ہے وہ تمہاری اپنی لائی ہوئی ہوتی ہے. اور جو خوشگواریاں تمہیں حاصل ہوتی ہیں، وہ خدا کے ہاں سے ملتی ہیں.

ان دونوں آیتوں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے ــــ پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ حسنات اور مصائب كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ــــ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور دوسری آیت میں کہا گیا ہے کہ حسنات خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور مصائب ہماری اپنی آوردہ. یہ بات کیا ہوئی؟

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ

(۱) جو واقعات بھی رونما ہوتے ہیں، وہ مساعد ہوں یا نامساعد ــــ خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، سب قوانینِ خداوندی کے مطابق واقع ہوتے ہیں. كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

(۲) خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر تم ان کے مطابق چلو گے تو اس کا نتیجہ حسنات (خوشگواریاں) ہوگا ــــ مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ اور

(۳) اگر تم ان کے برعکس، خود اپنے فیصلوں کے مطابق چلو گے تو اس کا نتیجہ مصائب و مشکلات ہوں گی. مَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔

یعنی اس جہانِ سعی و عمل میں، سب نتائج خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مرتب ہوتے

ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سب مِنْ عِنْدِ اللہ ہوتے ہیں۔ اب رہی خوشگوار اور ناخوشگوار نتائج کی تفریق، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ جو کام قوانینِ خداوندی کے مطابق کئے جائیں ان کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے (اسے من اللہ کہا گیا ہے) اور جو کام ان کے خلاف، انسان خود اپنی مرضی سے کرے، ان کا نتیجہ ناخوشگوار ہوتا ہے۔ (اسے من نفسک کہا گیا ہے۔)

یہاں سے یہ عظیم حقیقت سامنے آگئی کہ خدا کی طرف سے ہمیشہ خیر ہی خیر ملتا ہے۔ مصائب و مشکلات (جسے شر کہا جاتا ہے) وہ انسان کا اپنا آوردہ ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ذرا آگے چل کر (خیر اور شر کے عنوان میں ملے گی۔)

ان تصریحات کی روشنی میں دو بنیادی امور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

(۱) یہ جو ہم ہر ناگہانی مصیبت اور ناخوشگوار واقعہ پر کہتے ہیں کہ کیا کیا جائے، اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی یا اللہ کو یہی منظور تھا، تو ایسا کہنا نہ صرف حقیقت کے خلاف ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے خلاف بہت

غلط تصورات

بڑا الزام ہے۔ "خدا کی مرضی ہی ایسی تھی" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے نہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں — ہم نے تو ہر طرح کی کوشش کر لی تھی کہ ایسا نہ ہو، لیکن اس کے باوجود خدا نے ایسا کر دیا — اور نہ ہی اس کی کوئی معقول وجہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف دم مارنے کی جا نہیں۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو جی چاہے کرے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کی حکمت سے وہی واقف ہے۔ — خدا کی باتیں خدا ہی جانے! آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کس قسم کے خدا کا تصور سامنے آتا ہے — ایسا خدا جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون، نہ حساب ہے نہ کتاب، نہ عدل ہے نہ انصاف۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو ناحق مصیبتوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ ایسا کیوں کرتا ہے، نہ اس کی علم کسی کی سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی اس کی بابت اس سے پوچھ سکتا ہے۔

(۲) اور دوسری بات یہ کہ انسان کی تجویز و تدبیر اور اس کی تگ و تاز اور سعی و کاوش سے کچھ نہیں ہوتا — وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے — اس سے انسان ایک مجبورِ محض مخلوق بن کر رہ جاتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق تفصیلاً بعد میں لکھا جائے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ

اتفاقیہ ایسا ہوگیا (۱) اکثر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کا کوئی سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا. ہم اسے اتفاق (یا CHANCE) کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور

(۲) ایک فرد ان مصائب و آلام کا بھی شکار ہو جاتا ہے جن کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا، بلکہ یوں ہوتا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس کے اعمال کا نتیجہ کچھ اور (یعنی خوشگوار) ہونا چاہیئے لیکن ہوتا اس کے برعکس (ناخوشگوار) ہے. مثلاً ایک بددیانت معاشرہ میں، دیانت و امانت کے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والا، قسم قسم کی پریشانیوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، حالانکہ قانونِ خداوندی کے مطابق، حسنِ عمل کا نتیجہ الحسنیٰ (خوشگواریاں) ہونا چاہیئے.

جہاں تک شق اوّل (CHANCE) کا تعلق ہے، اس کائنات میں، جو قانونِ علّت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے غیر متبدّل نظام کے تابع سرگرمِ عمل ہے، کوئی واقعہ ایسا رونما نہیں ہو سکتا جس کا کوئی سبب (CAUSE) نہ ہو. لیکن اسباب (CAUSES) کا معلوم ہونا، انسانی علم و تحقیق پر منحصر ہے. انسان اپنے عہدِ طفولیّت میں، کسی واقعہ کا بھی سبب نہیں جانتا تھا، اس لئے وہ ہر واقعہ کو اتفاق (چانس) پر محمول کرتا تھا. جوں جوں اس کا علم بڑھتا گیا، رموزِ فطرت پر پڑے ہوئے پردے اُٹھتے گئے اور واقعات و حوادث کے اسباب اس کی نگاہوں کے سامنے آنے لگے. سینکڑوں واقعات، حوادث حتیٰ کہ امراض ایسے ہیں جنہیں اس سے پہلے محض اتفاق (چانس) کا نتیجہ قرار دیا جاتا تھا لیکن اب وہ قانونِ علّت و معلول کے دائرے کے اندر آ چکے ہیں — اب بھی کیفیت یہ ہے کہ افریقہ، امریکہ، یا آسٹریلیا وغیرہ کے قدیم قبائل کے نزدیک جو حوادث ایسے ہیں جن کی کوئی علّت ان کی سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے وہ انہیں دیوی دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں. مہذّب دنیا میں، جہاں نت نئے سائنس کے انکشافات وجہ نقاب کشائی اسرارِ فطرت ہوتے رہتے ہیں، ان حوادث کی علّت کے سمجھنے میں کچھ بھی دشواری پیش نہیں آتی. حتیٰ کہ بعض ایسے امور جن کی کوئی وجہ، ہمارے بچپن کے زمانے میں ہماری سمجھ میں نہیں آیا کرتی تھی، ہمارے بچّے اب انہیں روزمرہ کا معمول سمجھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح واقع ہوتے ہیں — اور یہ بات غیر مہذّب قدیم قبائل تک ہی محدود نہیں. ایک مہذّب ملک میں بھی جو لوگ مذہب کی پیدا کردہ توہم پرستیوں

کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرنے کے خوگر ہیں، وہ ابھی تک ان حوادث کو" خدا کی شان"، کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، جن کے اسباب و علل سے، علمی گھرانوں کے بچوں تک باخبر ہوتے ہیں۔ جن امراض کے لئے وہ ابھی تک تعویذ کراتے اور قبروں پر چراغ جلاتے رہتے ہیں، یہ بچے ان کے لئے سیدھے ڈاکٹر کے ہاں پہنچ کر انجکشن لگوا آتے ہیں۔

لہذا، جن حوادث کے اسباب و علل سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی، ہم انہیں اتفاق (چانس) پر محمول کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے زمانے میں بھی (اس کے باوجود کہ انسان نے کارگہ کائنات کے بہت سے رموز و اسرار سے آگہی حاصل کر لی ہے)۔ ہنوز کئی گوشے ایسے ہیں جن میں حوادث کے اسباب و علل کا علم حاصل نہیں ہو سکا۔ جوں جوں کائنات سے متعلق ہمارا علم آگے بڑھتا جائے گا، ان حوادث کے اسباب و علل بھی ہمارے حیطۂ معلومات میں آ جائیں گے اور اس طرح آخر الامر، فطرت کا کوئی حادثہ بھی، راز نہیں رہے گا۔ قرآنِ کریم نے آدم (یعنی آدمی) کے سلسلہ میں جو کہا تھا کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ — خدا نے آدم میں اشیائے کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی، تو اس کے ساتھ کُلَّھَا (۲/۳۱)۔ کے اضافہ سے اس کی بھی صراحت کر دی کہ ان اشیا میں سے کوئی بھی ایسی نہیں رہے گی جس کا علم یہ حاصل نہ کر سکے۔

اتفاق (CHANCE) ہمارے علم کی کمی کا نام ہے، ورنہ کائنات میں کوئی واقعہ بھی اتفاقیہ (BY CHANCE) ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

غلط معاشرہ میں افراد کی حالت

اب آیئے دوسری شق کی طرف (کہ ایک فرد ایسے مصائب کا شکار بھی ہو جاتا ہے جو اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے)، اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب انسان، کسی معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے تو وہ اس معاشرہ کا جزو بن جاتا ہے۔ جب معاشرہ صحیح روش پر گامزن ہوتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج سے تمام افرادِ معاشرہ متمتع ہوتے ہیں — وہ افراد بھی جنہوں نے خواہ انفرادی طور پر ان خوشگواریوں کے حصول کی جدوجہد میں حصہ نہ بھی لیا ہو — مثلاً اگر کسی معاشرہ کی صحیح جدوجہد سے فصلیں اچھی ہوں اور پیداوار میں فراوانی، تو اس معاشرہ کے وہ افراد بھی خوش حال ہو جاتے ہیں جنہوں نے ان فصلوں کے کھیتوں کی شکل تک بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی اصول کے مطابق، جو معاشرہ، غلط روش

اختیار کرے، اس کے تباہ کن نتائج ان افراد کو بھی بھگتنے پڑتے ہیں جو اس غلط روش سے براہِ راست متعلق نہ ہوں اور انھوں نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا ہو ۔ جب کسی دریا کا بند ٹوٹ جائے تو اگرچہ اس کے بلاواسطہ ذمہ دار حکومت کے اربابِ نظم و نسق ہوتے ہیں لیکن اس کی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں گاؤں کے وہ افراد بھی آجاتے ہیں جنھیں اس کا علم تک بھی نہ ہو کہ وہ بند کیسے ٹوٹا ہے۔ یہی وہ اجتماعی خطرات ہوتے ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج (۸/۲۵)۔ اپنے معاشرہ کو ایسے خطرہ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، جو، جب آتا ہے تو پھر اس کی زد میں صرف وہی لوگ نہیں آتے جو خرابیوں اور تباہیوں کے براہِ راست ذمہ دار ہوں، اس کی لپیٹ میں ہر کہہ ومہ آجایا کرتا ہے۔

لیکن انسان کی حالت عجیب ہے۔ معاشرہ کے اجتماعی نظام کے حسنِ تدبّر سے جو آسائشیں اور خوش حالیاں ایک فرد کو میسر ہوتی ہیں، ان کے متعلق وہ کبھی نہیں کہتا کہ میں نے اس کے حصول کے لئے کوئی کوشش نہیں کی، اس لئے میرا ان پر کوئی حق نہیں۔ یہ صرف انھیں ملنی چاہئیں جنھوں نے ان کے لئے تگ و دو کی ہے۔ وہ ان سب سے بہرہ ور ہوتا ہے اور اس طرح ہوتا ہے گویا یہ اس کا حق ہے، اور اس لئے وہ کبھی ان لوگوں کا شکریہ تک بھی ضروری نہیں سمجھتا جن کے حُسنِ تدبّر یا سعی و عمل کی وجہ سے وہ آسائشیں میسر آئی ہیں لیکن اگر معاشرہ کی کسی خرابی کی وجہ سے کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ چلّانے لگ جاتا ہے کہ میں اس خرابی کا ذمہ دار نہیں، اس لئے میں یہ مصیبت کیوں بھگتوں۔ یہ مجھ پر ظلم ہے، زیادتی ہے۔ وہ دہائی مچا دیتا ہے کہ جو لوگ معاشرہ کے اجتماعی نظم و نسق کے ذمہ دار ہیں، ان کا مواخذہ ہونا چاہیئے۔ یہ مصیبتیں انھیں اٹھانی چاہئیں، ہمیں ان کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے!

انسان کی اس ذہنیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، قرآن کہتا ہے کہ وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۔ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا (۱۷/۸۳)۔ جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں اور اسے زندگی کی خوشگواریاں میسر ہوتی ہیں، وہ (قوانینِ خداوندی کی طرف سے) اعراض برتتا اور نخوت و تکبّر سے منہ دوسری طرف موڑ لیتا ہے لیکن جب اس پر مصیبت آتی ہے تو مایوس ہو کر چیخنے چلّانے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ان سے کہو کہ معاشرہ کا ہر فرد، اپنی اپنی حدودِ اختیار[۱] کے اندر مصروفِ کار رہتا ہے، اس لئے وہ اجتماعی زندگی کے منفعت

---

[۱] شاکلۃ اس رسی کو کہتے ہیں جس سے جانور کا پاؤں باندھ دیتے ہیں (یعنی TETHER) "باقی اگلے صفحہ پر دیکھئے۔"

بخش اور ضرر رساں نتائجِ اعمال میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک، فلہٰذا، ان کا ذمہ دار ہوتا ہے قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے دل نشین انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ جہنم میں لیڈر اور عوام

جہنم میں لیڈروں اور عوام کے مکالمات

باہمی جھگڑیں گے اور ایک دوسرے کے سر الزام دھریں گے کہ تم ہی ان مصائب و آلام کے ذمہ دار ہو۔ سورۂ سبا میں ہے۔

> اگر تو اس منظر کو سامنے لائے جب یہ لوگ جنھوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی، خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے کے خلاف الزام دھر رہے ہونگے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔ لیڈر کہیں گے کہ ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو؟ جب سیدھا راستہ تمھارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمھیں روکا تھا کہ اسے اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو!
>
> ان کے متبعین (FOLLOWERS) کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے رہتے تھے جس سے ہم سیدھے راستے کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کرسکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا! (۳۱-۳۳/۳۴)

لیکن ان میں سے کسی کا بھی یہ عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جائیگا اور فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ۝ (۳۷/۳۳) وہ سب اس عذاب میں برابر کے شریک ہوں گے۔ اسے سب کو یکساں طور پر بھگتنا پڑے گا[۱]۔

---

[۱] لیڈروں اور عوام کے ان مکالمات کی تفصیل، میری کتاب "جہانِ فردا" میں جہنم کے عنوان میں ملے گی۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۸۹) اس کی وجہ سے وہ ایک خاص دائرہ کے اندر ہی چل پھر سکتا ہے۔ اس آیت میں شاکلتہ کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی فرد کے حدود اختیار۔

اربابِ نظم و نسق کو ان کی غلط اندیشیوں کی وجہ سے اور عوام کو اس لئے کہ یہی تو اُن خواص کی اُس قوّت کا باعث تھے جس کی بنا پر وہ معاشرہ کو غلط پر چلاتے تھے۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رو سے، اجتماعی زندگی میں فرد اور معاشرہ کا تعلق۔ معاشرہ، افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے — وہ بنا بنایا، کہیں اوپر سے نہیں ٹپک پڑتا — اگر عوام غلط روش پر چلنا نہیں چاہتے، تو انہیں چاہیئے کہ اٹھ کر اس نظام کو بدل دیں جو معاشرہ کو صحیح روش پر نہیں چلنے دیتا۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن، عوام کے اس عذر کو قابلِ پذیرائی قرار نہیں دیتا کہ ہم کمزور تھے لہٰذا، مجبور تھے اس لئے ہمیں اس عذاب میں ماخوذ نہ کیا جائے — صاحبِ اختیار و ارادہ انسان کا اپنے آپ کو مجبور قرار دینا، سب سے بڑا جرم تو خود ہی ہے — وہ جرم جس کی پاداش میں ابلیس ہمیشہ کے لئے کشاد کی راہوں سے رجیم (راندہ) قرار پاگیا۔ لہٰذا، اپنے آپ کو مجبور کہہ کر اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرنا، شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کمزور انسان (یعنی جن کے پاس قوّت کا سامان نہیں) معاشرہ کی غلط روش بدلنے کے لئے جہدِ اوّل میں ناکام رہ جائیں، لیکن اس جدوجہد میں ناکام رہ جانا اور بات ہے اور، اپنے آپ کو مجبور کہہ کر، اس کے سامنے سپر ڈال دینا اور اس کے بدلنے کی کوشش ہی نہ کرنا، اور بات۔ میزانِ خداوندی میں پہلی روش موجبِ ہزار تبریک و تہنیت ہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ف (۲/۱۵۷) — اور دوسری روش مستوجبِ عذابِ جہنم — فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (۴/۹۷)۔

یہ ہے، قرآنِ کریم کی رو سے، معاشرتی زندگی میں مصائب و آلام کی صحیح پوزیشن[1]۔ جب تک

ہمارا صدرِ اوّل

قرآنِ کریم کی یہ تعلیم مسلمانوں کے سامنے رہی، وہ ہر اجتماعی مصیبت کے وقت کھڑے ہو کر سوچتے اور اس امر کا جائزہ لیتے کہ اس مصیبت کی وجہ کیا ہے۔ وہ اگر دیکھتے کہ اس مصیبت کا باعث نظم و نسق کی کوئی خرابی ہے، تو عوام، اربابِ نظم و نسق کو اس سے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے۔ اگر وہ براہِ راست عوام کے تساہل یا تغافل کا نتیجہ ہوتی، تو عوام خود اس کے ازالہ اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے۔ ان میں سے کوئی بھی نہ تو

---

[1] اجتماعی زندگی کے متعلق مزید تفصیل "قوموں کے عروج و زوال" سے متعلق باب میں ملے گی۔

اسے خدا کی طرف منسوب کر کے فرار کی راہ اختیار کرتا، اور نہ ہی اپنی "تقدیر" کہہ کر رو دھو کر بیٹھ جاتا۔

بعد میں سازش

لیکن بعد میں، جب اربابِ نظم و نسق نے استبداد کی راہیں اختیار کیں اور ان کی وجہ سے معاشرتی مصائب و آلام سیلاب کی طرح امنڈنے لگے، تو انہیں فکر پیدا ہوئی کہ اگر عوام نے یہ سمجھ لیا کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں، تو ہمارے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے، اس لئے انھوں نے اس خطرہ سے بچنے کے لئے سوچا یہ کہ عوام کی توجہ کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیا جائے۔ ایسا کرنا تنہا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے انھوں نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملایا ـــ کوئی فرعون بھی ہامان کے بغیر أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ کا دعویٰ نہیں کر سکتا ـــ انھوں نے کہا کہ یہ کونسی مشکل بات ہے۔ ابھی لو! چنانچہ انھوں نے عوام سے یہ وعظ کہنا شروع کر دیا کہ دنیا میں خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ یہ جو تمہارے حاکم بنے بیٹھے ہیں انھیں اس کا کیا اختیار تھا کہ یہ حاکم بن جاتے۔ انہیں حاکم خدا نے بنایا ہے۔ پھر، جو کچھ یہ کرتے ہیں، انھیں اس کا بھی کس طرح اختیار ہو سکتا تھا کہ یہ اپنی مرضی سے ایسا کرتے۔ یہ بھی خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اگر خدا کی مرضی ایسی نہ ہوتی تو یہ اس قسم کی روش کیسے اختیار کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے ظلم کے خلاف لب کشائی کرنا تو ایک طرف، دل میں بھی احساسِ شکایت بیدار نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم خدا کی مشیّت اور اس کی مرضی کے خلاف شکایت کر رہے ہو۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، ارتداد ہے۔ توبہ کرو، ہزار بار توبہ کرو۔

اور ان وعظوں کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ ہر مصیبت خدا کی مرضی سے وارد ہوتی ہے۔ اس پر انسان کو "صبر شکر" کرنا چاہیئے[1]۔

یاد رکھئے۔ وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۴۲/۳۰)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے، تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے ـــ یہ کبھی انفرادی طور آتی ہے ـــ جیسے خود اپنی انگلی آگ میں ڈال دینا ـــ اور کبھی اجتماعی طور پر ـــ جیسے دریا

---

[1] یہاں انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں بتایا جائے گا کہ یہ تبدیلی ہوئی کیسے اور کب؟

کا بند ٹوٹ جانے سے سیلاب کی تباہ کاریاں۔ اور یا غلط معاشرہ میں، اصول پرستی کی دیانتدارانہ زندگی بسر کرنے والوں کو قدم قدم پر پریشانیوں کا سامنا کرنا۔

یہ آخری چیز (یعنی دیانت دارانہ زندگی بسر کرنے والوں کی پریشانیاں) مزید وضاحت چاہتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے ـــ یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵)۔ اے افرادِ جماعتِ مومنین! تم اپنی ذات (اَنْفُسَکُمْ) کی نگہداشت کرو۔ یہ تم خود ہی کر سکتے ہو۔ دوسرا کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو! اگر تم (اپنی ذات کی نگہداشت سے) صحیح راستے پر چلتے رہے، تو غلط روش پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے ـــ یہ آیت عظیم حقائق کی پیامبر ہے۔

دیانت دارانہ زندگی بسر کرنیوالوں پر پریشانیاں کیوں آتی ہیں؟

یہاں یہ کہا گیا ہے ـــ کہ اگر تم صحیح راستے پر چلتے رہو تو غلط راہ پر چلنے والے تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکیں گے لیکن ہمارا مشاہدہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جو دیانت اور امانت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، آئے دن نقصان اٹھاتا ہے۔ دیانتدار دوکاندار کے خلاف، بددیانت کاروباری اس طرح محاذ قائم کر لیتے ہیں کہ اس کا اثاثہ تک نقصان کی نذر ہو جاتا ہے۔ دیانت دار اور فرائض شناس افسر کے خلاف، اس کے ہمعصر اور اس کا عملہ، اس طرح کی سازشیں کرتا ہے کہ اس کا جینا محال ہو جاتا ہے ـــ اس قسم کی مثالیں معاشرہ کے ہر گوشے میں مل سکتی ہیں ـــ پھر قرآن نے یہ کیسے کہہ دیا کہ جو شخص صحیح روش اختیار کرتا ہے، غلط روش پر چلنے والے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ـــ یہ بات ذرا گہرے غور و تدبّر کی متقاضی ہے!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، انسانی پیکر میں پہنچنے پر، زندگی دو سطحوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

طبیعی زندگی کا نفع نقصان

ایک، وہی حیوانی سطح جو پیچھے سے چلی آ رہی تھی۔ اسے طبیعی زندگی کہتے ہیں۔ یہ زندگی قوانینِ طبیعی کے تابع رہتی ہے اور اس میں نیک و بد، حتّٰی کہ مومن و کافر میں بھی کوئی تمیز و تفریق نہیں ہوتی۔ آگ میں ہاتھ نیک آدمی ڈالے

یا بد، اس کا اثر دونوں پر یکساں ہوگا۔ سنکھیا کافر کھائے یا مومن، دونوں ہلاک ہوجائیں گے۔ اس زندگی میں نقصانات بھی طبیعی قوانین کے مطابق ہوتے ہیں اور منافع بھی انہی قوانین کے مطابق حاصل. جو شخص بھی، زراعت کے قوانین کے مطابق اپنی زمین سنوارے گا اور محنت کرے گا، اس کی فصل اچھی ہوگی. جو اس میں تساہل برتے گا اس کی فصل خراب ہوگی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔

> ہمارا قانون یہ ہے کہ جو کوئی اس دنیا میں طبیعی مفادِ عاجلہ چاہتا ہے۔ اور اس کے لئے طبیعی قوانین کے مطابق کوشش کرتا ہے، ہم اسے اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ کے مطابق بنایا ہے، مادّی مفاد دیدیتے ہیں. لیکن مستقبل کی زندگی میں اس کے لئے جہنم کی تباہی ہوتی ہے جس میں وہ بدحال اور دھتکارا ہوا داخل کیا جاتا ہے۔
>
> اس کے برعکس، جو شخص، مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں بھی چاہتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے، اور مستقل اقدار پر یقین رکھتا ہے، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں حال اور مستقبل، دونوں میں بھرپور نتائج کی حامل ہوتی ہیں۔
>
> ہم اس طرح ان دونوں گروہوں کو — یعنی صرف مفادِ عاجلہ چاہنے والوں اور مفادِ عاجلہ کے ساتھ مستقبل کی خوشگواریاں طلب کرنے والوں کو، اپنے قوانین کی رُو سے اُنکی کوششوں کے مطابق آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور تیرے نشوونما دینے والے کی بخشائشیں ان سب کے لئے یکساں طور پر کھلی رہتی ہیں. ہم ان کے راستے میں کسی کے لئے بند نہیں لگا دیتے کہ ایک گروہ تو آگے بڑھ جائے اور دوسرے گروہ کو وہیں روک دیا جائے (۱۸ — ۱۷/۲۰)۔

یعنی جو سامانِ زیست، طبیعی قوانین کے مطابق حاصل ہوتا ہے، اسے ہر وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو ان قوانین کے مطابق ان کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے. زندگی کی اس دوڑ میں، کافر و مومن، دونوں کے لئے یکساں طور پر میدان کھلا رہتا ہے. یہ نہیں ہوتا کہ کافر کو اس کی کوشش کے باوجود پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا جائے، اور مومن کو، خواہ وہ اس کے لئے کوشش نہ ہی کرے آگے بڑھا دیا جائے۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ علم است ایں جا ⁂ قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

دوسری جگہ ہے۔

جو شخص مستقبل کے مفاد چاہتا ہے تو ہم، اس کی کوشش کے مطابق، ان میں اضافہ کر دیتے ہیں۔
اور جو شخص محض دنیاوی مفاد کا طالب ہوتا ہے، تو اسے، اس کی کوشش کے مطابق، وہ مفاد مل جاتے ہیں لیکن اس کے لئے مستقبل کے مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ (۴۲/۲۰)

یہ ہے خدا کا قانون طبیعی زندگی سے متعلق۔ چونکہ اس مقام پر زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے، اس لئے اس میں نیک اور بد میں کسی قسم کی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ حیوانوں میں نہ کوئی نیک ہوتا ہے نہ بد، نہ کافر ہوتا ہے نہ مومن۔

زندگی کی دوسری سطح، جسے ہم بغرضِ تعارف انسانی زندگی کہہ کر پکارتے ہیں، حیوانی زندگی سے بلند ہوتی ہے۔ اس میں اخلاقی اقدار کی کارفرمائی ہوتی ہے جو شخص ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کی ذات کی نشوونما رک جاتی ہے اسے مستقبل کی زندگی یا حیاتِ آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسری سطح زندگی کا نفع نقصان

لیکن زندگی کی اس سطح پر حیوانی زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ وہ بھی بدستور موجود ہوتی ہے اور اس کے تقاضے بھی اسی طرح زندہ۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی زندگی پر دوہرے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔۔۔ ایک طبیعی قوانین اور دوسرے مستقل اقدار سے متعلق قوانین۔ صحیح زندگی (جسے اسلامی زندگی یا ایک مومن کی زندگی کہا جاتا ہے) وہ ہے جس میں انسانی جسم اور اس کی ذات، دونوں کے تقاضے بہ حسن و خوبی پورے ہوتے رہیں۔ صحیح (اسلامی) معاشرہ میں ان دونوں میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ لیکن غلط (غیر اسلامی) معاشرہ میں ان دونوں میں قدم قدم پر ٹکراؤ ہوتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں ایک طرف ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو مستقل اقدار (دیانت، امانت، پاک بازی) کا تحفظ چاہتا ہے اور اس کے مدِمقابل دوسرا انسان (یا انسانوں کا گروہ) جنہیں ان اقدار کا کوئی پاس نہیں ہوتا۔ وہ صرف مادی مفادات کے خواہاں ہوتے ہیں خواہ وہ کسی طریق سے حاصل ہو جائیں۔ جب ان دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس شخص کے مقابلہ میں، جو ان کے حصول کے لئے ہر قسم کا حربہ بلا تامل استعمال کرے، وہ شخص

ناکام رہے گا جو ہاتھ اٹھانے سے پہلے یہ سوچے کہ مستقل قدر اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔
اب اس شخص کے سامنے دو راستے ہیں، جن میں سے یہ جونسا چاہے منتخب کرلے۔ یا تو یہ بھی اقدار پرستی کو بالائے طاق رکھ کر، ہر حربہ استعمال کرلے اور اس طرح فریقِ مقابل کا، اس کے برابر کی سطح پر کھڑے ہو کر مقابلہ کرے۔ اس سے اسے مادی مفاد تو حاصل ہو جائیں گے لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا اور یا یہ اپنی ذات کے مفاد کو ترجیح دے کر، اصول پرستی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اس طرح اسے مادی نقصان تو اٹھانا پڑے گا لیکن اس کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لہٰذا جب قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۔ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔ تو اس کا یہی مطلب تھا کہ اگر تم اپنی ذات کی نگہداشت کرو گے تو جو شخص غلط راستے پر چل رہا ہے، وہ (ہو سکتا ہے کہ تمہیں مادی نقصان پہنچا دے۔ لیکن وہ) تمہاری ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۵/۱۰۵)۔ انسانی ذات کے نفع یا نقصان کا اندازہ، مادی پیمانوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ اسے خدائی پیمانوں سے ماپا جاتا ہے، اس لئے اس کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ہوگا جب اسے قانونِ مکافاتِ عمل کی میزان میں تولا جائے گا۔

لیکن قرآنِ کریم طبیعی زندگی کے تقاضوں (یعنی مادی مفادات) کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ انہیں بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے وہ مومن کی زندگی یہ بتاتا ہے کہ فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)۔ اسے دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل ہوتی ہیں اور مستقبل کی زندگی کی خوشگواریاں بھی ۔۔۔

مادی مفادات کی اہمیت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقصد حاصل کیسے ہو؟ یعنی انسان کو مادی مفاد بھی حاصل ہوتے رہیں، اور مستقل اقدار کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ قرآن کی ساری تعلیم اسی پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔
ایک اصول پرست انسان (مردِ مومن)، اور مادہ پرست انسان (صرف مفادِ عاجلہ کا خواہاں جسے کافر کہا جاتا ہے) میں باہمی ٹکراؤ کو حق و باطل کی کش مکش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کش مکش میں، اصول پرست انسان اس لئے شکست کھا جاتا ہے کہ غلط معاشرہ میں، باطل پرست افراد ایک متحدہ محاذ کی شکل اختیار کئے ہوتے ہیں اور اصول پرست انسان، الگ الگ انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے، اصول پرستوں کا یہ شعار (یعنی انفرادی اندازِ زیست، جسے تصوف یا مسلکِ خانقاہیت کہا

جاتا ہے) غلط ہے۔ اس کے نزدیک صحیح اسلامی زندگی یہ ہے کہ یہ حق پرست افراد جماعتی زندگی بسر کریں اور اس طرح متحدہ طور پر، باطل پرست محاذ کا مقابلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ اس مقابلہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا — باطل پرست گروہ اپنے مفادات کو آسانی سے نہیں چھوڑیگا، وہ ان کے تحفظ کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کرے گا۔ حق و باطل کے اس تصادم و تزاحم کے ہی وہ مقامات ہیں جن کا تذکرہ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر کیا ہے۔ اسے معرکۂ جہاد کہا جاتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ

حق و باطل کا ٹکراؤ

کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تمہیں بھی ان جانگداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے باطل کی قوتوں سے ٹکر لی تھی۔ اس تصادم میں حالت یہ ہو جاتی تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انھیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسولؐ پکار اُٹھتے کہ بارِ الہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا ـ ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جاکر ان کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور نصرت خداوندی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔

یاد رکھو! تمہیں بھی انہی مراحل میں سے گزرنا پڑے گا۔ (۲/۲۱۴)

جنگِ احزاب میں اس ٹکراؤ نے کس قدر شدت اختیار کر لی تھی، اس کا نقشہ قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ؛

وہ تم پر ایسا سختی کا وقت تھا کہ دشمن کا لشکر چاروں طرف سے اُمنڈ کر آ گئے تھے۔ خوف کے مارے تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چا رہا تھا اور دہشت سے تمہارے دل اس طرح دھک دھک کر رہے تھے گویا وہ اُچھل کر حلق تک آ پہنچیں گے۔ اور (تم میں سے جو کمزور ایمان کے حامل تھے ان کے دل میں) خدا کے وعدوں کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔

اس لرزا دینے والی مصیبت کے وقت مومنین کا جذبۂ صادقہ ابھر کر سامنے آگیا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ وہ کس پامردی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔ (۱۱-۱۰/۳۳)۔

یہی وہ تصادمات ہیں جن میں ہر قسم کے (طبیعی) نقصانات کا امکان و احتمال ہوتا ہے۔

ان میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہو گا۔ کہیں سامانِ خورد و نوش کی کمی ہو گی۔ کہیں مال اور جان کا نقصان ہو گا۔ کہیں کھیت اور باغ اجڑیں گے۔ یہ سب کچھ ہو گا، لیکن اس کے بعد فتح و کامرانی کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و آلام کے ہجوم میں ان کی نگاہیں اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹیں گی کہ ہمارا مقصد باطل قوتوں کو شکست دے کر حق کا نظام قائم کرنا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلیں آتی ہیں تو آئیں۔ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اس کی طرف بڑھیں گے۔ (۲/۱۵۵-۱۵۶)

اس مقابلہ کے لئے، صبر و استقامت کے جوہرِ ذاتی کے ساتھ ساتھ، مادی ساز و سامان کی بھی بیحد ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہا گیا کہ تم اپنی استطاعت بھر، اپنی سرحدوں کا سامانِ مدافعت تیار رکھو۔ (۸/۶۰) رزم گاہ میں اگر جنگی تدبیر میں کوئی نقص رہ جاتا ہے تو اس کا خمیازہ، جماعتِ مومنین کو بھی اسی طرح بھگتنا پڑتا ہے، جس طرح، ایسے حالات میں، مخالفین کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ چنانچہ جنگِ اُحد میں، جنگی تدبیروں کی ایک خرابی کی وجہ سے، جماعتِ مومنین کی فتح مبدّل بہ شکست ہوگئی اور اس کے نتیجہ میں انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ حتیٰ کہ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اس میں خود رسول اللہ کو بھی زخم آئے اور آپؐ کے رفقاء نے بڑی جانفشانی اور سرفروشی سے آپؐ کی حفاظت کی۔

یہی وہ مقامات ہیں جہاں جماعتِ مومنین کو یہ کہہ کر اطمینان دلایا گیا کہ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ج (۴/۱۰۴)۔ اگر تمہیں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہے تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ فریقِ مخالف کو بھی نہ اس قسم کے نقصانات اٹھانے پڑے تھے۔ وَ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (۳/۱۳۹)۔ وقائع و حوادثِ زمانہ کی یہ گردش اسی طرح رہتی ہے اور اس کی لپیٹ میں تمام انسان آ سکتے ہیں ـــ کبھی اِن کا پلڑا بھاری، کبھی اُن کا ـــ لہٰذا، مشکلات کے وقت گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیئے۔ استقامت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

ان تصادمات میں اگر حق پرستوں کی جماعت، ضروری ساز و سامان کے ساتھ، ثبات و استقامت سے، مخالفین کا مقابلہ کرتی رہے تو آخرالامر کامیابی انہی کی ہوتی ہے اور اس طرح اس معاشرہ کا

قیام عمل میں آجاتا ہے جس میں مستقل اقدار کی پابندی کے لئے مادی نقصان اٹھانا نہیں پڑتا۔ یہ وہ نظام ہے جس میں، لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۔ (اگر تم صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا) کے مطابق، نہ مادی نقصان ہو گا نہ انسانی ذات کا زیاں ۔۔۔ اُسے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً کہا جائے گا ۔۔۔ اس دنیا میں مادی خوشگواریاں اور اُخروی زندگی میں انسانی ذات کی سرفرازیاں ۔ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ یہ انتہائی کامرانی ہے۔

اس جدوجہد میں جو لوگ اس نظام کے قیام سے پہلے ہی جان دے دیتے ہیں، ان کے حصے میں اس دنیا کے مصائب و آلام ہی آتے ہیں لیکن ان کی اخروی زندگی ایسی حسین ہو جاتی ہے کہ ہر جینے والا اس قسم کی موت پر ہزار رشک کرتا ہے۔ انہی کو مقتولین فی سبیل اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جینے والوں سے کہا جاتا ہے کہ انہیں مردہ مت سمجھو۔ یہ حیاتِ جاوداں سے ہم آغوش ہیں۔ (۲/۱۵۴)۔

لیکن یہ کامرانی حاصل ہوتی ہے، اپنی سعی و عمل ہی سے۔ اور یہ سعی و عمل نتیجہ خیز ہوتی ہے اجتماعی نہج زندگی میں ۔۔۔ اسے قومی یا ملّی زندگی کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔

چھٹا باب

قوموں کی "تقدیر"

افراد کی زندگی کی طرح، قوموں کی زندگی بھی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے تابع رہتی ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو ان کے عروج و زوال کا پیمانہ بنتا اور ان کی موت و حیات کے فیصلے کرتا ہے اور چونکہ (جیسا کہ ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں) افراد کی "تقدیر" اقوام کی "تقدیر" (یعنی حیاتِ اجتماعیہ) کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، اس لئے یوں کہیے کہ اقوام سے متعلق قانونِ مکافات کا دائرہ، افراد اور اقوام دونوں کو محیط ہوتا ہے۔

قوموں کے تغیرِ احوال کے متعلق، ہم، خدا کا یہ قانون پہلے دیکھ چکے ہیں کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (۱۳/۱۱، ۸/۵۳)

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کرے۔

یہی وہ قانون (خدا کا امر[1]) ہے جس کے متعلق کہا کہ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ تاکہ خدا کا امر پورا ہو کر رہے۔ خدا کا یہ امر اس طرح پورا ہوتا ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ (۸/۴۲)۔ جس قوم کو ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلائل و براہین کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی علیٰ وجہ البصیرت زندہ

قوموں کی موت و حیات بلا وجہ نہیں ہوتی

---

[1] خدا کے "امر" کی بحث دوسرے باب میں آ چکی ہے۔

رہے۔ یہاں نہ کسی قوم کو زندگی یونہی بطور "بخشش" ملتی ہے اور نہ ہی اس کی ہلاکت، دھاندلی سے (بلاوجہ) ہوتی ہے۔ یہاں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو ناحق بلاوجہ تباہ کر دیا جائے۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ٥ (۶/۱۳۲)۔ یہ اس لئے کہ تیرا رب ایسا کبھی نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ناحق تباہ کر دے اور اسے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کا یہ انجام کیوں ہوا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ٥ (۱۱/۱۱۷)۔ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں۔ یہ اس سے بہت بعید ہے۔ وہ ایسا کر ہی نہیں کہ کسی بستی کو ناحق ہلاک کر دے درانحالیکہ اس کے رہنے والوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ سورۂ روم میں قرآن کی اوّلین مخاطب قوم [عربوں] کے متعلق کہا گیا ہے کہ انھیں لاکھ سمجھایا گیا کہ غلط روش کا نتیجہ ہلاکت انگیز ہوتا ہے اس لئے، اگر یہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں تو انھیں چاہیئے کہ یہ روش چھوڑ دیں، لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ ان سے کہو کہ اگر یہ بات ان کی سمجھ میں اس طرح نہیں آتی تو یہ

تاریخی شہادات

تاریخی نوشتوں کو دیکھیں۔ اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر غور کریں اور ان کے انجام و عواقب کو سامنے لائیں۔

اس مقصد کے لئے اگر یہ لوگ آنکھیں کھول کر دنیا میں چلیں پھریں گے تو انہیں نظر آجائے گا کہ جن قوموں نے، ان سے پہلے، انہی جیسی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا تھا۔ وہ قومیں شوکت و حشمت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ انہوں نے زمین کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا۔ ملکوں کو آباد کیا۔ ان کی آبادیاں بھی ان مخاطبین کی آبادی سے کہیں زیادہ تھیں۔ ان کے رسول ان کے پاس واضح قوانین لے کر آئے ۔۔۔

قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ پھر ان کا انجام کیا ہوا، ایک اصولی بات سن رکھو۔ وہ یہ کہ ایسا کہیں نہیں ہوا کہ خدا نے کسی قوم کو یونہی ظلم اور زیادتی سے تباہ کر دیا ہو۔ قومیں اپنے اوپر آپ ظلم کرتی ہیں۔ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

ہاں تو خدا کے رسول ان کے پاس آئے لیکن انھوں نے انھیں جھٹلایا، ان کا تمسخر اڑایا اور اپنی اسی غلط روش پر گامزن رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جنھوں نے

اس قسم کا ناہمواریاں پیدا کرنے والا نظام قائم کر رکھا تھا، ان کی اپنی زندگی میں ناہمواریاں پیدا ہوگئیں۔ ان کے معاشرہ کا توازن بگڑ گیا اور وہ تباہ و برباد ہوگئیں۔ (۹۔ ۳۰/۱۰)۔

تکذیبِ رُسل سے کیا مُراد ہے

یہاں کہا یہ گیا ہے کہ انھوں نے خدا کے رسولوں کو، اور اس کے قوانین کو جھٹلایا۔ (ان کی تکذیب کی) تو وہ تباہ و برباد ہوگئے ــــ یہ جھٹلانا کیا ہے؟ تکذیب کسے کہتے ہیں؟ یہ غور طلب بات ہے۔

حکیم کسی مریض سے کہتا ہے کہ تم دودھ نہ پینا، ورنہ تمھاری حالت خراب ہوجائے گی۔ وہ گھر آتا ہے اور یاروں دوستوں سے کہتا ہے کہ تم نے اس حکیم کی بات سنی۔ کہتا ہے، دودھ مت پینا ورنہ تمھاری حالت خراب ہوجائے گی ــــ پاگل ہوگیا ہے۔ کبھی دودھ سے بھی کسی کی حالت خراب ہوتی ہے؟ یہ کہتا ہے اور غٹا غٹ دودھ کا گلاس انڈیل لیتا ہے ــــ دوسری ہی صبح اس کی شکایت بڑھ جاتی ہے۔

اسے کہتے ہیں **تکذیب** ــــ یعنی سچی بات کو جھٹلانا اور اس کے علی الرغم اس کے خلاف عمل کرنا۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ، اقوامِ سابقہ کی طرف آتے رہے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ جس روش پر تم چل رہے ہو، یہ تمہیں تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں دھکیل دے گی لیکن وہ ان کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا اور اس کے بعد .... اپنی اسی روش پر آگے بڑھتے چلے جاتے اور آخر الامر تباہی کے جہنم میں جا گرتے۔ یہ تھا ان کی **تکذیب** کا نتیجہ۔ ان اقوام کی سرگذشتیں بیان کرنے کے بعد، قرآنِ کریم اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں تم بھی اپنی اپنی روش کا جائزہ لو اور دیکھو کہ یہ راستے بھی بربادیوں کی طرف لے جانے والے تو نہیں۔ اگر یہ راستے ویسے ہی ہوں جیسے راستے ان سابقہ اقوام نے اختیار کئے تھے، تو ان سے اجتناب برتو، ورنہ تمہارا حشر بھی انہی جیسا ہوگا۔ اقوامِ عالم کے فیصلے خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روش پر چل کر ایک قوم تباہ ہوئی تھی، جو قوم جب بھی اور جہاں بھی، اس روش پر چلے گی، اس کا انجام ویسا ہی ہوگا۔ یہ ہے قرآنی فلسفۂ تاریخ۔

ان حقائق کی روشنی میں وہ اپنی مخاطب اقوام سے (جو عہدِ رسالت مآبؐ کی ہوں یا موجودہ زمانے، یا

آنے والے زمانے کی) کہتا ہے کہ تم تاریخی نوشتوں کو سامنے لاؤ اور دیکھو کہ مکذبین کا انجام کیا ہوا؟ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ٥ (۳/۱۳۶)۔ "تم سے پہلے کئی قومیں گذر چکی ہیں۔ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان تکذیب کرنے والوں کا انجام کیا ہوا"۔ (نیز ۶/۱۱؛ ۱۶/۳۶)۔ سورۂ یونس میں مکذبین کی جگہ مُنْذَرِيْنَ (۱۰/۷۳) آیا ہے۔ یعنی وہ جنہیں پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس راستے پر نہ چلنا، تباہ ہو جاؤ گے۔

سورہ انعام میں ہے کہ قوموں کی تباہی ان کے جرائم کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔

کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں جنہیں اس قدر ثروت وسطوت حاصل تھی جو انھیں بھی حاصل نہیں۔ ان پر رزق کی فراوانیوں کی بارش ہوتی تھی اور معاشی خوش حالیوں کی نہریں بہتی تھیں لیکن وہ اپنے جرائم (بِذُنُوْبِهِمْ) کی وجہ سے تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ (۶/۶)۔

ظلم، باعثِ تباہی

ان جرائم کی فہرست طول طویل ہے جن کی وجہ سے قومیں تباہ ہوتی ہیں، لیکن قرآنِ کریم نے، ان میں ظلم کو سرِفہرست رکھا ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۶/۴۵)۔ قوموں کی جڑ ظلم کی وجہ سے کٹتی ہے۔ وہ ان اقوام کی تباہی اور بربادی کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا (۱۸/۵۹)۔ یہ ان قوموں کی بستیوں کے کھنڈرات ہیں جنہوں نے جب ظلم وستم پر کمر باندھ لی تو ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ دوسری جگہ ہے۔

(اگر یہ لوگ تاریخی نوشتوں سے پوچھیں گے تو وہ انھیں بتائیں گے کہ) کتنی ہی بستیاں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہمارے قانونِ مکافات نے اپنی گرفت میں لے کر ہلاک کر دیا۔ یہ اس لئے کہ انھوں نے ظلم وناانصافی کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ ایسی اجڑیں کہ ان کی سربفلک عمارات اوندھی ہو کر گر پڑیں۔ ان کے کنوئیں بے کار ہو کر رہ گئے۔ ان کے مستحکم قلعے کھنڈرات بن گئے۔

کیا یہ لوگ ان علاقوں میں چلے پھرے نہیں کہ (ان اقوامِ گذشتہ کے عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر) ان کے دلوں میں عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت بیدار، اور ان کے کانوں میں بات سننے کی استعداد بروئے کار آئے۔ (بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو) یہ نہیں ہوتا کہ اس کی ماتھے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ وہ تو بدستور بینا ہوتی ہیں لیکن ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں اور اس طرح ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفلوج ہو جاتی ہے۔

(۴۵ - ۴۶ / ۲۲)

قرآنِ کریم نے متعدد اقوامِ سابقہ کی عبرت آموز داستانیں بیان کرنے کے بعد، اسی حقیقت کو دہرایا ہے کہ وَ مَا کُنَّا مُھْلِکِ الْقُرٰٓی اِلَّا وَ اَھْلُھَا ظٰلِمُوْنَ ٥ (۲۸/۵۹)۔ یہ ہوتا ہی نہیں کہ ہم کسی قوم کو تباہ کر دیں بجز اس کے کہ وہ ظالم ہو۔ چونکہ اس مقام پر ان اقوام کی سرگذشتوں کا استقصا مقصود نہیں، اس لئے ہم انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں[1]۔ اس وقت ہم صرف اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ قوموں کا عروج و زوال، ان کے اپنے اعمال سے وابستہ ہے۔ ان کی "تقدیر" لکھی لکھائی نہیں ہوتی۔ وہ اسے خود اپنے ہاتھ سے لکھتی ہیں۔

اجَل یعنی مہلت کا وقفہ

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قانونِ مکافات کی رُو سے، عمل اور اس کے نتیجے کے محسوس طور پر سامنے آنے میں ایک مدت لگتی ہے جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے اجَل کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اجَل موت کو کہتے ہیں لیکن عربی زبان میں اس کے معنی مہلت کے وقفہ کے ہیں۔ چونکہ اقوام کی زندگی دنوں سے نہیں بلکہ صدیوں کے پیمانے سے ماپی جاتی ہے، اس لئے ان کی مہلت کا وقفہ (اجَل) بھی خاصا طویل المیعاد ہوتا ہے۔ یہ جو ہم عام طور پر دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ایک قوم، کمزور اقوام

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے میری کتاب "اسلام کیا ہے" دیکھئے یا جوئے نور۔ برقِ طور۔ شعلۂ مستور جن میں ان تمام اقوام کا تذکرہ ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔

پر ہر طرح کا ظلم و استبداد روا رکھتی ہے وہ سلب و نہب کی روش اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کا نظام' استحصال (EXPLOITATION) پر مبنی ہے۔ دنیا اس کے ہاتھوں تنگ آ رہی ہے لیکن اس کے باوجود' وہ پھلتی پھولتی چلی جا رہی ہے' تو یہ اس لئے کہ یہ اس کی مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (۱۶/۶۱)۔

(اگر ہمارا قانونِ تدریج و امہال کارفرما نہ ہوتا اور) ظلم و استبداد کی بنا پر لوگوں کی گرفت فوراً ہو جایا کرتی تو صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا (انسان) نظر نہ آتا۔ لیکن خدا ایسا نہیں کرتا بلکہ ان کے انجام کو ایک مدت تک کے لئے مؤخر کر دیتا ہے۔ جب یہ مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ان کی تباہی میں نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ ان کے سامنے آ جاتا ہے۔ (نیز ۳۵/۴۵)۔

مہلت کا یہ قانون اس قدر سخت گیر ہے کہ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝ (۲۳/۴۳)۔ کوئی قوم نہ اس وقفہ کو کم کر سکتی ہے نہ اسے بڑھا سکتی ہے۔ اگر کوئی قوم اس مدت کے اندر اندر اپنی اصلاح کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو ہلاک ہو جاتی ہے۔ مہلت کا وقفہ اسی لئے رکھا گیا ہے۔

ہر اجل کے لئے قانون ہے

مہلت کا وقفہ (اجل) بھی ہر قوم کے لئے پہلے سے متعین نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ (مثلاً) ایک قوم برسرِ اقتدار آتی ہے تو اس کے لئے پہلے سے طے ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ دو سال تک برسرِ اقتدار رہے گی۔ اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ قوم لاکھ کچھ کرے' نہ دو سال سے پہلے زوال پذیر ہوگی اور نہ ہی دو سال کے بعد زندہ رہ سکے گی۔ نہیں' ایسا نہیں ہوتا۔ اس مدت کا تعین بھی خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ جب تک یہ قوم اس (صحیح) روش پر چلتی رہے گی' اسے تمکن و سطوت حاصل رہیں گے۔ جب یہ' اس کے خلاف' دوسرے راستے پر گامزن ہو جائے گی' تو یہ قعرِ مذلت میں گر جائیگی

اس حقیقت کے تبیان کے لئے قرآنِ کریم نے اصول یہ بتایا کہ

(۱) لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۱۰/۴۹)۔ ہر قوم کی زندگی کی ایک مدت ہوتی ہے۔ اور

(۲) لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ ہر مدت کے لئے ایک قانون ہوتا ہے۔ جو قوم چاہے، اس قانون کے مطابق، اپنی زندگی کی مدت گھٹا بڑھا لے۔

یہ قانونِ مہلت، کوئی گپت ودیا (باطنی علم) نہیں کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے۔ ایسے قانون کے وضع کرنے سے فائدہ کیا جس کا کسی کو علم ہی نہ ہو سکے۔ قانون کا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ جن کے لئے وہ قانون وضع کیا گیا ہے انھیں معلوم ہو کہ اگر ہم نے اس کے مطابق کام کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اگر اس کے خلاف چلے تو یہ۔ قرآنِ کریم نے اس قانونِ مہلت کو کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۱۵/۴) کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ اس قانون کا ہر ایک کو علم ہو سکتا ہے۔ (قرآنِ کریم میں، قوموں کے عروج و زوال کے قوانین بڑی شرح و بسط سے دیئے گئے ہیں۔ اس لئے یہ قانونِ مہلت کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ہے)۔ یہ "سنت اللہ" ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ (۳۵/۴۳)۔ اسی کو قوموں کا قانونِ استخلاف و استبدال کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ قانون جس کے مطابق عمل کرنے سے ایک قوم کو تمکن حاصل ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اس صلاحیت بخش پروگرام سے اعراض برتتی ہے، تو اس پر زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس وقت بھی سنبھل جائے تو اس کی زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو اس سے سطوت و حکومت چھن جاتی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیتی ہے جس نے اس قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنے اندر سطوت و اقتدار کی صلاحیت پیدا کر لی ہوتی ہے۔ خود جماعتِ مومنین سے، جنہیں ان کے ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجہ میں استخلاف فی الارض حاصل ہوا تھا، (۲۴/۵۵) کہا گیا کہ

> اگر تم جہاد کے لئے رزم گاہِ حیات میں نہیں آؤ گے تو تم پر الم انگیز عذاب مسلط ہو جائیگا۔ اور وہ عذاب یہ ہوگا کہ تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ یہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے ہیں۔ (۹/۳۹، ۱۱/۵۷)

سورۂ محمدؐ میں ہے۔

> تم میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اپنا مال کھلا رکھیں، تو وہ بخل کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص

اس معاملہ میں بخل سے کام لیتا ہے۔ وہ بخل خود اس کے اپنے خلاف جاتا ہے۔ اللہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اپنی زندگی اور بقا کے لئے اس کے محتاج ہو۔ اگر تم زندگی کی صحیح روش سے اعراض برتو گے تو وہ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔ (تم سے بہتر ہو گی)۔ (۴۷/۳۸)۔

اس لئے کہ قوموں کی موت وحیات اور استخلاف، واستبدال کا قانون یہ ہے کہ جو قوم صحیح نظامِ زندگی کی حامل ہو وہ باقی رہتی ہے۔ جو غلط نظام رائج کرے وہ تباہ ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو بہتر نظام کی حامل ہو۔ قوموں کی موت وحیات کے فیصلے، زندگی کے متعلق ان کے نظریات اور عملی نظام کی رُو سے ہوتے ہیں۔ یہی قوموں کے لئے **تقدیرِ الٰہی** (خدا کا قانون) ہے۔

کتاب

ہم دیکھ چکے ہیں، کہ انسانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، اس میں ہر واقعہ خدا کے مقررکردہ قانون کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ مصائب بھی انہی قوانین کے مطابق وارد ہوتی ہیں اور خوشگواریاں بھی انہی کے مطابق ملتی ہیں۔ انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا اختیار وارادہ کہ وہ چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرکے، خوشگواریاں حاصل کرلے اور چاہے ان سے رُوگردانی کرکے، مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے۔

لیکن قرآنِ کریم میں بعض آیات ایسی ہیں جنہیں اگر سطحی نگاہوں سے دیکھا جائے تو انسان کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے، ان آیات کا صحیح (قرآنی) مفہوم واضح کیا جائے۔ مثلاً سورۂ حدید میں ہے۔

مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا..... (۵۷/۲۲)۔

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں یا تمہاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس سے
کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

یا مثلاً سورۂ توبہ میں ہے کہ

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا..... (۹/۵۱)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

تو کہہ دے کہ ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی کچھ جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔ (ایضاً)

یہ، اور اس قسم کی دیگر آیات سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دنیا میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے۔ (اس کا تعلق انسانوں کی انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی سے) وہ پہلے سے لکھا ہوتا ہے اور اسی کے مطابق دنیا میں رونما ہوتا ہے۔ اس سے "نوشتۂ تقدیر" اور "قسمت کا لکھا" جیسی اصطلاحات رواج پذیر ہوگئیں اور اس کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ عام ہوگیا کہ ہر شخص کی پیدائش سے پہلے اس کی قسمت خدا کے ہاں لکھی جاتی ہے اور پھر سب کچھ اسی کے مطابق واقع ہوتا رہتا ہے۔ نہ اس نوشتہ کو مٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے بس میں ہے کہ قسمت کے لکھے کو ٹال سکے۔ خدا کو "کاتبِ تقدیر" بھی اسی عقیدہ کی رُو سے تصور کیا جاتا ہے۔

آئیے ہم دیکھیں کہ ان آیات کا قرآنی مفہوم کیا ہے۔

عربوں کے ہاں جب منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کر دی جاتی تھی تو اسے **کتاب** کہا جاتا تھا۔ کتاب کی آج بھی یہی شکل ہے۔ (ضمناً) قرآنِ کریم کے شروع ہی میں جو اسے " ذٰلِكَ الْكِتَابُ" کہا گیا ہے تو اس سے واضح ہے کہ یہ خود رسول اللہؐ کی زندگی میں، شیرازہ بند کتابی شکل میں موجود تھا۔ یہ روایات کہ قرآنِ مجید کو کتابی شکل میں بعد میں مرتب کیا گیا تھا، قرآنی شہادات کے خلاف ہیں۔ جس شکل میں قرآنِ مجید آج ہمارے پاس ہے، یہ اسی شکل میں خود حضور رسالتمآبؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدون و مرتب ہو چکا تھا۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے۔

لیکن، مادہ (ک۔ ت۔ ب) جس سے کتاب کا لفظ وضع ہوا ہے، کے بنیادی معنوں میں، 'قانون' یا جو کچھ از رُوئے قانون کسی پر واجب قرار دیا گیا ہو، بھی شامل ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ متعدد مقامات پر انہی معانی میں آیا ہے۔ مثلاً۔

(۱) سورۂ نساء میں ان رشتوں کی فہرست دینے کے بعد، جن سے نکاح حرام ہے، کہا گیا ہے، کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ (۴/۲۴)۔ مولانا محمود الحسنؒ اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ "حکم ہوا اللہ کا تم پر" یعنی ان کے نزدیک یہاں کتاب کے معنی حکم کے ہیں۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا۔ اس کی جگہ عام طور پر "حُکم" کا لفظ آیا ہے۔ حُکم کے معنی فیصلہ کے ہوتے ہیں اور جو فیصلہ یا حکم، مستقل اور غیر متبدل ہو، اسے قانون کہا جاتا ہے۔ مثلاً حکومت کا یہ فیصلہ کہ ٹریفک کو بائیں طرف چلنا چاہیئے، ملکی قانون کہلاتا ہے کیونکہ یہ حکم ایک بار کا نہیں، مستقل اور ہمہ گیر ہے۔ اسی طرح خدا کا یہ فیصلہ کہ آگ حرارت پہنچاتی ہے، وقتی فیصلہ نہیں، مستقل اور غیر متبدل ہے، اس لئے اس نے قانون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہی صورت قرآن کے احکامات کی ہے کیونکہ وہ مستقل بھی ہیں، اور غیر متبدل بھی۔ بنابریں، مذکورہ بالا آیت میں "کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ" کے معنی ہوں گے، یہ تمہارے لئے خدا کا قانون ہے۔

(۲) سورۂ بقرہ میں مطلّقہ عورتوں سے نکاح کے سلسلہ میں کہا گیا ہے۔ وَ لَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ (۲/۲۳۵)۔ مولانا محمود الحسن اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ "اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدّتِ مقررہ اپنی انتہا کو"۔ یہاں کتاب کا ترجمہ مقررہ (عدّت) کیا گیا ہے۔ یعنی وہ عدّت جسے خدا نے مقرر کیا ہے۔ اسے حکم یا قانون کہا جائے گا۔

(۳) اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتۡ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا ○ (۴/۱۰۳) صلوٰۃ، مومنین پر ایک موقت فریضہ ہے۔

(۴) قرآنِ کریم کے متعلق ہے۔ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (۹۸/۳)۔ اس میں محکم قوانین ہیں۔

(۵) کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ (۲/۱۷۸)۔ تم پر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے۔

(۶) کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے ہیں۔

(۷) کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ (۲/۲۱۶)۔ تم پر جنگ فرض قرار دی گئی ہے۔

(۸) سورۂ نساء میں یَتٰمَی النِّسَآءِ کے متعلق ہے کہ لَا تُؤۡتُوۡنَہُنَّ مَا کُتِبَ لَہُنَّ (۴/۱۲۷)۔ جو کچھ ان کے لئے قانون کی رُو سے مقرر کیا گیا ہے تم انہیں وہ نہیں دیتے۔

(۹) وَ لَقَدۡ کَتَبۡنَا فِی الزَّبُوۡرِ مِنۡۢ بَعۡدِ الذِّکۡرِ اَنَّ الۡاَرۡضَ یَرِثُہَا

عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ٥ (۲۱/۱۰۵)۔ ہم نے زبور میں، اخلاقی نصائح کے بعد، یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث وہ بندے ہوں گے جن میں وراثتِ ارض کی صلاحیت ہوگی۔ یہاں کتاب کے معنی بالکل واضح ہیں۔ خدا کا یہ قانون ہے کہ تمکّن (حکومت) اس قوم کو ملتی ہے جو جہاں بانی کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ صلاحیت کی بنا پر مملکت حاصل کی جائے گی تو وہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگی۔ دھاندلی سے حاصل کی جائے گی (یا کسی نااہل قوم کو ویسے ہی مل جائے گی)، تو وہ خلافِ قانونِ خداوندی ہوگی۔

(۱۰) قوموں کے اعمال نامہ کو بھی ان کی کتاب کہا گیا ہے۔ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰىٓ اِلٰى كِتٰبِهَا (۴۵/۲۸)۔ ہر قوم کو اس کے اعمال نامہ کی طرف بلایا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵/۲۸)۔ جو کچھ تم کرتے تھے آج تمہیں اس کا بدلہ ملے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوگا۔ اسے خدا نے خود اپنی "کتاب" کہہ کر پکارا ہے هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۴۵/۲۹)۔ ہماری کتاب، جو کچھ تمہارے خلاف کہتی ہے، وہ حق ہوتا ہے (نیز ۲۰/۵۲)۔

صحیفۂ فطرت

(۱۱) سورۂ انعام میں ہے کہ بحر و بر میں جو کچھ ہے خدا کو اس کا علم ہے۔ جو پتہ بھی کسی درخت سے گرتا ہے، خدا کو اس کا بھی علم ہوتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہو، غرضیکہ رطب و یابس، خشک و تر، جو کچھ بھی ہے، وہ سب کتابِ مبین میں ہے۔ (۶/۵۹)۔ ظاہر ہے کہ یہاں کتابِ مبین سے مراد صحیفۂ فطرت ہے۔ یعنی خارجی کائنات میں پھیلی ہوئی اشیاء سے متعلق قوانین۔ انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔

(۱۲) سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ قرآن کا ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جو متعیّن الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ انھیں مُحْكَمٰتٌ کہا جاتا ہے اور ایک حصہ بسیط حقائق سے متعلق ہے جنھیں تشبیہات کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ مُحْكَمٰتٌ کے متعلق کہا کہ وہ اُمُّ الْكِتٰبِ ہیں، (۳/۶) یعنی قانون کی اصل و بنیاد۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ کائنات سے متعلق قوانین، خدا کے عالمِ امر میں مدوّن ہوتے ہیں اور وہ بروئے کار عالمِ خلق میں آتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا کہ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳/۳۹)۔ یعنی قوانین کی اصل و اساس، ان کا سرچشمہ خدا کے ہاں ہے، یعنی عالمِ امر میں۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق کہا کہ وہ عربی زبان کے حروف و نقوش میں

تو تمہارے پاس ہے لیکن وَ اِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَکِیْمٌ (۴۳/۴)۔" وہ ہمارے پاس اُمّ الکتاب میں ہے۔"

اُمّ الکتاب' یا عالمِ امر' سے مراد علمِ خداوندی ہے جس سے باہر کوئی شے نہیں۔ سورۂ حج میں ہے اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ (۲۲/۷۰)۔ کیا تم نہیں جانتے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا کو اس سب کا علم ہے۔ یہ سب" کتاب میں ہے۔" دوسری جگہ اسے "کتابِ مبین" کہا گیا ہے۔ (۲۷/۷۵)۔

کائنات میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے وہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اپنی آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان اوّلیں مراحل کو" مُسْتَوْدَعٌ" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ سفر جس میں پچھلی منزل' اپنے "مسافر" کو اگلی منزل کے سپرد کر دیتی ہے اور جب وہ آخری منزل میں پہنچ جاتا ہے تو اسے اس کا "مستقر" کہا گیا ہے۔ یعنی اس کی جائے قرار۔ سورۂ قمر میں ہے۔ وَ کُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ (۵۴/۳)۔ ہر امر (معاملہ) ایک مستقر ہے۔ دوسری جگہ ہے لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (۶/۶۷)۔ ہر خبر کا ایک مستقر ہے۔ اور سورۂ ہودؔ میں ہے یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا۔ کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ٥ (۱۱/۶)۔ خدا کو ہر شے کے مستودع کا بھی علم ہوتا ہے اور مستقر کا بھی۔ یہ سب' کتابِ مبین' میں ہوتے ہیں۔

مستودع کے مراحل اور مستقر

کسی واقعہ کا مستقر تو وہ ہے جہاں وہ محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اب رہے اس کے مستودع کے مراحل' تو ان میں سے بعض مراحل کا تعلق عالمِ امر سے ہوگا۔ اس کے بعد جب یہ "امر" عالمِ خلق کی منزل میں آئے گا تو وہ قانونِ اسباب و علل کے تابع آجائے گا۔ اس میں انسان کو اس کے مستودع کے مراحل کا علم' اس کی علمی سطح کے مطابق ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی معاملہ کے مستودع کے ایسے مراحل ہوں جو ہنوز انسانی معلومات کے دائرے میں نہ آسکے ہیں۔ اس کے بعد' جب انسانی انکشافات مزید ترقی کرتے جائیں تو وہ علّت و معلول کی ان کڑیوں کو بھی معلوم کرلے جو ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں۔

انسانی عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آجانے کا درمیانی عرصہ بھی (جسے مہلت کا وقفہ کہا گیا ہے) دراصل مستودع کی منازل ہیں جو انسان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ وہ اس نتیجہ کو اس وقت دیکھ سکتا ہے جب وہ محسوس شکل میں اس کے سامنے آتا ہے۔ یہ اس کا مستقر ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، انسان کے ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہوجاتا ہے لیکن اسے اسکا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ محسوس و مرئی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے۔ وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّ اَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ان کے ظلم واستبداد کی وجہ سے ہلاک کردیا اور ان کی جگہ دوسری قوم اُبھر آئی۔ وہ اپنی ظلم وستم کی روش پر چلے جا رہے تھے اور چونکہ اس سے ان کا بال تک بیکا نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ انھیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ لیکن درحقیقت یہ وہ عرصہ تھا جس میں ان کے اعمال غیر محسوس طور پر اپنے نتائج مرتب کرتے اور مستقر کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ○ (۱۱-۱۲/۲۱)۔ جب ہمارا عذاب محسوس شکل میں ان کے سامنے آگیا تو اس سے بچنے کے لئے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں آواز دی کہ اب تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ تم رکو، اور واپس چلو اپنی انہیں عشرت گاہوں کی طرف جن میں تم دوسروں کی کمائی پر گلچھرے اڑاتے تھے۔ چلو وہیں، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کس کی کمائی تھی جس سے تم اس طرح اپنی عیش سامانیاں خریدتے تھے۔ اس وقت وہ ہزار چیخے چلائیں گے۔ لیکن ان کی چیخ و پکار ان کے کسی کام نہیں آئے گی۔ انہیں ایسا کردیا جائے گا جیسے کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا شعلہ۔ (۱۳-۱۵/۲۱)

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خدا نے ہر امر کے مستودع اور مستقر کے متعلق کہا ہے کہ وہ "کتابِ مبین" میں ہوتا ہے۔ (۱۱/۶)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ:۔

(۱) "کتاب" سے مراد قانون یا ضابطۂ قوانین ہے۔

(۲) تمام قوانین عالمِ امر میں طے پاتے اور مدوّن ہوتے ہیں۔ اس مرحلہ میں اسے "کتاب اللہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی علمِ خداوندی ـــــ اور

(۳) عالمِ خلق میں یہی قوانین، قوانینِ فطرت اور قرآنِ کریم کی شکل میں سامنے آتے ہیں، انہیں کتاب اللہ ہی کہا جاتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ان قوانین کا علم، انسان حاصل کرسکتا ہے کیونکہ یہ کتاب مبین یا کتابِ معلوم ہے۔

ان تصریحات کے بعد آپ ان آیات کی طرف آیئے، جنھیں پہلے درج کیا جاچکا ہے اور جنکی وضاحت کے لئے "کتاب" کا قرآنی مفہوم سامنے لایا گیا ہے۔ سب سے پہلے سورۂ حدید کی ان آیات کو لیجیئے جن سے سطح بیں حضرات ان کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، الجھن میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ آیات یہ ہیں۔

مسئلۂ تقدیر کے سلسلہ میں اہم آیات

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝

مولانا محمود الحسنؒ نے ان آیات کا یہ ترجمہ کیا ہے۔

کوئی آفت نہیں پڑتی ملک میں اور نہ تمھاری جانوں میں جو لکھی نہ ہو ایک کتاب میں پہلے اس کے کہ پیدا کریں ہم اس کو دنیا میں۔ بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔ تاکہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور شیخی نہ کیا کرو اس پر جو اس نے تم کو دیا اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا، بڑائی مارنے والا۔

اور اس سے اس نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے کہ ہر آنے والی مصیبت پہلے سے مقدر ہوتی ہے۔ اسے کاتبِ تقدیر نے ہر ایک کی قسمت میں پہلے ہی سے لکھ رکھا ہوتا ہے اور انسان کچھ بھی کیوں نہ کرے، وہ آکر رہتی ہے۔ اور جب حقیقت یہ ہے کہ انسان جو جی میں آئے کرلے، آنے والی مصیبت، ٹل ہی نہیں سکتی، تو اس پر رونا رلانا کیسا۔ انسان کو صبر شکر کرکے بیٹھ رہنا چاہیئے۔ اس کو 'راضی برضا' کہتے ہیں جو خدا کے نیک بندوں کی علامت ہے۔ اسی طرح، انسان کو اگر خوشحالیاں میسر آئیں تو اس پر بھی اُسے اترانا نہیں چاہیئے کیونکہ وہ بھی اس کی اپنی کاریگری اور ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہوتیں۔ اس کی قسمت میں لکھی ہوتی ہیں اس لئے اُسے

مل جاتی ہیں۔ اس میں اس کی کاریگری کیا جس پر یہ ناز کرے!

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ ان آیات کے اس مفہوم کی رُو سے، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت، جو دین کی اصل و اساس ہے، دھڑام سے نیچے آگرتی ہے ـــ خدا کے یہ ارشادات کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔ ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ خدا، نہ بلاوجہ کسی کو ذلیل کرتا ہے، نہ یوں ہی اپنے نعماء کے خزانے لٹا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کی اپنی سعی و کاوش کے نتیجہ میں ہوتا ہے ـــ یہ اور اس قسم کے دیگر سینکڑوں ارشاداتِ خداوندی (معاذ اللہ) جھوٹے قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا، اس بنیادی دلیل کی رُو سے ہی، ان آیات کا یہ مفہوم درست قرار نہیں پاتا! اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے

قرآن میں کوئی اختلافی بات نہیں

کہ خدا نے، قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲)۔ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے ایک طرف تو یہ کہا ہے کہ ہر مصیبت انسان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری جگہ یہ کہا ہے کہ ہر مصیبت پہلے سے مقدر ہوتی ہے جس میں انسان کو کوئی دخل نہیں ہوتا، تو اس سے بڑھ کر تضاد اور اختلاف کیا ہو گا؟ لہٰذا، ان آیات کا کوئی ایسا مفہوم، جو قرآن کی دیگر آیات سے مختلف ہو، صحیح قرار نہیں پا سکتا۔ اب دیکھئے کہ ان آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

"کتاب" کے معنی آپ دیکھ چکے ہیں ـــ یعنی قانونِ خداوندی ـــ ان معانی کی روشنی میں، آیت (۵۷/۲۲) کا مفہوم یہ ہوا کہ خارجی کائنات (فی الارض) یا خود انسانی دنیا (فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ) میں جو واقعہ بھی رونما ہوتا ہے اس کے لئے پہلے سے ایک قانون مقرر ہوتا ہے۔ خارجی کائنات کے حوادث اور انسانی زندگی کی مشکلات و مصائب، سب خدا کے مقرر کردہ قانونِ اسباب و علل کے مطابق ظہور میں آتی ہیں اور یہ بات خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ وہ اس قسم کے قوانین متعین کر دیتا۔

اس کے ساتھ ہی اسے بھی سمجھ لیجئے کہ جہاں، تکالیف اس کے مقرر کردہ قانون کے مطابق واقع ہوتی ہیں، اس کے ساتھ ہی اس نے ایسے قوانین بھی بنا دیئے ہیں جن کے مطابق عمل کرنے سے، ان تکالیف کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگر قانون یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے، شدید تکلیف ہوتی ہے، تو اس کے ساتھ ہی اس نے یہ قانون بھی بنا دیا ہے کہ جلی ہوئی انگلی پر فلاں مرہم لگاؤ گے تو تکلیف

جاتی رہے گی۔ لہذا، اگر کسی قانون کی خلاف ورزی سے نقصان پہنچتا ہے تو اس میں مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے ایسا قانون بھی بنا دیا ہے، جس سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر ∴ خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر

اگر تمہیں، خدا کی ایک تقدیر (قانون) کے مطابق نقصان پہنچا ہے، تو (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) اُس تقدیر سے خدا کی دوسری تقدیر کی طرف چلے جاؤ۔ لہذا، حوادث و مصائب پر آنسو بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے سامنے دوسرا راستہ کھُلا ہے۔ اس پر چل نکلو۔ اس سے تلافیٔ مافات ہو جائے گی۔ مایوس تو وہ ہو جسے، یا تو اس کا علم ہی نہ ہو کہ ایسا کیوں ہوا ہے یا، وہ کسی جابر و مستبد حکمران کیطرف سے ہو جس کے خلاف انسان کو دم مارنے کی مجال نہ ہو۔ اس لئے وہ سوائے اس کے کہ "صبر و شکر" کر کے بیٹھ جائے، اور کیا کر سکتا ہے۔ یاد رکھو! مایوسیاں اور مجبوریاں ایسے نظام میں ہوتی ہیں، جہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہ ہو۔ جہاں یہ کیفیت ہو کہ " مزاج شاہاں! — گاہ بہ سلامے بہ رنجند، و گاہ بہ دشنامے خلعت بہ بخشند" — شاہانہ مزاج کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جی چاہا تو سلام کرنیوالے کو حوالۂ دار و رسن کر دیا اور کبھی موج میں آئے تو گالی دینے والے کو گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ ایسے نظام میں تو واقعی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ انسان، ہر مصیبت پر" مایوس و مرجوم" سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن خدا کی بادشاہت میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے اور ہر نقصان کی تلافی کی راہیں کھلی ہیں — وہاں نہ ظلم ہے نہ دھاندلی، نہ لاقانونیت ہے نہ "مزاجِ شاہاں" والی بات۔ لہذا، ایسے حاکم کی مملکت میں، کسی نقصان پر مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟ نقصان ہوا ہے تو دیکھو کہ اس کی وجہ کیا ہے اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس کی تلافی کے لئے اس نے کیا تدابیر تجویز کر رکھی ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو، نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر کسی کو خوشحالی میسر آئی ہے تو وہ بھی یہ نہ سمجھے کہ چونکہ میں بادشاہ کا مصاحب ہوں، اس لئے اس نے خوش ہو کر مجھے یہ انعام دیا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی مملکت میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں انعامات بھی، انسان کے اپنے ہی اعمالِ حسنہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

یہ ہے ان آیات کا صحیح مفہوم۔

(۲) سورۂ انفال میں ہے کہ ایک جنگ میں ایسا ہوا کہ دشمن کو شکستِ فاش دینے کے بجائے اس کے بہت سے آدمیوں کو گرفتار کر لیا تاکہ ان کا زرِ فدیہ وصول کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ دین کے مقصد کے مطابق نہیں تھا۔ لیکن چونکہ یہ محض ایک تدبیری غلطی تھی اور نادانستہ سہو، اس لئے اس پر جماعتِ مومنین کے لئے صرف معمولی سی سرزنش کو کافی سمجھا گیا۔ اس سلسلہ میں کہا کہ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (۸/۶۸)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ـــــ "اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب" ـــــ (مولانا محمود الحسنؒ)۔ اس کا صحیح مفہوم واضح ہے۔ "كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ" سے یہاں مراد اللہ کا وہ قانون ہے جو قرآن میں مذکور ہے۔ یعنی یہ قانون کہ جو غلطی سہو وخطا کی وجہ سے سرزد ہو، اس سے درگذر کیا جا سکتا ہے ـــــ لہٰذا آیتِ زیرِ نظر کا مفہوم یہ ہے کہ جو کچھ تم لوگوں نے کیا تھا، وہ جُرم تو ایسا تھا جس کی تمہیں سزا ملنی چاہیئے تھی، لیکن چونکہ قرآنِ کریم میں پہلے سے یہ قانون دیدیا گیا ہے کہ سہو وخطا پر سرزنش کافی ہوتی ہے، اس لئے تمہیں سزا نہیں دی جاتی۔

(۳) سورۂ توبہ میں ہے کہ ان منافقین کی یہ حالت ہے کہ اگر حالات تمہارے سازگار ہوتے ہیں، تو یہ بات ان پر بڑی گراں گذرتی ہے (کہ تمہیں خوشحالیاں کیوں میسر آگئیں)۔ لیکن اگر حالات ناسازگار ہو جائیں اور تمہیں تکالیف (مصائب) کا سامنا ہو، تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے تم سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے پہلے ہی ایسی احتیاط برت لی تھی کہ ان کے ساتھ ہم بھی مصیبتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (۹/۵۱)۔

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ـــــ "تو کہہ دے، ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا، مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔ وہی ہے کارساز ہمارا۔ اور اللہ ہی پر چاہیئے کہ بھروسہ کریں مسلمان" (مولانا محمود الحسنؒ) اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ہمیں جو واقعات بھی درپیش آتے ہیں، ان میں نہ تمہاری خوش فہمیوں کا کوئی دخل ہوتا ہے، نہ بددعاؤں کا کوئی واسطہ۔ یہاں ہر بات خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ لہٰذا، ہم جن حوادث سے دوچار ہوتے ہیں وہ وہی ہوتے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا اس

قانون کی رُو سے لازم ہے اور وہ قانون ایسا محکم اور غیر متبدل ہے کہ اس کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا ہم اس کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں' اس لئے تمہاری اس قسم کی باتیں ہم پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔
مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ خدا نے ہمارے مقدر میں پہلے سے لکھ رکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ــــ جو قانون خدا نے ہمارے لئے مقرر کر رکھا ہے ــــ جیسے وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ (۲/۱۸۷)۔ جس بات کی تمہیں از روئے قانونِ خداوندی اجازت دی گئی ہے اس کے حصول کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں " مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ " کے یہ معنی کئے جائیں کہ جو کچھ خدا نے تمہارے لئے مقدر کر دیا (لکھ دیا ہے)۔ تو اس کے ساتھ وَابْتَغُوْا کا حکم بے معنی ہو جاتا ہے۔ جو کچھ خدا نے پہلے ہی مقرر کر دیا ہے' اس کے حصول کے لئے کوشش کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو بہر صورت مل کر رہے گا لیکن جس بات کے لئے قانون مقرر کر دیا ہو' اس کی طلب و حصول کے لئے کوشش ضروری ہو گی۔ جیسے دوسری جگہ ہے۔

کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (۵۸/۲۱)

خدا نے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول غالب آ کر رہیں گے۔ اس غلبہ کے لئے رسولوں کو جس قدر صبر آزما جدوجہد کرنی پڑتی تھی، اس کی تفاصیل سے قرآن کے صفحات درخشاں ہیں۔

سورۂ اعراف میں ہے کہ قومِ حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ " ہمارے لئے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی لکھ دے " اور آخرت کی بھی"۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ..... (۷/۱۵۶)۔ یہ خوشگواریاں ان کے لئے "لکھی جاتی ہیں،" جو تقویٰ شعار ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ' کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ خدا نے پہلے سے لکھ رکھا ہے، خدا نے پہلے سے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، اس کے بعد افراد اور اقوام کا نامۂ اعمال ان قوانین کے مطابق ساتھ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اسی کے مطابق' انہیں خوشگواریاں بھی ملتی ہیں اور مصائب بھی۔

باذنِ اللہ

ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا۔ قرآنِ کریم میں اس مضمون کی تو کوئی آیت نہیں، البتہ اس قسم کی آیات ضرور ہیں جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۶۴/۱۱)۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کا مفہوم یہی ہو تو پھر جس قدر آیات گذشتہ صفحات میں لکھی جا چکی ہیں، ان سب کی تردید ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں زیادہ نہیں تو کم از کم اس ایک آیت کو دوبارہ سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (۴۲/۳۰)

تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔

اور پھر دیکھئے کہ (اگر آیت ۶۴/۱۱ کا مفہوم یہ لیا جائے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے وہ خدا کے حکم سے آتی ہے تو) ان دونوں آیتوں میں کھلا ہوا تضاد ہو گا اور اس کے ساتھ قرآن کے اس دعوے کو دیکھئے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔

آیت (۴۲/۳۰) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا کوئی اور ترجمہ ہو نہیں سکتا۔ وہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ لہٰذا، ظاہر ہے کہ آیت (۶۴/۱۱) میں "باذن اللہ" کا مفہوم کچھ اور ہو گا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ باذن اللہ کے معنی کیا ہیں۔

اِذن کے معنی

اِذْنٌ کے بنیادی معنی اعلان کے ہیں۔ اَذان۔ مؤذّن اسی سے ہیں۔ نیز اس کے معنی اجازت کے بھی ہیں۔

اور علم کے بھی۔ اِذن اللہ کے معنی "خدا کا علم" بھی ہیں۔ صاحبِ مفردات (امام راغب اصفہانی) نے کہا ہے کہ اذن اور علم میں فرق یہ ہے کہ اذن وہیں بولا جاتا ہے جہاں صاحبِ علم کا ارادہ اور مشیّت بھی اس میں شامل ہو۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب خدا کا علم اور ارادہ (اَمر) عالمِ خلق میں کارفرما ہوتا ہے تو وہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور، جیسا کہ ہم "حُکم" کے متعلق لکھ چکے ہیں، کہ جب ایک حکم مستقل طور پر دے دیا جائے اور وہ غیر متبدّل ہو، تو وہ قانون بن جاتا ہے۔ یہی

کیفیت اجازت کی ہے، جب کسی بات کی اجازت مستقل طور پر دے دی جائے تو وہ، ہماری اصطلاح میں قانون کہلائے گی۔ قرآنِ کریم میں اِذنِ اللہ کی اصطلاح انہی معانی میں آئی ہے۔ مثلاً

(۱) سورۂ حج میں ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (۲۲/۳۹)۔ جن لوگوں پر مظالم توڑے گئے ہیں اور ان مظالم کی انتہا یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ وہاں (مکہ) سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے ہیں لیکن مخالفین نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ایک لشکرِ جرار لے کر، ان پر حملہ آور ہو رہے ہیں، تو اب ان لوگوں کو بھی اجازت (اذن) دی جاتی ہے کہ یہ ان کے خلاف لڑیں۔

ظاہر ہے کہ جنگ کی یہ اجازت نہ صرف اُنہی لوگوں کے لئے تھی اور نہ ہی وقتی، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب اور جہاں بھی ایسے حالات پیدا ہوں تو مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہوگی۔ یعنی یہ اجازت وقتی نہیں بلکہ (ان حالات سے مشروط) مستقل تھی۔ بالفاظِ دیگر، صورت یہ نہیں ہوگی کہ جب اس قسم کے حالات پیدا ہوں تو مسلمان خدا سے درخواست کریں اور اس کی طرف سے اجازت ملے تو پھر وہ تلوار اٹھائیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب جماعتِ مومنین نے (جنگِ خیبر میں) یہودیوں کے خلاف جنگ کی اور ان کے کھجوروں کے ان درختوں کو کاٹا جو لڑائی کی راہ میں مزاحم ہو رہے تھے تو قرآن نے کہا کہ تم نے یہ کچھ باذن اللہ کیا تھا (۵۹/۵)۔ حالانکہ قرآن میں، ان کے اس وقت ایسا کرنے کے لئے کسی الگ اجازت (اذن) کا کہیں ذکر نہیں۔

قانونِ زراعت

(۲) زراعت کے متعلق واضح طبیعی قوانین موجود ہیں۔ زمین ایسی ہو جس میں پیداوار کی صلاحیت ہو۔ یعنی وہ زرخیز ہو اور اس میں قاعدے کے مطابق کھیتی کی جائے تو اس سے فصل اچھی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں ہے وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ (۷/۵۸)۔ زرخیز زمین، اپنے رب کے اذن سے اچھی فصل دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں اذن کے معنی زراعت سے متعلق قوانین ہیں، جن میں زمین کے زرخیز ہونے کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

بارش کے متعلق قانون

(۳) بارش کے متعلق یہ حقیقت واضح ہے کہ وہ خاص قانونِ طبیعی کے مطابق برستی ہے۔ (اس قانون کا علم حاصل کر لینے کا نتیجہ ہے کہ اب انسان مصنوعی بارش برسانے کے قابل بھی ہو گیا ہے)۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ

کیا یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے خدا نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے اور کشتیاں سمندر میں کس طرح اس کے امر کے مطابق تیرتی رہتی ہیں وَ یُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط (۲۲/۶۵)۔ اور وہ بادلوں کو فضا میں معلق رکھتا ہے کہ وہ اس کے اذن کے بغیر زمین پر نہ برسیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اذن سے مراد خدا کا وہ قانون ہے جس کے مطابق فضا میں تیرنے پھرنے والے بخارات (بادل) خاص درجہ کی ٹھنڈک سے پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور چونکہ پانی، ہوا سے بھاری ہوتا ہے، اس لئے وہ فضا میں معلق رہنے کے بجائے زمین پر گر جاتے ہیں۔ اسی کو بارش کہتے ہیں۔ لہٰذا جب کہا جائے گا کہ بارش باذن اللہ سے برستی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق برستی ہے۔

(۴) قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جنگ) کرنے والے مجاہدین وہ تھے جنہوں نے اپنی جانیں خدا کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھیں۔ ان کا مقصدِ حیات حق و صداقت کا بول بالا کرنا تھا خواہ اس کے لئے انہیں جان تک بھی کیوں نہ دے دینی پڑے۔ یہی وہ بلند مقاصد اور مقدس جذبات تھے جن کی بنا پر وہ میدانِ جنگ میں چٹان کی طرح ثبات و استقلال سے جمے رہتے تھے۔ ان کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے کہا گیا کہ یہ مجاہدین اپنے سے دس گنا مخالفین پر بھی غالب آجائیں گے — اور اگر ان کے ہاں سازوسامان کی کمی ہوگی تو بھی یہ اپنے سے دس گنی تعداد پر يَغْلِبُوْا......... بِاِذْنِ اللّٰهِ (۸/۶۶)۔ خدا کے اذن سے غالب آجائیں گے۔ یہ "اذن اللہ" اس کے سوا کیا ہے کہ جب تم میں یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں گی تو تم اپنے سے دگنی تعداد پر بھی غالب آجاؤ گے — اور جب، اور جہاں بھی ایسی صورت پیدا ہوگی، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا۔ اس کو قانون کہتے ہیں۔ یہی وہ قانون ہے جس کے مطابق کہا کہ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (۲/۲۴۹)۔ قلیل التعداد جماعت، کثیر التعداد مخالفین پر غالب آجاتی ہے۔ یہاں بھی بِاِذْنِ اللّٰه کا مفہوم واضح ہے اور آیت کے آخر میں وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ نے بات اور بھی واضح کر دی ہے کہ خدا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ثبات و استقلال سے کام لیتے ہیں۔

اس آیت سے آگے ہے کہ (حضرت) طالوت کا لشکر جب جالوت کے مقابلہ کے لئے نکلا تو انہوں نے دعا کی کہ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ

الْکٰفِرِیْنَ ○ (۲/۲۵۰)۔ بارِالٰہا! ہم پر ثبات و استقامت کے جام لنڈا دے تاکہ میدانِ جنگ میں ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے اور اس طرح ہمیں مخالفین پر غلبہ اور کامرانی عطا کر دے۔ اس کے بعد ہے۔ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲/۲۵۱)۔ اس لشکر نے جالوت کے لشکر کو اذنِ خداوندی کی رو سے شکست فاش دی۔ یہاں سے اذن اللہ کا مفہوم اور بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

(۵) کفر و ایمان کے متعلق قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ (۱) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)۔ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ اور (۲) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ خدا کی طرف سے حق و صداقت پر مبنی تعلیم تمہارے سامنے نکھر کر

ایمان لانے کا قانون

آگئی ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے اسے اختیار کرلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

ایک مشفق دوست کی طرح رسول اللہ کی دلی آرزو تھی کہ لوگ اپنی غلط روش کو چھوڑ کر تباہی سے بچ جائیں۔ آپ کی یہ مقدس آرزو اس قدر شدت اختیار کر جاتی تھی کہ خدا کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ اس سلسلہ میں سورۂ یونس میں آپ سے کہا گیا کہ اگر خدا چاہتا کہ نوعِ انسان طوعاً و کرہاً ایک ہی راستے پر چلے، تو اس کے لئے ایسا کرنا کیا مشکل تھا۔ وہ انہیں، (حیوانات کی طرح) اختیار و ارادہ سے عاری، مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو انتخاب و اختیار کی صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ جو راستہ چاہے برضا و رغبت خود اختیار کرے۔ اس باب میں یہ ہمارا قانون ہے اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹)۔ لیکن تو چاہتا ہے کہ لوگوں کو مجبوراً مومن بنا دے۔ یاد رکھو۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۰/۱۰۰)۔ کوئی شخص بھی خدا کے اِذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا۔

اگر یہاں اذن کے معنی حکم یا اجازت لئے جائیں (یعنی یہ کہا جائے کہ کوئی شخص خدا کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا)۔ تو نہ صرف یہ کہ یہ چیز اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ (کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا) کے خلاف ہوگی ـــــ کیونکہ جب صورت یہ ہو کہ ایمان مشروط ہو جائے خدا کے حکم یا اجازت سے، تو انسان مجبور قرار پا جائے گا۔ بلکہ یہ قرآن کی ساری تعلیم کے خلاف ہوگا ـــــ اس لئے یہاں

اِذن اللہ سے مراد خدا کا مقرر کردہ قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر و اکراہ نہیں۔ جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔ اب رہی یہ بات کہ انسان اپنا اختیار و ارادہ صحیح طور پر کس طرح استعمال کر سکتا ہے تو اس کے لئے آیت کے اگلے حصّہ میں یہ کہہ کر بات واضح کر دی کہ وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ o (۱۰/۱۰۰)۔ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر بات واضح نہیں ہوتی۔ وہ (CONFUSED) رہتے ہیں۔ لہٰذا اِذن اللہ (خدا کا قانون) یہ ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے لئے راستے کا انتخاب کریں۔

(۶) سورۂ مجادلہ میں ہے کہ یہ مخالفین اور منافقین جو خفیہ مشورے اور سازشیں کرتے رہتے ہیں، تو شیطان[1] انہیں ایسا کرنے پر اکساتا رہتا ہے۔ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتِ مومنین کو افسردہ خاطر کرے۔ لیکن اسے (اور سب کو) معلوم ہونا چاہیئے کہ وَ لَیْسَ بِضَآرِّهِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۱۰/۵۸)۔ شیطان، اذنِ خداوندی کے بغیر انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا — اگر یہاں اذن اللہ کے معنی خدا کا حکم یا اجازت کئے جائیں، تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ شیطان بھی جو کچھ کرتا ہے وہ خدا کے حکم یا اجازت سے کرتا ہے۔ اس سے شیطان کا سارا تصوّر ہی الٹ جاتا ہے، اس لئے کہ اس کی تو سرشت (مستقل خصوصیت) یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کے حکم سے سرکشی اختیار کرتا اور سرتابی برتتا ہے۔ بنابریں، یہاں بھی اِذن اللہ کے معنی قانونِ خداوندی ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ مخالفین جو سازشیں اور خفیہ مشورے کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد جماعتِ مومنین کی ایذا رسانی ہے لیکن تمہیں اس پر یقین رکھنا چاہیئے کہ قانونِ خداوندی کے خلاف کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم اس کے قانون کو اپنی نگاہ میں رکھو اور جو کچھ اس کے تقاضے ہیں انہیں پورا کرتے رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ وَ عَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ o (۱۰/۵۸)۔ مومنین کا تو شعارِ زندگی یہ ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی محکمیّت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔

ایک عجیب صورت؟

---

[1] شیطان کیا ہے؟ اس کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" دیکھئے یا لغات القرآن میں متعلقہ عنوان۔

ان تصریحات کے بعد اب ان آیات کی طرف آیئے جن میں کہا گیا ہے کہ اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی۔

اذنِ خُداوندی کے بغیر کوئی مصیبت نہیں آتی

جنگِ اُحد میں، جماعتِ مومنین کو اچھی بھلی کامیابی ہو رہی تھی کہ تیر اندازوں کے ایک دستے نے، اپنے کمانڈر کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی پوزیشن کو چھوڑ دیا جس سے ان کی فتح مبدّل بہ شکست ہو گئی اور انہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ سورۂ آلِ عمران میں، اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

تم قانونِ خداوندی کے مطابق دشمن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا اور اس طرح خدا کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا لیکن عین اس وقت تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیشِ نظر میں تم نے باہمی تنازعہ شروع کر دیا اور (تمہارے کمانڈر نے جو حکم دیا تھا)، تم نے اس کی نافرمانی کی، حالانکہ فتح و کامرانی جو تمہارا محبوب مقصد تھا، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ قریبی مفاد پر ٹوٹ پڑے اور کچھ ایسے رہ گئے، جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ یوں تمہارا رُخ دشمن سے ہٹ کر دوسری سمت کو پھر گیا۔ (تمہیں شکست ہو گئی اور) اس طرح تم پر بات واضح ہو گئی۔ (اس کے بعد تم نے اپنی غلطی کو محسوس کر لیا۔ پھر اپنے مقام پر واپس آ گئے اور تمہیں کامیابی حاصل ہو گئی اور یوں، تمہاری لغزش کے اثرات مٹ گئے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ایک بار کی لغزش سے انسان ہمیشہ کے لئے کامرانیوں سے محروم نہیں ہو جاتا۔ وہ جب بھی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے پر آ جائے، خدائی نوازشات سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے۔ (۳/۱۵۱)

ان نقصانات کے سلسلہ میں جب تم نے بعد میں سوچنا شروع کیا تو لامحالہ تمہارے دل میں یہ خیال اُبھرا کہ اَنّٰی هٰذَا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟

اس کے جواب میں خدا نے کہا کہ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (۳/۱۶۴)۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ یہ سب تمہاری اپنی وجہ سے ہوا، اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔

اور اس کے بعد ہے۔

وَ مَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ .... (۳/۱۶۵)۔

اس دن میدانِ جنگ میں جو واقعات بھی رونما ہوئے، جو مصیبتیں تمہیں پہنچیں، وہ سب باذن اللہ تھیں۔

جو تشریحات پہلے چلی آرہی تھیں، ان کی روشنی میں، باذن اللہ کا مفہوم اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ "جو مصیبتیں تمہیں اٹھانی پڑیں وہ خود تمہاری اپنی غلطی کا نتیجہ تھیں اور یہ سب کچھ عین قانونِ خداوندی کے مطابق ہوا۔"

اور انہی تصریحات کی روشنی میں سورۂ تغابن کی اس آیت کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے کہ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۶۴/۱۱)۔ جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے، وہ باذن اللہ ــــ یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق آتی ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم میں چار الفاظ ایسے آئے ہیں جن سے نگہ بصیرت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ ہر واقعہ قانونِ خداوندی کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

قانون پیشِ نظر رہنے سے ہدایت

وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ (۶۴/۱۱) جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتا ہے، اس کے قلب کو ایسی راہ نمائی (ہدایت) مل جاتی ہے جس سے وہ علت و معلول کی کڑیوں پر غور کر کے، اس کا اندازہ کر لیتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔ مستقبل قریب میں کیا کچھ ہونے کا امکان ہے اور اس کے تدارک کی صورت کیا ہے ــــ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور ان کے تضمنات کے سلسلہ میں ضروری معلومات سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

واضح رہے کہ اس سے مراد "پیش گوئی" نہیں، بلکہ فکر و تدبر سے، علت و معلول کی کڑیوں پر غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا مراد ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے "آئینۂ ادراک" کہا ہے۔ پیشگوئیاں کرنے والوں کا تو عقیدہ یہ ہے کہ جب تک ادراک کے آئینے کو توڑ کر چکنا چور کر دیا جائے، انسان

روحانیت کے اس مقام پر پہنچ ہی نہیں سکتا جہاں سے اُسے غیب کی خبریں ملتی ہیں۔ ان کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ ــــ چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است!!

بہرحال، یہ ضمنی نکتہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، اِذن اللہ سے مراد خدا کا مقرر کردہ قانون ہی ہے جو جو مستقل بھی ہوتا ہے اور غیر متبدّل بھی۔

نوٹ:۔ ہم نے اس مقام پر' اذن اللہ سے متعلق اصولی بحث کی ہے۔ دیگر امور کے متعلق جہاں جہاں اذن اللہ کے الفاظ آئے ہیں' ان کی بابت گفتگو متعلقہ مقامات میں کی جائے گی۔

ساتواں باب

خیر و شر

(GOOD AND EVIL)

انسانی فکر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسائل حیات میں سے کسی مسئلہ نے اسے اس قدر وقفِ پیچ و تاب نہیں رکھا جس قدر مسئلۂ خیر و شر نے اسے غلطاں و پیچاں رکھا ہے. مسئلۂ خیر و شر درحقیقت، مسئلۂ تقدیر کا جزوِ لاینفک ہے، اس لئے یہ مسئلہ صرف مفکرین ہی کا محورِ فکر و نظر نہیں رہا، بلکہ اہلِ مذہب کا بھی مرکزِ توجہ رہا ہے. اس سلسلہ میں، اس معمّہ کو بڑی شدّ و مد سے پیش کیا جاتا ہے جسے سینٹ طامس ایکوینس (ST, THOMAS AQUINAS) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ

> اگر شر کا وجود خدا کی مرضی سے ہے تو وہ (خدا) خیرِ مطلق نہیں ہو سکتا اور اگر شر خدا کی مرضی کے علی الرّغم موجود ہے تو خدا قادرِ مطلق نہیں کہلا سکتا.

چونکہ زیرِ نظر کتاب میں ہم نے انداز یہ رکھا ہے کہ ہم **تقدیر** یا اس سے متعلقہ مباحث کے سلسلہ میں فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں میں نہیں الجھیں گے، بلکہ عام فہم انداز میں ان مسائل پر گفتگو کر کے، ان سے متعلق قرآنی تعلیمات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے، اس لئے ہم اس تفصیل میں نہیں جائیں گے کہ انسانی فکر (حکمائے یونان سے لے کر عصرِ حاضر تک) نے اس باب میں کیا سوچا اور کیا کہا ہے. (جن احباب کو ان تفصیلات سے دلچسپی ہو وہ راقم السطور کی کتاب — انسان نے کیا سوچا؟ — کا مطالعہ فرمائیں). یہاں ہم، انسانی فکر کی عام سطح کے مطابق اتنا بتائیں گے کہ وہ اُلجھاؤ کیا ہیں جن میں پھنس کر ذہنِ انسانی ہزاروں سال سے اس کش مکش میں گرفتار چلا آ رہا ہے اور اس پسِ منظر میں یہ بتائیں گے

کہ قرآنِ کریم ان پیچیدگیوں کا حل کیا بتاتا ہے۔

مشہور ہے کہ گوتم بدھ ایک راجہ کے بیٹے، اور ایک ریاست کے راج کمار (ولی عہد) تھے۔ تھے تو

حساس قلوب کے تاثرات

شہزادہ لیکن فطرت نے انہیں بڑا درد آشنا دل (اور حساس قلب) عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ چوہیا کو بلی کھا جاتی ہے اور بلی پر کتا جھپٹ پڑتا ہے۔ مرغی کے چوزے کو چیل اُچک کر لے جاتی ہے اور ہرن کو شیر پھاڑ کر کھاتا ہے۔ پھر انھوں نے دیکھا کہ ایک غریب انسان فاقوں سے گھُل گھُل کر مرجاتا ہے اور ایک نادار بیمار، درد و کرب سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے — تو ان کا قلبِ حساس اسے برداشت نہ کرسکا اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دنیا ہے ہی مصائب و آلام کا گھر اور ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ انسان دنیا کو ترک کردے اور اس حد تک ترک کردے کہ اس کے دل میں کوئی آرزو تک پیدا نہ ہو۔ جب دنیا کی طرف سے قطعِ علائق کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو وہ کامل عدم احساس کی منزل میں داخل ہو جائے گا، جسے **نروان** کہا جاتا ہے، اور یوں اسے دنیاوی آلام و مصائب سے مکتی (نجات) حاصل ہو جائے گی — بعد میں اُن کے ان تاثرات نے فلسفہ کی حیثیت اختیار کرلی، جو اڑھائی ہزار سال سے انسانیت کے اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔

چونکہ دنیا نام تھا جہانِ آب و گِل، یعنی مادہ (MATTER) کا، اس لئے، اس سے یہ کلیہ

مادی دُنیا سے نفرت

مستنبط کرلیا گیا کہ مادہ ایک دلدل ہے جس میں انسانی روح بُری طرح پھنس گئی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ روح کو مادہ کی اس قید سے چھڑا دیا جائے۔ طریقہ اس کا بھی ترکِ دنیا ہی ہے اور یہ مقصد مختلف ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مسلک کو **تصوّف** کہا جاتا ہے جو دنیا کی ہر قوم میں متواتر چلا آرہا ہے، اگرچہ نام اس کا مختلف اقوام میں، مختلف رہا ہے۔

ہندی مفکروں نے جب اس سوال پر غور کیا کہ (یہ کیا بات ہے کہ) کچھ لوگ دنیا میں نہایت عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے لوگ ساری عمر مصائب و تکالیف میں مبتلا رہتے ہیں، تو وہ اس

مسئلۂ تناسخ

نتیجہ پر پہنچے کہ جن لوگوں نے اپنے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے تھے۔ انہیں موجودہ جنم میں خوش حالیاں اور خوش گواریاں میسر آتی ہیں۔ جنھوں نے بُرے کام کئے تھے

وہ مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ نظریہ درحقیقت، عقیدۂ تناسخ۔ TRANSMIGRATION OF SOUL۔ ہی کا دوسرا نام تھا جو فکرِ یونان کی پیداوار تھا اور جہاں سے اسے ہندی ویدوانوں نے مستعار لے لیا تھا۔

کچھ دانشوروں نے جب یہ دیکھا کہ دنیا میں جھوٹ، فریب، چوری، ظلم، ناانصافی عام ہے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کی فطرت ہی بد واقع ہوئی ہے۔ عیسائیت آگے بڑھی تو اس نے اس بُنیاد پر گناہِ اوّلیں (ORIGINAL SIN) کی عمارت استوار کرلی۔ اس نے کہا کہ آدم اور اس کی بیوی نے بہشت میں جو گناہ کیا تھا اس کا اثر یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اس گناہِ اوّل کی آلائش اپنے ساتھ لئے اس دنیا میں آتا ہے اور انسانوں کی تمام اخلاقی خرابیوں کی جڑ یہی آلائش ہے۔ اس کے دور کرنے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان، جناب مسیحؑ کی تصلیب اور کفارہ پر ایمان لائے۔

عیسائیت کا عقیدہ، گُناہِ اوّل

ایرانی دانشوروں نے کہا کہ نہیں۔ بات یوں نہیں۔ بات یوں ہے کہ دنیا میں دو مستقل اور باہمدگر متضاد قوتیں ازل سے برسرِ پیکار ہیں۔ ایک ظلمت (تاریکی) کی قوت ہے، جسے اہرمن کہتے ہیں، اور دوسری نور (روشنی) کی قوت جسے یزداں کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں ہر آن جنگ جاری رہتی ہے جسے خیر و شر کی کش مکش کہتے ہیں۔ یہ ثنویت DUALISM قدیم ایرانی مجوسیوں کا مذہب ہے جسے (جناب) زرتشت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ کائنات میں تضادات کی یہی جنگ ہے جس نے جرمن فلاسفر ہیگل کے نظریۂ جدلیّت (DIALECTICISM) کو جنم دیا اور جس پر مارکس کے معاشی نظریہ کی عمارت استوار ہے۔

مجوسیوں کی ثنویت

ایک نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں متضاد قوتیں ہیں ہی نہیں۔ جنہیں ہم متضاد قوتیں سمجھتے ہیں ان کے تضاد کی کیفیت ایسی ہی ہے جیسے ہم (مثلاً) دایاں اور بایاں یا اوپر اور نیچے کہتے ہیں۔ یہ محض اضافی الفاظ (RELATIVE TERMS) ہیں۔ اس اعتبار سے، ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ دنیا میں، شر کا وجود نہیں، خیر ہی خیر ہے۔ اس کے برعکس، دوسرا مکتبِ فکر (جس کا امام شوپنہار ہے۔) یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ دنیا شر ہی شر ہے۔ اس میں خیر کا وجود ہی نہیں۔ یہ نظریہ درحقیقت، گوتم بُدھ کے نظریہ ہی کی صدائے بازگشت ہے۔

شوپنہار کا فلسفۂ قنوطیت

جس شخص کا ذہن ہو رسا، لیکن (بدقسمتی سے) اعصاب ہوں کمزور، تو اس کی فکر پر لازماً قنوطیت (PESSI-MISM) چھا جاتی ہے۔ شوپنہار کے ساتھ یہی ہوا تھا۔

ایک مکتبِ فکر کا خیال یہ ہے کہ خیر اور شر موجود فی الخارج نہیں ہوتے۔ یہ ان تاثرات کا نام ہے جو انسان، مختلف واقعات سے اخذ کرتا ہے۔ مثلاً کسی جنگل میں (جہاں کوئی انسان نہ بستا ہو)، اگر آندھی کا طوفان یا بارش کا سیلاب آجائے، تو اسے ہم تباہی (شر) نہیں کہتے لیکن وہی طوفان یا سیلاب جب کسی بستی میں قیامت برپا کر دے، تو وہ ہمارے لئے شر بن جاتا ہے۔

یا، اس سے بھی برجستہ مثال میں ــــ رات کی تاریکی، رہزن کے لئے خیر ہوتی ہے اور راہرو کے لئے شر ــــ لہذا، ان کے نزدیک، خیر اور شر، انسان کے داخلی تاثرات ہیں۔ ان کا وجود مستقل بالذّات کچھ نہیں۔

مختصراً، یہ ہیں مسئلۂ خیر و شر کے وہ بگولے جن میں فکرِ انسانی ہزاروں سال سے طلسمِ پیچ و تاب بن کر مبتلائے گردش ہے اور جن سے باہر نکلنے کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بگولے، خیر و شر کے پیدا کردہ نہیں، بلکہ خود ذہنِ انسانی کے پیدا کردہ ہیں۔ وہ خود ہی انہیں پیدا کرتا ہے اور جب ان کے بندھنوں میں پھنس جاتا ہے تو چیخنے چلّانے لگ جاتا ہے کہ مجھے ان سے رہائی کی کوئی شکل نظر نہیں آتی؛ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار

آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس باب میں ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے؟

قرآنی تعلیم

سب سے پہلے خارجی کائنات کے حوادث کو لیجئے جنہیں فطری شر (NATURAL EVIL) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۵/۸۵) (قرآنِ کریم میں اس مضمون کی متعدد آیات ہیں) یعنی خدا نے کائنات کو بالحق پیدا

کیا ہے۔ لفظ حق کے معانی متعدد ہیں، لیکن موضوع زیرِ نظر کے اعتبار سے، اس کے بنیادی معنی ہیں ایسی چیز جس کا نتیجہ تعمیری (CONSTRUCTIVE) ہو تخریبی (DESTRUCTIVE) نہ ہو۔ اس کے برعکس، باطل کے معنی ہیں تخریبی نتائج پیدا کرنے والا۔ یہاں سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے کائنات کی تمام اشیاء، اور جو کچھ اس میں ہوتا ہے، سب کا مقصد تعمیر ہے۔ تخریب نہیں۔ بالفاظِ دیگر ان کا نتیجہ خیر ہے شر نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کائنات میں بے شمار قوتیں کارفرما ہیں انہیں (FORCES OF NATURE) کہا جاتا ہے اور یہ تمام قوتیں خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ جوں جوں یہ ان قوانین کا علم حاصل کرتا جائے گا، فطرت کی قوتیں اس کے تابع فرمان ہوتی جائیں گی تاآنکہ یہ ایک دن ان تمام قوتوں کو مسخر کرلے گا ــــ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) خدا کا ارشاد ہے ــــ یعنی ساری کائنات انسان کے لئے مسخر کردی گئی ہے۔

جب تک انسان کسی فطری قوت سے متعلق قانون کا علم حاصل نہیں کرتا (اسے سائنسی انکشافات کہتے ہیں) وہ قوت سرکش و بیباک رہتی ہے اور انسان کے لئے تباہیوں کا موجب بنتی ہے۔ جب یہ اس سے متعلق قانون کا علم حاصل کرلے، اسے مسخر (HARNESS) کرلیتا ہے، اس سے ہزاروں تعمیری کام لئے جاسکتے ہیں۔ ذہنِ انسانی کے عہدِ طفولیت میں، جب اس نے ہنوز قوانینِ فطرت کا علم حاصل نہیں کیا تھا، کائنات کی تمام قوتیں بے باک، فلہذا، اس کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب تھیں۔ جوں جوں یہ ان کا علم حاصل کرکے، انہیں مسخر کرتا چلا گیا، وہ مضرت رساں ہونے کے بجائے، منفعت بخش بنتی چلی گئیں۔ وہ اشیاء تو منفعت بخش نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کی گئی تھیں لیکن انسان کو ان سے مفاد حاصل کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ قرآنِ کریم نے ان اربابِ ایقان و فکر، اور اعیانِ تحقیق و تجسس کو درخورِ تبریک قرار دیا ہے جو مسلسل غور و فکر اور پیہم تحقیق و تفتیش سے، کائناتی قوتوں کے مبنی بر حق ہونے کے دعوے کی صداقت کا عملی ثبوت ہم پہنچاتے ہیں۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے۔

اربابِ فکر و تحقیق کی تحسین

ان لوگوں کے لئے جو عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں، کائنات کی تخلیق اور دن اور رات کی گردش میں، حقیقت تک پہنچنے کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

یعنی اُن صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے، جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے، بیٹھے، لیٹتے قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیق ترکیب پر غور و فکر کرتے اور اپنی تحقیقات کے بعد، علی وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو اس کارگہِ کائنات کو بے مقصد اور تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر تباہیوں اور بربادیوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں) تو ہمیں اس کی توفیق عطا فرما کہ ہم (علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد، اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں، اور اس طرح) تباہ کن عذابِ زندگی سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں ــــ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

(۱۸۹ ــ ۱۹۱/۳)

اُنھیں "علماء" کہا جاتا ہے

کارگہِ کائنات پر اس طرح غور و فکر کرنے والوں کو قرآن "علماء" کہہ کر پکارتا ہے۔ (۲۷-۲۸/۳۵)

فطرت کی قوتیں

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا " کے علمی ثبوت کے لئے تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ فطرت کی وہ مہیب قوتیں جو سرکش اور بے باک ہونے کی وجہ سے قیامت خیز تباہیاں مچایا کرتی تھیں اور اس وجہ سے انسان سمجھتا تھا کہ وہ شر ہی شر ہیں، جب انسان نے ان پر قابو پالیا تو وہ ہزار منفعت بخشیوں کا موجب بن گئیں اور خیر ہی خیر نظر آنے لگیں۔ بارش کا پانی جب انسانی کنٹرول میں نہیں ہوتا تو سیلاب بن کر تباہیاں لاتا ہے لیکن جب انسان اسے ساحلوں میں مقیّد

کر دیتا ہے تو وہ زمینِ مُردہ کے لئے حیاتِ تازہ کا پیامبر اور زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ آگ شعلۂ بیباک کی شکل میں ہو تو بستیوں کی بستیوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے لیکن جب وہ انسانی قبضہ (کنٹرول) میں آجاتی ہے تو ہمہ تن خیر بن جاتی ہے۔ سانپ، بچھو اور دیگر سینکڑوں قسم کے زہریلے جانور، جو اُڑتی پھرتی موت اور چلتی پھرتی ہلاکت کے علاوہ کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتے تھے اور جن کے متعلق کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خدا نے انہیں پیدا کیوں کر دیا ہے، اب انہی کے زہروں سے ایسے ایسے تریاق تیار کئے جا رہے ہیں جو سینکڑوں مہلک بیماریوں کا علاج ہیں۔ اس کی ایک زندہ اور مجسمہ شہادت خود وہ شخص ہے جو اس وقت ان سطور کو لکھ رہا ہے اور اپنے خیالات قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ بات

میری زندگی کا ایک واقعہ

یوں ہوئی کہ جب ۱۹۶۴ء میں میرا ایک اپریشن ہوا، تو اپریشن تو کامیاب رہا لیکن اس کے بعد، ایک حادثہ کی وجہ سے اس طرح خون جاری ہو گیا کہ وہ تھمتا ہی نہیں تھا۔ معالج[1] نے، جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ، سراپا خلوص و محبت تھا، سب کچھ کر دیکھا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ نوبت بایں جا رسید کہ میں بے ہوش ہو گیا اور اعزہ و اقارب، حتیٰ کہ خود ڈاکٹر صاحب میری زندگی کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ میرا سانس اکھڑ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے آخری تدبیر کے طور پر ایک انجکشن دیا۔ خون رُک گیا۔ میں نے آنکھ کھول دی اور رفتہ رفتہ، موت کے ویرانوں سے دوبارہ زندگی کی وادیوں کی طرف لوٹ آیا۔ بعد میں، میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ وہ کون سا آبِ حیات تھا جس نے یہ مسیحائی کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اس دوائی کا نام (REPTILASE) ہے جو سانپ کے زہر سے تیار ہوتی ہے۔ یہ سُن کر میری زبان سے بے ساختہ نکلا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًاۚ۔

اقبالؔ نے، خدا اور آدم کے مکالمہ میں، آدمؔ کی زبان سے کہا تھا کہ

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

---

[1] حبیبِ مکرّم ڈاکٹر سیّد عبدالودود صاحب۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا۔

اگر آپ " از زہر نوشینہ سازم "، کی زندہ شہادت لینا چاہیں تو کسی کیمسٹ کی دوکان پر جائیے۔ آپ کو تقریباً نوے فی صد شیشیوں پر لکھا ملے گا (POISON) اور ان میں سے ہر دوائی کسی نہ کسی مرض کے لئے تریاق ہوگی اور یوں ہر زہر زبانِ حال سے پکار رہا ہوگا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَنِيْ بَاطِلاً ۔ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تخریبی نتائج کے لئے نہیں پیدا کیا تھا۔ یہ انسان کی کوتاہیٔ علم تھی جس کی وجہ سے اس نے ایسا سمجھ رکھا تھا۔

بچوں کے پیدائشی نقائص

انسان کی یہی کوتاہیٔ علم تھی جس کی وجہ سے وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ بعض بچے پیدائشی، لولے لنگڑے، اپاہج، حتیٰ کہ اندھے کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے قیاس نے بہت زور مارا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ امراض و مصائب ان کے کسی پچھلے جنم کے کرموں (غلط اعمال) کا نتیجہ ہیں ۔ وہ اس سے زیادہ اور سوچ بھی کیا سکتا تھا؟ لیکن جب انسان علمی تحقیقات میں آگے بڑھا تو اس نے ان حوادث کا راز بھی پالیا۔ چنانچہ اب ترقی یافتہ اقوام کا یہ عالم ہے کہ وہاں پہلے اس جوڑے کا، جو شادی کا خواہاں ہو طبی معائنہ کرتے ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا تو نہیں جو موروثی طور پر بچے میں منتقل ہو جائے۔ اس طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد، وہ رحمِ مادر میں جنین کی حالت کا معائنہ کرتے رہتے اور اسے، وہیں ضروری سامانِ حفاظت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ ان علمی انکشافات اور حسنِ تدابیر کا نتیجہ ہے کہ ان اقوام میں بچے بالعموم تندرست و توانا پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں، اس شعبہ میں مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، تاکہ بچوں کے ان نقائص و اسقام کی مدافعت کا بھی انتظام کیا جا سکے جو ابھی ان کی گرفت میں نہیں آئے۔

درد کا مسئلہ

شر (EVIL) کی سب سے زیادہ سنگین اور کرب آمیز مثال درد (PAIN) کی دی جاتی ہے، اور جسے درد ہو رہا ہو، اسے اس کا "فلسفہ" سمجھایا ہی نہیں جا سکتا۔ (شدید درد کی حالت میں، بالعموم سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔) لیکن علم الامراض کے ماہرین کا کہنا یہ ہے کہ درد تو فطرت کی رحمت ہے۔ انسانی جسم کی مشینری اس قدر پیچیدہ اور پُراسرار سی ہے کہ کسی دوسرے انسان کو تو ایک طرف، خود اپنے آپ کو بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ چل کیسے رہی ہے اور اس میں کوئی سقم تو نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ اس مشینری میں نقص اور خرابی پیدا ہو گئی ہے، فطرت نے ایک (DEVICE) تجویز کر رکھی ہے جسے درد کہا جاتا ہے۔ درد، درحقیقت وہ خطرے کی

گھنٹی ہے جو پکار پکار کر، بلکہ چلا چلا کر، آنے والے خطرہ سے آگاہ کرتی ہے۔ اگر یہ گھنٹی نہ بجے تو کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ مشین کے اندر کوئی خرابی واقع ہو رہی ہے تا آنکہ وہ مشین چلتے چلتے رُک ہی نہ جائے (یعنی انسان کی موت واقع ہو جائے)۔ اس نقطۂ نگاہ سے 'درد' درحقیقت ایک نعمت ہے۔

لیکن فطرت کے دوسرے طریقوں کی طرح، یہ طریق بھی (CRUDE) سا ہے اس لئے انسان اس تلاش میں ہے کہ اس کی جگہ کوئی ایسا طریق دریافت کر لیا جائے جس سے آنے والے خطرہ کا علم تو قبل از وقت ہو جائے لیکن کرب و اذیت ساتھ نہ آئے۔ اس سلسلہ میں بڑی شد و مد سے ریسرچ ہو رہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے، ایک ریسرچ سکالر (GEORGE A. W. BOEHM) کا ایک مبسوط مقالہ[1] ہے، جس میں اس نے بتایا ہے کہ جس رفتار سے یہ تحقیقات جاری ہیں، اس کے پیشِ نظر توقع کی جا سکتی ہے کہ آئندہ دس سال کے عرصہ میں ایسا ہو جائے کہ انسان کو جسمانی درد سے نجات مل جائے۔ — خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اشیائے کائنات کے متعلق جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے ان کا شر کا پہلو خیر سے بدلتا چلا جاتا ہے۔

اشیاء کی مقدارِ استعمال

اشیائے کائنات کے خواص دریافت کرنے کے ساتھ، یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہے کہ ان کا کس "مقدار" میں استعمال ممدِ حیات ہے اور کس مقدار میں ہلاکت آفریں۔ بالفاظِ دیگر، ان اشیاء کی "تقدیرات" (پیمانوں) کا معلوم کرنا۔ پانی کا ایک گلاس ممدِ حیات ہے لیکن وہی پانی جب زیادہ مقدار میں پیٹ میں چلا جائے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے — ڈوب کر آدمی اسی طرح مرتا ہے۔ یا مثلاً، سنکھیا کے دس قطرے، تقویت بخش ہوتے ہیں اور پچاس قطرے ہلاکت آفریں۔ اشیاء کے استعمال میں ان کی "تقدیرات" (پیمانوں) کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کی بیّن شہادت ہومیو پیتھک طریقِ علاج ہے۔ اس طریقِ علاج کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ کسی شے کے زیادہ مقدار میں کھانے سے انسانی طبیعت میں جس قسم کی ناخوشگوار کیفیات پیدا

---

[1] مطبوعہ پاکستان ٹائمز، مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء۔

ہوتی ہیں، اس شے کی ہومیو پیتھک معتاد (DOSE) سے ان کیفیات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کی ہر شے کی اصل خیر ہے۔ یہ اس کی غلط "مقدار" ہے جس سے وہ شر بن جاتی ہے۔

اور اس سے ہمیں قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ (۱۱۳/۱-۲) یعنی اس بات کی احتیاط برتو کہ خدا نے کائنات میں جو کچھ پیدا کیا ہے، ان کے غلط استعمال سے وہ تمہارے لئے شر نہ بن جائے۔ یعنی خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس نے اشیائے کائنات میں مختلف خواص و تاثیرات رکھ دی ہیں۔ اب ان کا مضر اور منفعت بخش ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ تم انہیں استعمال کس طرح کرتے ہو۔ اگر تم انہیں خدا کے مقرر کردہ قوانینِ طبیعی کے مطابق استعمال کرو گے تو ان کا نتیجہ خیر ہوگا۔ ان کے خلاف استعمال کرو گے تو اس سے شر پیدا ہوگا۔ اسی بنا پر سورۂ آلِ عمران میں، بطور اصول بتایا گیا ہے کہ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۳/۲۵) خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ اس نے اشیائے کائنات کو پیدا کیا اور ان کی "تقدیرات" مقرر کر دیں۔ اگر

خدا سرچشمۂ خیر ہے

انہیں، ان کے مطابق استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوگا۔ کہ خدا سرچشمۂ خیر ہے۔ اگر انہیں، ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو اس سے شر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی شر خود انسان کا اپنا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقتِ کبریٰ ہے جسے سورۂ نساء میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس آیت کو ہم پہلے بھی سامنے لا چکے ہیں، لیکن نقطۂ زیرِ نظر کی اہمیت اور نسبت کے لحاظ سے، اس کا دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ آیت یہ ہے کہ مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَ مَاۤ اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ۔ (۴/۷۹)۔ "تمہیں جو خوشگواریاں ملتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہوتی ہیں اور جو مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہیں"۔ اور اس سے پہلے ہے قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (۴/۷۸)۔ نتائج سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ ان قوانین کے مطابق عمل کرو تو نتیجہ خیر ہی خیر ہے۔ ان کی خلاف ورزی کرو تو شر ہی شر۔ دوسری جگہ ہے وَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی (۲۸/۶۰)۔ جو خدا کے ہاں سے (یعنی اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلنے سے) ملتا ہے۔

وہ خیر (منفعت بخش) بھی ہوتا ہے اور پائندہ بھی۔

بعض مقامات پر اس حقیقت کو بڑے لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ اِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَی الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَ نَاٰبِجَانِبِہٖ ۚ جب ہم انسان کو اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں (اَنۡعَمۡنَا۔ ہم نوازتے ہیں) تو وہ اعراض برتتا اور بے رُخی اختیار کر لیتا ہے۔ وَ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ کَانَ یَـُٔوۡسًا ﴿۸۳/۱۷ ؛ ۵۱/۴۱﴾۔ اور جب اسے نقصان پہنچتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے۔ یہاں خدا نے نقصان یا شر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ اِذَآ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَۃً فَرِحُوۡا بِہَا ؕ جب ہم انسان کو رحمت سے لطف اندوز کرتے ہیں (اَذَقۡنَا ہم ایسا کرتے ہیں) تو وہ اترانے لگتا ہے وَ اِنۡ تُصِبۡہُمۡ سَیِّئَۃٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡہِمۡ اِذَا ہُمۡ یَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶/۳۰ نیز ۴۸/۴۲﴾۔ جب اسے، اس کی خود کردہ غلطیوں کی وجہ سے نقصان پہنچتا ہے تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے)۔ سورۂ اعراف میں یہ انداز اور بھی لطیف اور بلیغ ہو گیا ہے۔ جہاں کہا کہ وَ الۡبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخۡرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذۡنِ رَبِّہٖ ۚ وَ الَّذِیۡ خَبُثَ لَا یَخۡرُجُ اِلَّا نَکِدًا ؕ ﴿۵۸/۷﴾۔ زرخیز زمین، خدا کے قانون کے مطابق (بِاِذۡنِ رَبِّہٖ) نہایت عمدہ فصل پیدا کرتی ہے لیکن ناقص زمین، بہت کم پیداوار دیتی ہے ــــ دیکھئے یہاں بِاِذۡنِہٖ نہیں کہا حالانکہ یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

اخلاقی خیر اور شر

یہاں تک ہم نے اشیائے کائنات کے طبعی خواص و اثرات، ان کے طبعی طریق استعمال اور ان سے پیدا ہونے والے منفعت بخش (خیر) اور مضرت رساں (شر) نتائج سے بحث کی ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں، **خیر** اور **شر** کا ایک اور گوشہ بھی سامنے آتا ہے جس کا تعلق طبعی قوانین سے نہیں۔ تلوار کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ وہ گلا کاٹ دیتی ہے۔ وہ تلوار ایک ظالم کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس سے مظلوموں اور کمزوروں کا گلا کاٹے گا لیکن وہی تلوار اگر کسی انصاف پسند انسان کے ہاتھ میں ہو تو وہ اس سے ظالموں کی کلائی مروڑ کر، مظلوموں کی حفاظت کا سامان پیدا کر دے گا۔ تلوار وہی ہے اور اس کی طبعی خاصیت بھی،

مقصد، معیارِ خیر و شر

وہی لیکن جس مقصد کے لئے اسے استعمال کیا گیا ہے وہ اس کے خیر و شر ہونے کا معیار بن جاتا ہے۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئیے۔ ایک شخص فریب دے کر کسی شخص کا روپیہ ہتھیا لیتا ہے۔ "فریب دینے" میں کوئی طبیعی ذریعہ (تلوار وغیرہ) استعمال نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف عقلِ انسانی کام میں لائی گئی ہے۔ آپ، اپنے اس نقصان کا ذکر، اپنے کسی ایسے دوست سے کرتے ہیں جو زیادہ ذہین اور فطین ہے۔ وہ ایسی تدبیر کرتا ہے کہ اُس فریب کار کو آپ کا روپیہ واپس دینا پڑتا ہے۔ اس میں بھی آپ کے اس دوست نے عقل ہی کا استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ عقلِ انسانی بھی ایک قوت ہے اور جس مقصد کے لئے اسے استعمال کیا جائے اس کے مطابق وہ خیر یا شر بن جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کا تعین کس طرح کیا جائے جن کے مطابق، مادی قوتیں، یا خود انسانی صلاحیتیں شر کے بجائے خیر بن جائیں۔ ظاہر ہے کہ عقلِ انسانی کی رُو سے ان مقاصد کا تعین

مقصد کا تعین وحی کر سکتی ہے

نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ عقل اس سوال کا جواب کس طرح دے سکتی ہے کہ اسے کس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے؟ جس طرح تلوار اپنے استعمال کا مقصد خود متعین نہیں کر سکتی اسی طرح عقلِ انسانی بھی اپنے استعمال کا مقصد خود متعین نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے عقلِ انسانی سے بالاتر کوئی سرچشمہ ہونا چاہیئے۔ یہ سرچشمہ وحیٔ خداوندی ہے اور جو معیار، وحی کی رُو سے متعین ہوتا ہے، اُسے دین کی اصطلاح میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ جب فطرت کی قوتوں، اشیائے کائنات، یا خود عقلِ انسانی کو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق استعمال کیا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ جب انہیں، ان اقدار کے خلاف صرف میں لایا جائے تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ جو معاشرہ، مستقل اقدارِ خداوندی سے انکار کرتا ہے اور اپنے تمدنی نظام کو، صرف عقل کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے، اسے باطل کا نظام کہا جاتا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ، انسان کے لئے شر ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں، فطرت کی قوتوں اور اشیائے کائنات کا استعمال، عقل کی رُو سے کیا جاتا ہے اور عقل کا استعمال اپنے جذبات کی رُو سے۔ جذبات کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ ان جبلتوں (INSTINCTS) کا نام ہے جو انسان کو، حیوانی زندگی سے وراثت میں ملے ہیں اور ان جبلتوں میں تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) اولکا

تغلّبِ خویش (SELF - AGGRESSION) کے جذبات بنیادی ہیں۔ یہی جذبات جب انفرادی سے اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں، تو تحفظِ خویش سے مراد ہوتا ہے، اپنی قوم کا تحفظ۔ اب آپ سوچئے کہ جب دنیا میں مختلف قومیں بستی ہوں اور ہر قوم، فطرت کی قوتوں کو، اپنی اپنی عقل (مصالح) کے مطابق اپنے تحفظ اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے، استعمال میں لائے، تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جہنم جس میں آج تمام اقوامِ عالم بُری طرح سے گرفتار ہیں! یعنی وہ جہنم جو اُن شرار (چنگاریوں) کا بھڑکایا ہوا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مستقل اقدار کے خلاف استعمال کرنے سے وجود میں آتی ہیں۔

موجودہ دَور کا جہنّم

یہی وہ نظامِ باطل ہے، جس میں، مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے آرزومند انسانوں کو طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اسی اعتبار سے، اس معاشرہ کی خرابیوں کے متعلق کہا کہ کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (۷۶/۷) اس کی چنگاریاں اڑ کر لگ جاتی ہیں۔

مستقل اقدار کو نظرانداز کر دینے سے جہاں نوعِ انسانی، قوموں میں بٹ جاتی ہے اور قوموں میں بعض زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہیں اور دوسری قومیں کمزور رہ جاتی ہیں ـــــ اور طاقت ور قومیں، کمزور قوموں کا خون چوس کر، اور طاقت ور ہوتی چلی جاتی ہیں ـــــ اس طرح، ایک قوم کے اندر مختلف طبقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان طبقات میں بالادست طبقہ، قوم کی دولت اور قوت کا مالک بن بیٹھتا ہے اور زیردست طبقہ ان کا محکوم و محتاج ہو کر، ان کا خدمت گذار بن جاتا ہے۔

پیدائشی امیر اور غریب

پھر اسی باطل نظام کی رُو سے، بالادست طبقہ میں پیدا ہونے والے بچے، زندگی کی مرفّہ الحالیاں ہی نہیں، بلکہ پوری پوری عیش سامانیاں ساتھ لئے پیدا ہوتے ہیں اور نچلے طبقہ کے گھروں میں جنم لینے والے بچے، ساری عمر عُسرت اور افلاس میں گذارتے ہیں اور چونکہ معاشرہ میں معیارِ تکریم، دولت قرار پاتا ہے، اس لئے، یہ مفلس اور غریب انسان، اور ان کے بچے، تمام انسانی صلاحیتوں کے باوجود، ذلیل و خوار سمجھے جاتے ہیں۔

ہندو پنڈتوں نے اس تفاوت کی توجیہہ یہ وضع کی کہ اختلافِ مدارج و معیارِ زیست، انسان کے پچھلے جنم کے کرموں (کاموں) کا نتیجہ ہیں ـــــ جس نے سب سے زیادہ خراب کام کئے تھے، وہ شودر پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اوپر ویش، پھر کھشتری اور سب سے اوپر خود برہمن ـــــ ظاہر ہے کہ جب

تعینِ مراتب کرنے والے برہمن ہوں تو سب سے اونچا طبقہ برہمنوں کا قرار نہیں پائے گا، تو اور کس کا قرار پائے گا؟

خدا کی طرف سے

جن لوگوں نے سابقہ جنم کے نظریہ سے اتفاق نہ کیا، انھوں نے، اس اختلافِ مدارج کے متعلق کہہ دیا کہ ان کا تعین خدا کی طرف سے ہوتا ہے ـــــ وہ جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے مفلس اور محتاج رکھے۔ جسے چاہے عزت عطا کردے، جسے چاہے ذلیل و خوار کردے۔ یہ ہر ایک کا نصیب اور قسمت ہے۔ اسی کو انسان کی تقدیر کہتے ہیں، جسے نہ کوئی شخص اپنے لئے بنا سکتا ہے، نہ مٹا سکتا ـــــ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا اور اسے اس تکرار و اصرار سے دہراتے چلے گئے کہ عوام مستقلاً اس کے فریب میں آ گئے۔ یہ سازش اس لئے کی گئی کہ عوام کی نگاہیں کہیں اس طرف نہ اٹھنے پائیں کہ یہ تفریق و تقسیم، خدا کی نہیں بلکہ اس غلط نظام کی پیدا کردہ ہے جس کے قیام و استحکام کا ذمہ وار بالادست طبقہ ہے ـــــ اور بالادست طبقہ میں، اربابِ نظم و نسق اور یہ حضراتِ وعظ و نصیحت، دونوں شامل ہیں ـــــ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

اس کے بعد، آپ پھر قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی طرف آیئے جس میں کہا گیا ہے کہ حسنات (زندگی کی خوشگواریاں) سب خدا کی طرف سے ملتی ہیں اور مصائب و آلام، تمہارے اپنے ہاتھوں کے لائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ مصائب و آلام، اس غلط نظام کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتنے سے وجود میں آتا ہے۔ اگر معاشرہ ان اقدار کے مطابق قائم ہو تو پھر ہر طرف سے حسنات کی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہ اقدار، قرآن کے اندر محفوظ ہیں، اسی لئے خود قرآن کو

قرآن کریم بھی سرچشمۂ خیر ہے

بھی خیر کہا گیا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے۔ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ یہ مخالفین، جماعتِ مومنین سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے۔ قَالُوا خَيْرًا (۱۶/۳۰)۔ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اس نے خیر نازل کیا ہے ـــــ یعنی خدا خود خیر کا سرچشمہ ہے اور اس کی طرف سے نازل شدہ ضابطۂ قوانین بھی خیر ہے۔ اس کے مطابق عمل کرنے سے، انسانی زندگی ہمہ تن خیر ہو جاتی ہے۔ شر اس کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتا ہے ـــــ خیر، اس کی طرف

سے۔ شرخود ہمارا آوردہ!

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

یہ خیر کیا ہے. اس کی تشریح میں کہا۔ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ (۱۶/۳۰)۔ جو لوگ، مستقل اقدار کے مطابق، حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں اس دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا ہوتی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی خوشگواریاں. یہاں سے ہمارے سامنے خیر کی ایک اور تعریف (DEFINITION) آئی ہے جو غور طلب ہے۔

طبیعی (یا حیوانی سطح کی) زندگی میں خیر و شر (یا نفع اور نقصان) کا معیار بڑا واضح، صاف اور سیدھا ہے. جس بات (یا کام) سے مادی مفاد حاصل ہوں، وہ خیر، اور جس سے مادی نقصان ہو، وہ شر۔ اس سلسلہ میں اتنی بات اور بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ اس معیار کے مطابق، کوئی شے مستقل طور پر باعثِ خیر یا موجبِ شر قرار نہیں پا سکتی. ایک ہی چیز جو ایک وقت میں (اُس وقت کے حالات کے مطابق) منفعت بخش ہے، وہ دوسرے وقت میں (بہ تبدیلیٔ حالات) مضرت رساں ہو سکتی ہے. صحت کے زمانے میں، دودھ منفعت بخش ہے. نزلہ، زکام، کھانسی میں مضرت رساں. یا (مقدار کے اعتبار سے) ایک گلاس پانی منفعت بخش، ایک مٹکا پانی مضرت رساں. اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ خیر اور شر اضافی (RELATIVE) ہیں. مطلق (ABSOLUTE) نہیں۔

لیکن جب زندگی کو انسانی سطح پر دیکھا جائے ـــــ یعنی جہاں یہ تسلیم کیا جائے کہ انسانی زندگی اس کے طبیعی جسم ہی سے عبارت نہیں. جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے، تو خیر اور شر (نفع. نقصان) کا ایک اور معیار سامنے آتا ہے، اور وہ یہ کہ جن امور سے

مطلق خیر و شر کا معیار

انسانی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو، جن سے اس میں استحکام (INTEGRATION) پیدا ہو، وہ خیر، اور جن سے اس کی نشوونما رُک جائے اور اس میں انتشار واقع ہو، وہ شر. چونکہ انسانی

ذات، غیر مادی، فلہٰذا غیر مرئی ہے، اس لئے اس کے خیر اور شر کے پیمانے بھی محسوس نہیں ہو سکتے۔ مثلاً سنکھیا کھانے سے کیا نقصان ہوتا ہے اسے ہر شخص جان اور پہچان سکتا ہے، لیکن جھوٹ بولنے سے (انسانی ذات کا) کیا نقصان ہوتا ہے، اسے نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ ماپا۔ اس کے برعکس جھوٹ بولنے سے مادی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے ـــــ اصل یہ ہے کہ انسان جھوٹ بولتا ہی اس وقت ہے جب اسے توقع ہو کہ اس سے اسے کچھ فائدہ حاصل ہو گا۔ منفعت کی توقع کے بغیر کوئی ذہنی مریض ہی جھوٹ بولے گا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے، نہ اس کے نفع یا نقصان کا معیار مادی ہے، نہ پیمانے مادی۔ اس کا معیار مستقل اقدار ہیں جنہیں عام اصطلاح میں اخلاقیات (MORALS) کہا جاتا ہے ـــــ واضح رہے کہ اخلاق کا تعلق، انسانی زندگی سے ہے۔ حیوانات میں اخلاق کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ جس معاشرہ میں انسانی ذات کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ (اسے مادی تصورِ حیات اور اس نظامِ معاشرت کو سیکولر کہا جاتا ہے) اس میں اخلاق (MORALS) کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ اس میں صرف سوسائٹی کے قوانین (SOCIAL LAWS) یا عدالتی قوانین ہوتے ہیں، جن کے بغیر انسان کی تمدنی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔ ان معاشرتی یا عدالتی قوانین میں بیشتر وہی ہوتے ہیں جنہیں اخلاقی ضوابط کہا جاتا ہے ـــــ مثلاً جھوٹ نہ بولو، فریب نہ دو، کسی پر زیادتی نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ لیکن ان کی حیثیت معاشرتی یا عدالتی قوانین کی ہوتی ہے، اخلاقیات کی نہیں۔

مادی نظریۂ حیات اور اخلاقیات

اگرچہ روشِ عامہ کے ماتحت انہیں اخلاقیات کہہ دیا جاتا ہے۔ اس فرق کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کو معلوم ہو کہ اسے جھوٹ بولنے سے اتنا فائدہ ہو گا اور اسے اس کا بھی یقین ہو کہ اس کا یہ جھوٹ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آ سکتا ہے اور نہ ہی عدلیہ کی مشینری کی گرفت میں، تو مادی نظریۂ زندگی کی رُو سے، کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو اسے جھوٹ بولنے سے باز رکھ سکے[1]۔ اگر کوئی شخص، معاشر

---

[1] جسے ضمیر کی آواز کہا جاتا ہے وہ ان نقوش کا نام ہے جو ابتدائی تعلیم و تربیت سے بچے کے دل پر منقوش ہو جاتے ہیں۔ جس قسم کے ماحول میں بچے کی تربیت، اسی قسم کا اس کا ضمیر۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جس قسم کے غلط ماحول میں موجودہ

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۴۲ پر دیکھئے)

میں رسوائی یا عدلیہ کی گرفت کے خیال سے جھوٹ نہیں بولتا، تو اسے اعلیٰ اخلاق کا حامل نہیں سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس، جو شخص انسانی ذات کو تسلیم کرتا اور اس کے نفع یا نقصان پر نگاہ رکھتا ہے، وہ اس وقت بھی جھوٹ نہیں بولے گا، جب اسے یقین ہو کہ اس کا جھوٹ نہ سوسائٹی کے نوٹس میں آسکتا ہے اور نہ ہی عدلیہ کی گرفت میں اور جھوٹ بولنے سے اسے اس قدر مادی فائدہ ہوگا۔ وہ اس لئے جھوٹ نہیں بولے گا کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے (ہر چند اسے مادی فائدہ ہو جائے گا لیکن) اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ وہ مادی فائدے کو، اپنی ذات کے فائدہ پر قربان کر دے گا۔ اسے اخلاق کہا جائیگا۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے، کیریکٹر (حسنِ کردار) کی تعریف یہ ہے کہ جہاں کسی مادی منفعت اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو، انسان مستقل اقدار کے تحفظ کے لئے (یعنی اپنی ذات کے فائدے کی خاطر) مادی مفاد کو قربان کر دے۔ مادی نظریۂ زندگی یا سیکولر نظام میں قانون کی پابندی کا تصور تو ہوتا ہے، اخلاقیات کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس میں اخلاقیات کے لئے کوئی بنیاد نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ضابطۂ قوانین میں بھی نت نئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یعنی ان کی حیثیت بھی اضافی ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، جس ضابطۂ اقدار کا تعلق انسانی ذات سے ہوتا ہے، اس کی حیثیت اضافی نہیں ہوتی۔ وہ اقدار مستقل اور غیر متبدّل ہوتی ہیں اور ان کے نتیجہ میں جو خیر یا شر ظہور میں آتا ہے (یعنی اُنکی پابندی سے خیر اور ان کی خلاف ورزی سے شر) اسے خیرِ مطلق (ABSOLUTE GOOD) اور شر مطلق (ABSOLUTE EVIL) کہا جاتا ہے۔ یعنی

(۱) یہ ہو نہیں سکتا کہ فریب دہی، ایک وقت میں تو موجبِ شر ہو اور دوسرے وقت میں خیر کا موجب۔

(۲) نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ فریب، موجب شر ہو اور تھوڑا سا فریب باعث خیر۔

(۳) یا یہ کہ کسی زمانہ میں صداقت اور دیانت، خیر تھی اور بعد میں کذب و فریب، خیر ہو گیا ہو، یا ہو جائے۔

(ص۱۴۱ کا بقیہ فٹ نوٹ) نوجوانوں کی تربیت ہوتی ہے اس کی رُو سے ان کا ضمیر انہیں غلط کاریوں اور جرائم کوشیوں سے قطعاً نہیں روکتا۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی)

مستقل اقدار (جن کا تعلق انسانی ذات سے ہے) مستقل، غیر متبدّل، اور مطلق ہیں۔

غلط معاشرہ (یا باطل کے نظام) میں چونکہ مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا، اس لئے اس میں اگر ایک فرد، مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اسے اکثر و بیشتر، مادی نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ اس تصادم میں مسلکِ خانقاہیت (تصوف) کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ چونکہ یہ مادہ (یا دنیاوی علائق) قابلِ نفرت ہیں، اس لئے تم مادی نفع یا نقصان کا خیال تک دل میں نہ لاؤ۔ دنیا کا ترک کر دینا ہی اصلِ حیات ہے۔ لیکن یہ فریبِ نفس ہے۔ آپ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ترک کر ہی نہیں سکتے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر معاشرہ مستقل اقدار کے مطابق قائم کر لیا جائے تو ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جس میں انسان کے مادی مفاد اور اس کی ذات کے مفاد میں ٹکراؤ ہو۔ اس لئے وہ افراد سے کہتا ہے کہ تم انفرادی زندگی بسر کرنے کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرو، جس میں معاشرہ مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اس میں تمہیں مادی مفادات بھی حاصل ہوں گے اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے گی۔ قرآنِ کریم، مادی مفادات کو دنیاوی حسنات سے تعبیر کرتا ہے اور ذات سے متعلق مفادات کو اُخروی حسنات سے ــــ اس لئے کہ حیاتِ آخرت کا تعلق انسانی ذات سے ہے، نہ کہ انسانی جسم سے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے خیرِ مطلق وہ ہے جس سے دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوں اور اُخروی مفاد بھی ــــ یعنی جس سے انسان کی طبیعی زندگی بھی مرفّہ الحالیوں کی ہو اور اس کی ذات بھی مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اور شرِ مطلق وہ ہے جو اس کے خلاف نتائج پیدا کرے۔

اور اب ہمارے سامنے سورۂ نحل کی اس آیت کا مفہوم نکھر کر آگیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب مومنین سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہاری طرف کیا نازل ہوا ہے تو وہ کہتے ہیں ــــ خیر ــــ یعنی لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ (۱۶/۳۰)
یعنی جس کی رُو سے مادی مفادات بھی حاصل ہوں اور انسانی ذات سے متعلق مفادات بھی۔ اسی نہجِ زندگی کو الدّین کہا جاتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) مادی نظریۂ زندگی (اور سیکولر نظامِ معاشرت) وہ ہے جس میں مقصود و منتہیٰ محض مادی

مفادات ہوتے ہیں۔ یہ بھی الدین کے خلاف ہے۔

(۲) مسلکِ خانقاہیت (تصوف) وہ ہے جس میں مادی دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ بھی الدین کے خلاف ہے۔ اور

(۳) الدین (اسلامی نظامِ زندگی) وہ ہے جس میں مادی مفادات بھی حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کا نشوو ارتقا بھی۔ یہ خیرِ مطلق ہے۔

یہی وہ خیر ہے جس کے متعلق کہا کہ یہ، ایمان اور تقویٰ سے ملتا ہے ۔۔ یعنی خدا اور انسانی ذات پر یقینِ محکم اور مستقل اقدار کی نگہداشت سے۔ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ٥ (۲/۱۰۳)۔ اگر یہ لوگ ایمان و تقویٰ کے مطابق زندگی بسر کریں تو انہیں خدا کے ہاں سے خیر مل جائے۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو جان سکتے۔ انہی کو دوسری جگہ ابرار کہا گیا ہے (۳/۱۹۷)۔ یعنی وہ جنہیں زندگی کی کشائشیں اور انسانی ذات کی وسعتیں نصیب ہیں۔ سورۂ نحل میں ہے کہ جب مادی مفادات اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ ہو تو اُس وقت مستقل قدر کو، مادی مفاد کے بدلے فروخت مت کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے (یعنی اپنی ذات کے مفاد کو ترجیح دو گے) تو خدا کے ہاں سے تمہیں خیر ملے گا (۱۶/۹۵)۔ دوسری جگہ انہیں خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ کہا گیا ہے (۶۴/۱۶)۔ انسانی ذات پر ایمان جن لوگوں کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا ہوتا، وہ اس قسم کے ٹکراؤ میں، بہتری اس میں سمجھتے ہیں کہ مادی مفاد کو ترجیح دی جائے۔ خیر و شر کے امتیاز میں یہی غلط نگہی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ (۲/۲۱۶)۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اس میں تمہارے لئے خیر ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک شے کو بہت مرغوب رکھو اور وہ تمہارے لئے موجبِ شر ہو۔ خیر اور شر کے امتیاز میں اس قسم کے التباس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے تم اپنے علم کو معیار قرار نہ دو۔ بلکہ علمِ خداوندی (وحی) کو اساس اور بنیاد قرار دو۔ جسے وہ خیر کہے اسے خیر سمجھو اور جسے وہ شر قرار دے اُسے شر سمجھو۔ طبعی زندگی اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ کا سنگین ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں انسان کو، حق کے تحفظ کی خاطر، جان تک دے دینی پڑے اُسے معرکہ

جہاد (یا قتال) کہا جاتا ہے۔ ایسے نازک موقع پر قرآن کی تاکید یہ ہے کہ تم، بلا خوف و خطر، سربکف میدانِ کارزار میں آجاؤ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ (۹/۴۱)۔ اگر تم انسانی زندگی کی اصل و حقیقت پر نگاہ رکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہی چیز تمہارے لیے موجبِ خیر ہے۔ انسان اس باب میں دھوکا اس لئے کھاجاتا ہے کہ طبیعی زندگی کے مفاد اس کے بالکل قریب، سامنے پڑے دکھائی دیتے ہیں، اور خیر کے نتائج کو سامنے آنے میں وقت لگتا ہے۔ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ٥ (۱۷/۱۱)۔ اور صرف طبیعی زندگی پر نگاہ رکھنے والا انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔

جب مادی مفادات اور انسانی ذات کے مفاد میں تصادم ہو، تو اس وقت انسان اس بات کا (TEST) کرتا ہے کہ اس کی ذات میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ اگر اس کی ذات مستحکم ہوگی

ابتلا، یعنی احتساب خویش

تو وہ اس تصادم میں، مادی مفادات کی جاذبیت سے مغلوب نہیں ہوگا۔ اسی مرحلہ کو ابتلا کہا جاتا ہے۔ یعنی انسان کا اپنے آپ کو (TEST) کرنے کا موقع۔ جب اس قسم کے مواقع پر انسانی ذات، مادی جاذبیتوں پر غالب آجائے تو اس سے اس میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے اور اسی قسم کی استحکام یافتہ ذات ہے، جو موت سے بھی مر نہیں سکتی۔ اسی لئے قرآن نے موت کو، انسانی ذات کے استحکام کے پرکھنے کی کسوٹی بتایا ہے۔ (۲۱/۳۵؛ ۶۷/۲)۔ اور اسی لئے اس نے کہا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس طرح نہ کرو کہ اگر ان کی پابندی سے مفاد حاصل ہوتے ہوں تو تم ان کی اطاعت کرو اور جب اس سے نقصان ہوتا ہو تو ان سے اعراض برتو۔ یہ اندازِ زیست تباہی کا موجب ہے۔ (۲۲/۱۱)

اب آپ سوچئے کہ جب قرآنی نقطۂ نگاہ سے، وہ لوگ خاسر و نامراد رہیں گے جن کی نگاہوں میں انسانی ذات کے مفادات کی اہمیت کم ہو جائے، تو جو لوگ سرے سے انسانی ذات (فلہٰذا حیات

عصرِ حاضر کا انسان

آخرت) کے قائل ہی نہ ہوں، وہ انسانی زندگی کے حقیقی نفع اور نقصان میں کیا امتیاز کر سکیں گے۔ عصرِ حاضر کے انسان کی یہی کیفیت ہے اور اسی کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار | عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا | آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (۱۷/۱۱)۔
جسے خیر کو طلب کرنا چاہیئے تھا، وہ شر کو آوازیں دے دیکر بلاتا رہتا ہے!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خیر و شر خود انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ فطرت کی قوتوں اور خود اپنی صلاحیتوں کو مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے تو اس کا نتیجہ خیر ہوتا ہے، اور اگر وہ انھیں، ان اقدار کے خلاف استعمال کرتا ہے، تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ اس خیر و شر کے تولنے کے لئے، خدا کے قانونِ مکافات کے ترازو، ہر آن کھڑے ہوتے ہیں، اور انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ، اسی وزن کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر خیر کا پلڑا جھکتا ہے تو زندگی کامیاب ہے۔ اگر وہ ہلکا رہا، تو اس کی زندگی ناکام و نامراد رہی۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (۹۹/۸-۹)۔ اس میزان کی رُو سے، انسانی اعمال کے خیر اور شر کا ذرّہ ذرّہ سامنے آجائے گا۔ (نیز دیکھئے ۲/۱۱۰، ۲/۲۱۵، ۲۷/۸۹، ۲۸/۸۰، ۷۳/۲۰)۔ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ خیر و شر انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ نہیں کہ خدا نے ہر انسان کے لئے خیر اور شر پہلے ہی سے مقدّر کر رکھا ہے (یعنی جو مقرر کر رکھا ہے) وہ یہ ہے کہ انسان کے فلاں عمل کا نتیجہ خیر ہوگا اور فلاں کا شر، اور یہ چیز انسان کے اختیار و ارادہ پر چھوڑ رکھی ہے کہ وہ جس طرح کا عمل چاہے، کرے۔ اسی کے مطابق اس کا نتیجہ اس کے سامنے آجائے گا ـــ دنیاوی زندگی میں بھی اور اُخری میں بھی۔

نفع اور نقصان

قرآنِ کریم میں، خیر و شر کے لئے نفع اور ضرر کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ فرق صرف الفاظ کا ہے، ورنہ جو اصول اور قانون، خیر و شر کے لئے مقرر ہے، وہی نفع اور نقصان کے لئے ہے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان ہنوز رموزِ کائنات سے آگاہ نہیں ہوا تھا تو وہ فطرت ـــ

کی مہیب قوتوں سے ڈر کر، ان کے سامنے گڑگڑاتا اور سجدہ ریز ہوتا تھا، تاکہ وہ ان کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرّت کے اسی احساس نے، اس کے ذہن میں ایسی ان دیکھی قوتوں کا تصور پیدا کیا جسے اس نے دیوی، دیوتا کہہ کر پکارا اور اس کے بعد، ان کے محسوس مجسّمے تراش کر ان کی پرستش شروع کردی۔ قرآن نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرایا اور اسے بتایا کہ جن قوتوں کو وہ اپنا مسجود سمجھ رہا ہے، وہ سب اس کے تابعِ فرمان پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے لئے

دیوی دیوتا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے

اس نے بار بار کہا کہ جن باطل خداؤں کی تم پرستش کرتے ہو، ان میں تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کی کوئی قوت نہیں، اس لئے تم ان کے سامنے جھک کر، شرفِ انسانیت کی تذلیل کیوں کرتے ہو۔ وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَا يَضُرُّهُمْ (۲۵/۵۵) "یہ لوگ، خدا کو چھوڑ کر، ایسے معبودانِ باطل کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔" (جیساکہ اوپر کہا گیا ہے، قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو دہرایا ہے۔ (مثلاً ۵/۷۶ ؛ ۶/۱۷ ؛ ۶/۷۱ ؛ ۱۰/۱۸ ؛ ۲۱/۶۶ ؛ ۲۲/۱۲ ؛ ۴۸/۱۱)۔ ان لوگوں سے کہا گیا کہ تمہیں نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت تو ایک طرف، یہ تو خود اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ وَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا (۲۵/۳ ؛ ۱۳/۱۶)

دیوی، دیوتاؤں کے بعد، انسان اس وہم میں بھی مبتلا تھا کہ بزرگ اور خدارسیدہ انسان، دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس خیالِ باطل کے ازالہ کے لئے، ایسا

کوئی بزرگ انسان بھی نہیں

اندازِ تنبیہہ اختیار کیا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مسلمانوں کے نزدیک، حضورِ رسالتمآب سے زیادہ مقدس اور بزرگ ہستی اور کون ہو سکتی تھی (اور ہو سکتی ہے)۔ قرآن کریم نے خود رسول اللہ کی زبانِ مبارک سے یہ اعلان کرا دیا کہ قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا ...... (۷/۱۸۸ ؛ ۱۰/۴۹) ان سے کہہ دو کہ میں خود اپنی ذات کے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ میرے لئے بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق ہی ہوتا ہے۔

لیکن بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں نقصان تو پہنچتا ہے۔ اس کے لئے کہہ دیا۔

"اِذنِ اللّٰہ" کے مطابق ہوتا ہے۔ لَیْسَ بِضَآرِّہِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ[1] (۵۸/۱۰)۔ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ اِذن اللّٰہ سے مراد خدا کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ اس لئے کہا یہ گیا ہے کہ دوسرا شخص تمہیں نقصان اس لئے پہنچا دیتا ہے کہ تم نے قانونِ خداوندی کے مطابق اپنی حفاظت کا سامان نہیں کیا ہوتا۔ سورہ آلِ عمران میں ہے کہ ان مخالفین (منافقین) کی کیفیت یہ ہے کہ اگر تمھیں خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں تو یہ بات انھیں بہت گراں گزرتی ہے اور

غلط معاشرہ میں انسانوں کی طرف سے نقصان

اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس سے یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (۳/۱۱۹)۔ اگر تم ثابت قدمی اختیار کرو گے اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو گے تو ان کی کوئی سازش تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَلٰکِنْ کَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ٥ (۷/۹۶)۔ اگر ان بستیوں کے رہنے والے قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرتے تو ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے لیکن انہوں نے ان قوانین کی تکذیب[2] کی تو ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا مواخذہ ہوگیا ـــــ یہاں بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ نے واضح کر دیا کہ "اِذن اللّٰہ" کے مطابق نقصانات کس طرح ہوتے ہیں۔ یہ سب انسان کے اپنے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر تم صحیح روش پر چلتے رہو تو تمہیں کوئی شخص نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ (۵/۱۰۵)۔

لیکن یہاں پھر وہی بات سامنے آجاتی ہے جو پہلے بھی ہماری توجہ کا مرکز بن چکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک شخص صحیح راستے پر چلنے کے باوجود، دوسروں کے ہاتھوں نقصان اٹھاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ایسا کچھ غلط معاشرہ میں ہوتا ہے اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس معاشرہ

---

[1] اس آیت میں شیطان کا ذکر ہے۔ ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے کہ شیطان سے مراد کیا ہے۔

[2] پہلے بتایا جا چکا ہے کہ "تکذیب" کسے کہتے ہیں۔

اس کا علاج! کو اُلٹ کر، اس کی جگہ (قوانینِ خداوندی کے مطابق) صحیح معاشرہ قائم کردیا جائے۔ اقبالؔ نے اس حقیقت کو ان درخشندہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ او بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسمان
بر کَنَد بنیادِ موجودات را	می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار

وہ تقدیر کے ہاتھوں بیٹھا روتا نہیں رہتا ——— نامساعد "**تقدیر**" کو الٹ کر اس کی جگہ، اپنی قوتِ بازو سے مساعد "تقدیر" لے آتا ہے۔ چونکہ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے، اس لئے خدا، اسے خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۶/۱۷؛ ۱۰/۱۰۷)۔ اگر تمہیں کوئی نقصان "خدا کی طرف سے" (یعنی اس کے قوانین کے مطابق) پہنچے تو اس کا ازالہ بھی اس کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے، اس کے قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ اس نے ہر بات کے پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔ (نیز ۳۹/۳۸)۔

ایک اہم نکتہ

ہم نے اوپر کہا ہے کہ انسان جو کام، قوانینِ خداوندی کے مطابق کرتا ہے، خدا انہیں اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ یہ بڑا اہم **نکتہ** ہے اور (اس لئے) مزید وضاحت کا متقاضی۔ جنگِ بدر میں، (جو حق و باطل کا اہم ترین معرکہ تھا) مجاہدین (جنہیں خدا نے اپنا لشکر، حزب اللہ کہہ کر پکارا تھا) مصروفِ تیغ زنی اور تیر اندازی ہیں اور اس طرح حق و عدل کے مخالفین کی گردنیں اڑا رہے ہیں۔ اس

جنگِ بدر کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ تم انہیں قتل نہیں کر رہے تھے، خدا خود قتل کر رہا تھا۔ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ

رَمَیْتَ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸/۱۷)۔ اس وقت تم تیر نہیں چلا رہے تھے، خدا چلا رہا تھا۔ تلواریں تمہاری تھیں، لیکن ان کی دھار پر "تقدیریں" ہماری کارفرما تھیں۔ تیر تمہارے تھے، لیکن ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹی ہوئی تھیں۔ اس عظیم حقیقت کو غالبؔ نے کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است
امّا کشادِ آں زکمانِ محمدؐ است

اور حدیبیہ کے مقام پر، جب یہ سرفروشانِ اسلام، نبی اکرمؐ کے دستِ مبارک پر، اپنی جان نثاری کے

بیعتِ رضوان

اس معاہدہ کی تجدید کر رہے تھے جو انھوں نے خدا سے باندھا تھا (کہ ہم نے اپنا مال اور اپنی جان تیرے ہاتھ فروخت کر دیئے ہیں۔ ۹/۱۱۱)۔ تو اس حسین و سادہ و رنگین منظر کا نقشہ، قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط جو لوگ (اے رسولؐ!) تجھ سے معاہدہ استوار کر رہے تھے، وہ تجھ سے نہیں بلکہ درحقیقت خدا سے اپنے معاہدہ کی تجدید کر رہے تھے۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج (۴۸/۱۰) اس "بیعت" کے وقت، ان کے ہاتھ پر تیرا ہاتھ نہیں، خود خدا کا ہاتھ تھا۔ جب خدا کا پروگرام، اس طرح انسانوں کے ہاتھوں بروئے کار آتا ہے تو، انسان خود خدا کی تقدیر بن جاتا ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلمان
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

دوسری جگہ علامہ کہتے ہیں۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

مختصراً، کائنات میں جو کچھ بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق ظہور میں آتا ہے، اسے خود خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یعنی کہا یہ جاتا ہے کہ خدا خود ایسا کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک دیدہ ور (حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ میں) پکار اٹھتا ہے کہ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ لا خدا وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر سیدھا راستہ دکھایا۔ وَ الَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ لا وہی ہے جو

مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ ۟ۙ ؀۸۰ اور جب میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ۟ۙ ؀۸۱ (۲۶/۸۱-۸۰)۔ پھر وہی مجھے مارے گا اور مرنے کے بعد وہی دوبارہ زندہ کرے گا۔

اشیائے کائنات کے خواص اور تاثیرات ہی نہیں، خود انسان کو بھی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں، انہیں بھی خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، حتیٰ کہ انسان جو کام ان فطری صلاحیتوں کی رُو سے کرتا ہے، ان کی نسبت بھی خدا کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً سورۃ الرحمٰن میں ہے۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ عَلَّمَہُ الۡبَیَانَ (۳-۴/۵۵)۔ خدا نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا۔ ظاہر ہے کہ انسانی بچے کو بولنا، خدا نہیں سکھاتا، اس کا ماحول سکھاتا ہے لیکن چونکہ انسان میں قوّتِ گویائی خدا کی عطا کردہ ہے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو بولنا سکھایا۔ دوسری جگہ ہے۔ اَلَّذِیۡ عَلَّمَ بِالۡقَلَمِ (۹۶/۴) خدا وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ (نیز ۲/۲۸۲)۔ یعنی اس میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ تحریر کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔ سورۃ مائدہ میں کہا ہے کہ شکاری جانور جو شکار پکڑ کر لائیں وہ بھی تمہارے لئے حلال ہے۔ تُعَلِّمُوۡنَھُنَّ مِمَّا عَلَّمَکُمُ اللّٰہُ ۫ (۵/۴)۔ وہ جانور جنہیں تم اس طرح شکار کرنا سکھاتے ہو جس طرح تمہیں خدا نے سکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کسی انسان کو یہ نہیں سکھاتا کہ شکار کس طرح کرنا چاہیئے۔ اس نے انسان میں اس کی صلاحیت رکھ دی ہے اور جو کچھ وہ اس فطری صلاحیت کے مطابق کرتا ہے، اسے خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ خدا کے قوانین کی رُو سے ہوتا ہے، یا وہ انسان جو کچھ فطرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کے مطابق کرتا ہے وہ اسے براہِ راست خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے جسے پیشِ نظر رکھنے سے، قرآنِ کریم کے وہ تمام مقامات بآسانی سمجھ میں آ جاتے ہیں، جن میں، اس نکتہ کے سامنے نہ ہونے سے، ذہن میں کئی قسم کے اشکال پیدا ہوتے اور شکوک اُبھرتے ہیں۔ ان مقامات کی تفصیل آئندہ صفحات میں، مختلف ابواب میں سامنے آئے گی۔

❀

شیطان ——— ابلیس

اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری نہ قبول کرنے کے سلسلہ میں، انسان نے ایک اور سپر اپنے سامنے رکھ چھوڑی ہے جسے شیطان یا ابلیس کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ شیطان کہتے کسے ہیں (اس موضوع پر میں نے تفصیلاً اپنی کتاب، ابلیس و آدم، میں لکھا ہے۔ اس مقام پر چند اشارات پر اکتفا کیا جائے گا)۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(۱) انسان میں، حیوانی سطح زندگی کی جبلتیں (INSTINCTS) بھی موجود ہیں، جنہیں جذبات کہا جاتا ہے اور عقل بھی۔ عقل کا کام زندگی کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ہے۔

(۲) انسانی زندگی، مستقل اقدار کے تابع رہنے کا نام ہے۔

(۳) جب کسی مستقل قدر اور حیوانی جبلت (جذبہ) کے مفاد میں ٹکراؤ ہوتا ہے، تو اس وقت اگر مستقل قدر غالب رہے تو عقل، اس کے تقاضوں کو رُو بہ عمل لانے کی تدابیر اختیار کرتی ہے اور اگر حیوانی جذبہ غالب آجائے، تو عقل اس کے تابعِ فرمان کام کرتی ہے۔ چونکہ اُس وقت جذبات اور عقل، مستقل اقدار کے تابع نہیں رہتے، اس لئے انھیں جذباتِ سرکش اور عقلِ بیباک کہا جاتا ہے۔

انہی جذباتِ سرکش و عقلِ بے باک کو، قرآنی اصطلاح میں شیطان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اربابِ لغت میں سے بعض کا خیال ہے کہ "شیطان" عربی زبان کا لفظ ہے اور شَاطَ۔ یَشِیطُ سے مشتق، جس کے معنی بھڑک اُٹھنے کے ہیں۔ ہم نے شیطان کا مذکورہ صدر مفہوم، انہی معانی کی رُو سے مستنبط کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے (THE HINDERER) کے ہیں۔ یعنی وہ قوتیں جو مستقل اقدار کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں۔ بات یہ بھی وہی ہے۔

علم النفس (سائیکولوجی) کی رُو سے، جب انسان اپنے سرکش جذبات سے مغلوب ہو جائے تو اس سے (AGGRESSION) پیدا ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے پر تغلب حاصل کرنے کا جذبہ۔ ان حالات میں انسان کا دماغ متوازن نہیں رہتا۔ جب یہ جذبہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو اس سے انسان کو،

اپنے کیے پر ندامت ہوتی ہے جس کا نتیجہ مایوسی (FRUSTRATION) ہوتا ہے۔

لفظ ابلیسؔ کا مادہ (ب۔ ل۔ س) ہے جس کے معنی مایوس ہو جانے کے ہیں۔ قرآنِ کریم نے شیطانؔ اور ابلیسؔ ایک ہی سکہّ کے دو رُخ بتائے ہیں۔ یعنی جذبات کی سرکشی جس کا آخری نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ شیطانؔ، درحقیقت انسان کے اپنے ہی سرکش جذبات کا نام ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے (شیطان کے متعلق) کہا ہے کہ

جہاں تا از عدم بیروں کشیدند ضمیرش سرد و بے ہنگامہ دیدند
بغیر از جانِ ماسوزے کجا بود ترا از آتشِ ما آفریدند

اور دوسری بات ہم نے یہ دیکھ لی کہ جذبات اور عقل، بذاتِ خویش نہ شر ہیں نہ خیر۔ یہ محض قوتیں ہیں جن کا غلط استعمال، شر کے نتائج پیدا کرتا ہے اور صحیح استعمال، خیر کے نتائج۔ لہٰذا، جو نظریہ یا عقیدہ جذبات کو قابلِ نفرت، فلہٰذا کشتنی قرار دے اور عقل کو مذموم، وہ اسلام کی بارگاہ میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا۔ جذبات اور عقل، خدا کی تخلیق ہیں اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا، شر کو پیدا نہیں کرتا۔ وہ خیرِ مطلق کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے اس کی تخلیقات میں سے کسی شے کو بالذات شر قرار دینا، خالق کے خلاف (معاذ اللہ) سنگین الزام ہے۔

لیکن ایران کی مجوسیت نے شیطان (اہرمن) کو، شر کی مستقل بالذات قوت قرار دیا اور اسے ایسی ہستی ٹھہرایا جو خارج از انسان اپنا وجود رکھتی اور یزداں سے برسرِ پیکار رہتی ہے۔

شیطان کے، خارج از انسان ہستی ہونے کے نظریہ سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا جو اپنے آپ کو مجبور قرار دے کر، اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے سے فرار کی راہیں تلاش کرتے

جبر کا عقیدہ

تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ انسان سے سب غلط کام، شیطان کراتا ہے۔ ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ ابلیس نے حکمِ خداوندی سے سرتابی برتی تھی لیکن یہ کہہ کر اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ معصیت مجھ سے خود تُو نے (خدا نے) کرائی ہے۔ مجھے اس کا اختیار کہاں تھا — گویا، اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار، خود ابلیسیت ہے۔

ان تصریحات کے بعد آیئے، ہم دیکھیں کہ انسانی اعمال اور شیطان کے تعلق کے سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے۔

قرآنی تصریحات

قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے کہ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۷/۲۰)۔ شیطان نے ان دونوں (آدم اور حوا) کے دل میں وسوسہ ڈالا اور سورۂ قٓ میں ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۵۰/۱۶) ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس، اس میں کیا کیا وسوسے پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ شیطان، خود نفسِ انسانی ہی ہے۔ کوئی خارج از انسان ہستی یا قوت نہیں۔

جنگِ اُحد میں کچھ لوگ (منافقین) میدانِ جنگ سے مُنہ موڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ ان کے متعلق کہا کہ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا (۳/۱۵۴)۔ شیطان نے، ان کے اعمال کی وجہ سے، ان کے قدموں میں لغزش پیدا کر دی۔ اس سے واضح ہے کہ جسے "شیطنت" کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے اپنے ہی غلط اعمال کا دوسرا نام ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب انسان، جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو اس کا دماغی توازن صحیح نہیں رہتا۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ جہنم میں جانے والوں سے کہا جائے گا کہ تم نے شیطان (جذبات) کو اپنے اوپر غالب آنے دیا، اور اس طرح تمہاری عقل مفلوج ہو گئی، تو تم جہنم میں پہنچ گئے۔ (۶۰- ۳۶/۶۲)۔

سورۂ ابراہیم میں، قیامت کے دن، شیطان اور اس کے متبعین کا ایک تمثیلی مکالمہ آیا ہے۔ وہاں غلط کار انسان، شیطان کو الزام دیتے ہیں کہ تم نے ہم سے ایسے کام کرائے تھے۔ اس کے جواب میں شیطان کہتا ہے کہ تم غلط کہتے ہو۔ میرا تم پر کوئی اقتدار اور اختیار نہیں تھا جو تم سے تمہاری مرضی کے خلاف جبراً کچھ کرا لیتا۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ تمہیں آواز دی تھی۔ تم نے خود اس آواز پر لبیک کہا اور میرے پیچھے چل پڑے۔ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ (۱۴/۲۲)۔ آج تم مجھے ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ اس لئے کہ تمہارے اعمال کا ذمہ دار میں نہیں، خود تم ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان، جذبات کی موجودگی میں، ان کے غلبہ سے بچے کیسے؟

تصوف نے کہا کہ اس کا طریق یہ ہے کہ جذبات کو فنا کر دیا جائے۔ (اسے ان کی اصطلاح میں نفس کشی کہتے ہیں)۔ لیکن جس طرح ان کا "ترکِ دنیا" کا نظریہ ناممکن العمل، فلہذا فریبِ نفس ہے، اسی طرح جذبات کو فنا کر دینے کا نظریہ بھی ناقص العمل اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ انسانی جذبات فنا ہو ہی نہیں

انسان، جذبات کے غلبے سے کس طرح محفوظ رہ سکتا ہے

سکتے اور اگر (بفرضِ محال) یہ فنا ہو بھی سکتے ہوں، تو ان کا فنا کر دینا، حماقت اور خسرانِ مبین ہے۔ جذبات تو (عقل کی طرح) انسان کی متاعِ گراں بہا ہیں۔ زندگی کی شادابیاں، تازگیاں اور ندرت کاریاں آرزوؤں سے وابستہ ہیں اور آرزوؤں کی بیداری جذبات کی رہینِ منت ہے۔ اگر پیکرِ انسانی میں جذبات کی حرارت نہ رہے تو وہ بے حس و حرکت برف کا تودہ بن کر رہ جائے۔ جذبات کے سلسلہ میں جب قرآن کی راہ نمائی سامنے آتی ہے تو روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور صاف نظر آ جاتا ہے کہ سرچشمۂ وحی سے عطا شدہ روشنی اور ذہنِ انسانی کے تراشیدہ قیاسات میں کیا فرق ہے۔ اس نے پہلے ان لوگوں کو سامنے لاتے ہوئے جو بلاحدود و قیود جذبات کے اتباع کا مسلک اختیار کئے ہوں، کہا کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے جس نے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وہ عقل و علم رکھنے کے باوجود، غلط راہوں پر پڑ جاتا ہے اور جذبات سے مغلوبیت کی وجہ سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً۔ اس کے دل اور کانوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے دیکھنے بھالنے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں معطل ہو جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ مفلوج۔ اس کے بعد ہے فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (۴۵/۲۳) یہ صرف خدا کی ہدایت ہے جو اسے اس گمراہی سے بچا سکتی ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اندھا دھند اپنے حیوانی جذبات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان سے یہ نہیں کہا کہ وہ جذبات کو فنا کر دیں، ان سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اس نے کہا ہے کہ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸/۵۰)۔ گمراہ وہ ہوتا ہے، جو ہدایتِ خداوندی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔ یہاں قرآن نے بات بالکل واضح کر

دی کہ انسانی جذبات، شر نہیں۔ وہ شر اس وقت بنتے ہیں جب انہیں بے لگام چھوڑ دیا جائے۔ اگر انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع رکھا جائے تو پھر ان کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے

ابلیس کو مسلمان کر لو

حضور نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں ـــــ جو تابندہ موتیوں کی طرح چمکتی ہے، نہایت بلیغ اور دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ کیا حضورؐ کا بھی ابلیس ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ، ہاں! میرا بھی ابلیس ہے لیکن

میں نے اپنے ابلیس کو مسلمان کر لیا ہے۔

دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ جذبات کو فنا نہیں کیا۔ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا۔ البتہ ان سے کام مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق لیا۔ اس طرح، یہ بے پناہ قوت، تخریبی کے بجائے، یکسر تعمیری ہو گئی۔ یعنی سیلاب کو ساحلوں کا پابند بنا دیا اور اس طرح وہ تباہیوں کا موجب بننے کے بجائے، آبادیوں اور شادابیوں کا باعث بن گیا۔ انسان میں جس طرح، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے، اسی طرح اسے اس بات کی قوت بھی عطا کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو بھی مسخر کر سکے۔ قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں کہا گیا ہے کہ جب ابلیس کو دھتکارا گیا تو اس نے خدا سے کہا کہ

ابلیس کو اپنے تابع کیا جا سکتا ہے

تو نے اپنے اس "چاہیتے" کی خاطر مجھے ذلیل و خوار تو کیا ہے، اب دیکھ کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں اس کی ناک میں نکیل ڈال کر، اسے اس قدر حیران و سرگرداں پھراؤں گا، اور پھر اس طرح تباہ و برباد کروں گا کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ (۶۲ - ۶۳ / ۱۷)۔ ابلیس کے اس چیلنج کے جواب میں، بارگہِ ایزدی سے کہا گیا کہ جو کچھ تیرے جی میں آئے کر دیکھ۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۷/۶۵)۔ میرے بندوں پر ـــــ یعنی جو میرے قوانین کی پیروی کریں گے ان پر ـــــ تجھے کبھی غلبہ و تسلط حاصل نہیں ہو سکے گا۔ (۳۸/۸۳)۔ اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ۔ جو لوگ خدا کے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور ان کی محکمیت پر بھروسا کریں گے، ان پر ابلیس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○ (۹۹ - ۱۰۰/۱۶)۔ اس کا زور

چلے گا ان لوگوں پر جو قوانینِ خداوندی سے یکسر اعراض برتیں گے، یا ان پر جو ان سے یکسر اعراض تو نہیں برتیں گے، لیکن ان قوانین کی خالصتہً پیروی نہیں کریں گے بلکہ ان کے ساتھ غیر خداوندی قوانین بھی شامل کرلیں گے۔

قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والوں کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ، شیطان کی پیروی کرنا تو ایک طرف رہا۔ اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱)۔ اگر کبھی شیطان کا خیال یونہی گھومتے گھماتے ان کے ذہن میں آجائے، تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں اور اس سے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہوجاتی ہے جس سے ان کی راہیں دُور دُور تک روشن ہوجاتی ہیں اور ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھنے نہیں پاتا۔ یہی وہ

اسوۂ یوسفیؑ

"برہانِ رب" تھی جسے دیکھ کر حضرت یوسفؑ نے، عزیزِ مصر کی بیوی کے پھیلائے ہوئے شیطنت کے جال کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا اور یوں ایک دنیا کو دکھا دیا کہ "خدا کے مخلص بندوں پر شیطان غالب نہیں آسکتا۔" اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ۝ (۱۲/۲۴)۔ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس مقام پر، سطح بین ذہنیتوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ، انسان میں شر کا مقابلہ کرکے اسے مغلوب کرلینے کی قوت سہی، لیکن خدا نے ایسا نظام ہی کیوں قائم کیا جس میں ان دو قوتوں میں ٹکراؤ ہوتا رہے۔ اس میں کیا مصلحت تھی؟

اس قسم کا اعتراض کرنے والے اتنا نہیں سوچتے کہ یہ ٹکراؤ، انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کا لازمی نتیجہ تھا۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) صاحبِ اختیار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس

اس کی مصلحت

کے سامنے دو ممکنات (TWO POSSIBILITIES) ہوں، اور اسے اس کا اختیار ہو کہ وہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلے۔ جس کے سامنے دو راستے نہ ہوں، ایک ہی راہ ہو، اس کے لئے راستے کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجبور کہا ہی اُسے جاتا ہے جس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔ جس راستے میں دو راہا (CROSS ROADS) نہ آتا ہو، اس میں، سوچنے اور صحیح اور غلط راستے میں امتیاز و انتخاب کا موقع ہی نہیں آتا۔ سفرِ حیات میں یہی وہ انتخاب (CHIOCE) کا دوراہا ہوتا ہے جہاں انسان کی

صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اسی کو ٹکراؤ کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں قانونِ ارتقاء (LAW OF EVOLUTION) کارفرما ہے اور ارتقاء کا راز ہی ٹکراؤ میں ہے۔ اس قانون کی رو سے، استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متصادم و متحارب قوتوں سے نبرد آزما ہوا جائے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے لیکن اگر اس کے راستے میں پتھروں کی (FALLS) نہ آئیں تو اس کی پرسکوت روانی، آہستہ آہستہ، مبدّل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں، جمود و تعطّل کا جوہڑ بن کر رہ جائے۔ بربط کے تاروں میں خوابیدہ نغمات، بلا مضراب کبھی بیدار نہیں ہوتے۔ آئینۂ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اسے سنگِ فساں پر صیقل نہ کیا جائے۔ چقماق کی شعلہ فشانی، پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ تصادم و تزاحم کا یہی قانون ہے جس سے انسان کی مضمر قوّتوں میں بیداری پیدا ہوتی ہے ... ... اسے اس کی خودی کی نمود یا ذات کا استحکام کہا جاتا ہے۔ اگر خودیؔ، اپنے غیر سے متصادم نہ ہو تو ہنگامۂ کائنات سرد پڑ جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف ہو جائیں۔ یہ جہانِ رنگ و بو پھر سے مٹی کا گھروندا بن کر رہ جائے۔ خونِ رگِ کائنات کی تپش، خودیؔ کے ولولۂ نمود کی مظہر اور اس کی لذّتِ کش مکش کی رہینِ منّت ہے[1]۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؔ نے اس شوخ انداز میں بیان کیا ہے کہ

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

"بالِ جبریل" میں، علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو، ابلیس اور جبریل کے مکالمہ کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس میں ابلیس، جبریل سے کہتا ہے کہ

گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو!

یہ ہے شیطان کی پوزیشن قرآن کی روشنی میں۔ یعنی انسان کی حیوانی زندگی اور انسانی زندگی کی وہ کش مکش جو اس کی مضمر صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کا ذریعہ بنتی ہے اور جس میں انسان، ہر آن محاسبۂ

---

[1] "ابلیس و آدم" از مصنف، ایڈیشن اوّل، صفحہ ۱۰۸۔

خویش سے یہ دیکھتا اور پرکھتا چلا جاتا ہے کہ اس کی ذات (انسانی زندگی) میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم، حق و باطل کی کش مکش سے تعبیر کرتا ہے جس میں حق (تعمیری پروگرام) بالآخر باطل (تخریبی پروگرام) پر غالب آکر رہتا ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸)۔ ہم، حق کے ہتھوڑے سے باطل کے سر پر چوٹیں لگاتے رہتے ہیں، تا آنکہ باطل کا بھرکس نکل جاتا ہے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں، حق کا یہ غلبہ، اس اجتماعی نظام میں جو مستقل اقدارِ خداوندی کی رو سے قائم کیا جائے، بڑی برق رفتاری سے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس، باطل کا نظام، جس میں حیوانی جذبات کو کھل کھیلنے دیا جاتا ہے، حق کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے کہا کہ، کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں لیکن جن کی عملی حالت یہ ہے کہ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں ان کے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین (طاغوت یا شیطان) کی رو سے ہوتے ہیں۔ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس سے سرتابی برتیں۔ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ○ (۴/۶۰)۔ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ وہ انہیں دُور کی گمراہی میں لے جائے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ قرآنی نقطۂ نظر سے، خیر اور شر (یا اہرمن و یزداں) کا مفہوم و مقصود کیا ہے۔ دو لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ، فطرت کی قوتوں اور خود انسانی صلاحیتوں کے استعمال کے دو طریق ہیں۔ اگر انہیں، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ اگر ان کے خلاف استعمال کیا جائے تو یہ تخریبی نتائج پیدا کرتی ہیں ــــ اور انسان کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ یہ ان دو طریقوں میں سے جونسا طریق جی چاہے اختیار کر لے۔ جو طریقہ وہ اختیار کرے گا اس کے مطابق ان کے نتائج مرتب ہو جائیں گے ــــ یعنی اس کے مطابق یہ خیر یا شر بن جائیں گی۔ فطرت کی قوتوں اور خود اپنی صلاحیتوں سے، اپنے مقاصد کے مطابق نتائج مرتب کرانے کو، اقبال نے "تقدیر شکن قوت" کی

اصلاح سے تعبیر کیا ہے جہاں کہا ہے کہ

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

یہ وہی چیز ہے جسے حضرت عمرؓ نے "خدا کی ایک تقدیر سے، خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف رُخ کرنے" سے تعبیر کیا تھا۔

آٹھواں باب

اگر ..... تو
(قرآنِ مجید میں)

شروع میں بتایا جا چکا ہے کہ قانون (LAW) کی تعریف یہ ہے کہ
اگر .... تو .... ہمیشہ
یعنی اگر یہ (یا ایسا) کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا اور تم جب اور جہاں بھی ایسا کرو گے، اس کا نتیجہ ہمیشہ وہی برآمد ہو گا جو حکم، نظریہ، فارمولا یا کلیہ، ان شرائط کو پورا کرے، اسے قانون کہا جائے گا۔

عدالتی قوانین

دنیا میں قانون کی تین شکلیں معروف ہیں۔ اوّل عدالتی قانون۔ (مثلاً) "اگر تم چوری کرو گے تو تمہیں سزا ملے گی جو تین سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ تک ہو سکتی ہے۔" اس قانون میں آپ دیکھیں گے کہ عمل (چوری کرنا) اور اس کے نتیجہ (قید یا جرمانہ) میں کوئی داخلی ربط نہیں۔ ملک کے ضابطہ قوانین میں چوری کرنے کو جرم قرار دیا گیا ہے اور عدالت کی طرف سے اس جرم کی سزا کا حکم دیا جاتا ہے۔ اگر ملک کے ضابطہ قوانین کی رُو سے چوری کو جرم قرار نہ دیا جاتا، یا چوری کا مرتکب عدالتی مشینری کی گرفت میں نہ آسکے، تو اس عمل (چوری) کا کوئی نتیجہ ہی برآمد نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، عدالتی قوانین میں، عمل کا نتیجہ اس کے اندر مضمر نہیں ہوتا، خارج سے عائد کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوانین کہیں پہلے سے از خود موجود نہیں ہوتے

انہیں وضع کیا جاتا ہے۔ کوئی ملک اپنے لئے جس قسم کے قوانین چاہے وضع کرلے، اور جب جی چاہے، ان میں ردّ و بدل کردے۔ یہی کیفیت معاشرتی (یعنی سوسائٹی کے) قوانین وضوابط کی ہے۔

اب قوانین کی دوسری شق کو لیجئے جنہیں طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) یا قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ آگ میں انگلی ڈالو گے، تو وہ جل جائے گی۔ اس میں آپ دیکھئے کہ اس عمل کا نتیجہ خود اس عمل کے اندر پوشیدہ ہے، کہیں خارج سے وارد نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں کہ اگر کوئی ملک یہ قانون پاس کردے کہ ہمارے ہاں آگ سے انگلی جلے گی نہیں، تو آگ جلانا چھوڑ دے۔ یا کوئی شخص ایسی جگہ آگ میں انگلی ڈالے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو اس وقت اس کی انگلی نہ جلے۔ یہ وہ قوانین ہیں جن پر قانون کی مذکورہ صدر تعریف ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتی ہے۔ یہ قوانین از خود موجود ہیں (انسان کے وضع کردہ نہیں) اور غیر متبدّل بھی ہیں۔

طبیعی قوانین

اب آئیے قوانین کی تیسری شق کی طرف (مثلاً یہ کہ) اگر تم نے محتاجوں کی مدد نہ کی تو تباہ ہو جاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ یہ قانون، "اگر اور تو" کی شرط تو پوری کرتا ہے، لیکن یہ نہ تو عدالتی یا تمدّنی قوانین کے دائرے میں آتا ہے اور نہ ہی طبیعی قوانینِ فطرت کے ذیل میں۔ انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ غیر متبدّل بھی ہیں اور انسانوں کی وضع کردہ نہیں بلکہ خدا کی مقرر کردہ اور اس کی طرف سے بذریعہ وحی عطا شدہ ہیں۔ ان قوانین کا دوہرا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے مطابق عمل کرنے سے، انسانوں کی تمدّنی زندگی سنور جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس سے افراد کی ذات (SELF) یا (PERSONALITY) کی نشوونما ہوجاتی ہے۔ ان اقدار کی صداقت پر یقین وہی شخص رکھ سکتا ہے جو انسانی ذات کے وجود کو تسلیم کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان اقدار کے مطابق عمل کرنے کے لئے **ایمان** (یعنی انسانی ذات، اور وحی خداوندی کی رو سے عطا شدہ مستقل اقدار پر یقین) لاینفک ہے۔ قرآنِ کریم نے ان قوانین کے تمدّنی پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے اور اس گوشہ کو بھی جس کا تعلق انسانی ذات سے ہے۔ مثلاً اس نے زنا کو مستقل اقدار کی خلاف ورزی کہا ہے تو ایک طرف اسے عدالتی جرم قرار دیتے ہوئے اس کی سزا تجویز کی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ اس سے انسانی ذات میں اضمحلال پیدا ہوجاتا ہے۔

مستقل اقدار

وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا (۲۵/۶۸)۔

قرآنِ کریم میں "کتاب اور حکمت" دونوں کو منزّل من اللہ کہا گیا ہے ــــ "کتاب" قانون کا "اگر" کا حصّہ ہے، ــــ اور "حکمت" اس کی "تو" ہے۔ اگر کسی حکم میں "اگر" کے ساتھ "تو" نہ ہو، تو وہ حکم، قانون کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ تمدّنی دنیا میں جب کسی ملک میں لاقانونیّت پھیل جاتی ہے تو اس میں "اگر" تو اپنی جگہ موجود ہوتا ہے لیکن اس کا "تو" غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس میں قانون یہ تھا اگر رشوت لو گے تو ملازمت سے برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ لیکن لاقانونیّت میں ہوتا یہ ہے کہ لوگ رشوت دھڑا دھڑ لیتے ہیں لیکن ملازمت سے برخاست نہیں ہوتے۔ انہیں اس جرم کی سزا نہیں ملتی۔

کتاب اور حکمت

اسی طرح جب دینؔ، مذہب کی سطح پر آجاتا ہے تو اس میں قوانین، ایسے احکام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی تعمیل تو ضروری قرار دی جاتی ہے لیکن ان کا کوئی محسوس نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ ان کی تعمیل یہ کہہ کر کرائی جاتی ہے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے وہ ناراض ہو جاتا ہے۔

دین اور مذہب میں فرق

لیکن دین میں، احکام، قوانین کی شکل میں بروئے کار آتے ہیں۔ ان کی تعمیل سے متعیّنہ نتیجہ مرتّب ہوتا ہے جو اس دنیا میں بھی محسوس شکل میں سامنے آتا ہے اور آخرت میں بھی سامنے آئے گا۔ "کتاب و حکمت" سے یہی مراد ہے۔ کتاب کے ساتھ "حکمت" کو اس لئے واضح کر دیا گیا تاکہ ہم ساتھ کے ساتھ چیک کرتے جائیں کہ حکم پر صحیح صحیح عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی تعمیل سے وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے، جو بتایا گیا تھا، تو اس پر صحیح صحیح عمل ہو رہا ہے۔ اگر وہ نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا تو ہمیں رُک کر دیکھنا ہو گا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ مذہب میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ اس میں انسان اپنی خوش عقیدگی (خوش فہمی) میں مگن رہتا ہے اور نتیجہ سے عمل کے صحیح یا غلط ہونے کی پرکھ نہیں کرتا، اس لئے کہ یہ حقیقت اس کے سامنے ہی نہیں ہوتی کہ اس حکم کی تعمیل سے کوئی محسوس نتیجہ سامنے آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی فارمولا پر آپ عمل کریں اور اس کا معیّنہ نتیجہ مرتب نہ ہو، لیکن اس کے باوجود آپ

اسی طرح عمل کئے جائیں، تو آپ کی ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اسے قرآنِ کریم حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی ان کے اعمال ضائع چلے گئے، کوششیں بے نتیجہ رہ گئیں۔

دین میں ہر کوشش، جو قانون کے مطابق کی جائے نتیجہ خیز ہوتی ہے، مذہب میں رائگاں جاتی ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے ہم جستہ جستہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ لیکن اس مقام پر ایک اور مقصد کے لئے اس کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ "اگر" کا سوال صرف اُس کے لئے پیدا ہوتا ہے جو صاحبِ اختیار ہو۔ مجبور کے لئے "اگر" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "اگر تم نے یہ کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا ___" اس کے معنی یہ ہیں کہ جس سے ایسا کہا جارہا ہے اسے اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایسا کرے اور چاہے ایسا نہ کرے۔ یہ صرف آنکھوں والے سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر راستہ دیکھ کر چلے تو تم گڑھے میں گرنے سے بچ جاؤ گے۔ اندھے سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اگر تم راستہ دیکھ کر چلے تو تم گڑھے میں نہیں گرو گے۔ لہذا، قرآنِ کریم کا انسانوں سے یہ کہنا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ ٹھہراتا ہے، مجبور نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے عام طور پر "اگر ...... تو" (إِنْ ...... فَ) کی ترکیب استعمال کی ہے اور کہیں کہیں ایسا بھی کہا ہے کہ "تمہیں ایسا کرنے کو کہا گیا ہے تاکہ ......" (لَعَلَّكُمْ ......)۔ دونوں صورتوں میں مقصد ایک ہی ہے۔

چند قرآنی مثالیں

اس مقام پر ہم قرآنِ کریم کے چند ایک قوانین پیش کر کے اس کی "اگر ...... تو" کی حکمت سامنے لانا چاہتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ انسان اپنے عمل میں صاحبِ اختیار ہے۔

(۱) ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ جنّت کی زندگی ہے۔ یعنی اگر ایمان لاؤ گے اور اعمالِ صالح کرو گے تو اس کا نتیجہ جنّت کی زندگی ہوگا۔ (۲/۲۵)

(۲) ہماری ہدایات کا اتباع کرو گے تو خوف و حزن نہیں ہوگا (۲/۳۸)۔ اپنا مال، خدا کی راہ میں کُھلا رکھو گے تو خوف و حزن نہیں ہوگا۔ (۲/۲۶۲ ؛ ۲/۲۷۴ ؛ ۲/۲۷۷ ؛ ۶/۴۸ ؛ ۴۶/۱۳)۔

(۳) اگر کتاب (ضابطۂ قوانین) کے بعض حصوں کو مانو گے اور بعض سے انکار کرو گے تو اس سے دنیا

یں ذلیل وخوار ہو گئے اور آخرت میں عذاب شدید میں مبتلا۔ (۲/۸۵)۔

(۴) اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو انہیں بہترین بدلہ ملتا۔ (۲/۱۰۳)

(۵) اگر تم میرے قوانین کو سامنے رکھو گے، انہیں بھلاؤ گے نہیں، تو میں تمہارے شرف و مجد میں اضافہ کروں گا۔ (۲/۱۵۲)

(۶) اگر یہ اہلِ کتاب، (قرآن پر) ایمان لے آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ (۳/۱۰۹)

(۷) اگر تم مومن ہو گے تو سب پر غالب رہو گے۔ (۳/۱۳۸)

(۸) اگر تم خدا کی راہ میں قتل کئے جاؤ گے یا مر جاؤ گے تو خدا کے ہاں سے مغفرت اور رحمت عطا ہوگی۔ (۳/۱۵۶)۔

(۹) اگر تمہیں خدا کی نصرت حاصل رہی، تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔ (۳/۱۵۹)۔ لیکن خدا کی مدد اُسے حاصل ہوتی ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ (۲۲/۴۰ و ۴۷/۷)۔

(۱۰) اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقویٰ شعار ہو گے تو تمہارے لئے اجرِ عظیم ہوگا۔ (۳/۱۷۸)۔

(۱۱) اگر تم کبائر (بنیادی لغزشوں) سے بچو گے تو تمہاری ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ (۴/۳۱)۔

(۱۲) اگر یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ شعار ہوتے تو ہم ان کی زندگی کی ناخوشگواریاں کو دور کر دیتے (۵/۶۵)۔ اگر یہ وحیِ خداوندی کا اتباع کرتے رہتے تو انہیں زمین اور آسمان سے کھانے پینے کو ملتا رہتا۔ (۵/۶۶)۔ ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھل جاتے۔ (۷/۹۶)۔

(۱۳) جو ایمان لائے اور پھر اپنے ایمان کے ساتھ ظلم کو شامل نہ کرے، تو اسے امن نصیب ہو جاتا ہے اور کشادگی راہوں کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ (۶/۸۳)۔

(۱۴) اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو تمہیں امتیازی زندگی مل جائے گی۔ (۸/۲۹)۔

(۱۵) اگر تم بیس مجاہد ثابت قدم ہو گے تو دو سو پر غالب آجاؤ گے ـــــ یہ اس وقت ہوگا جب تم، سامانِ حرب و ضرب کے اعتبار سے فریقِ مخالف کے برابر ہو گے۔ اگر اس باب میں تمہارے ہاں کمی ہوگی، تو بھی اپنوں سے دگنوں پر غالب آجاؤ گے۔ (۶۵۔ ۸/۶۶)۔

(۱۶) ایمان و تقویٰ سے اس زندگی میں بھی خوشگواریوں کی بشارتیں ملتی ہیں اور آخرت میں بھی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ (۶۳۔ ۱۰/۶۴)

(۱۷) جو ہماری راہ میں جدوجہد کرے گا، اسے ہم حصولِ مقصد کی کئی راہیں سجھا دیں گے۔ (۲۹/۶۹)۔

(۱۸) جو ایمان کے ساتھ ثابت قدم رہے گا اس پر ملائکہ کا نزول ہو گا جو اسے بشارتیں دیں گے کہ اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہو گا۔ (۳۰۔ ۴۱/۳۱)۔

(۱۹) ایمان اور اعمالِ صالحہ سے، استخلاف فی الارض حاصل ہوتا ہے۔ (۲۴/۵۵)۔ یعنی اس دنیا میں حکومت اور مملکت مل جاتی ہے۔

(۲۰) اگر تم قوانینِ خداوندی سے اعراض برتو گے تو تمہاری جگہ دوسری قوم لے لے گی۔ (۴۷/۳۸ ؛ ۹/۳۹)

(۲۱) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ (۲۰/۱۲۴)

(۲۲) اگر تم شکر گزار ہو گے (نعمائے خداوندی کو اس کے قوانین کے مطابق صرف کرو گے) تو ہماری نعمتوں میں اضافہ ہو گا۔ اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ (۱۴/۷)

(۲۳) جو دوسروں کے لئے دے گا اور تقویٰ شعار ہو گا، اس کی زندگی کی راہیں آسان ہو جائیں گی۔ (۵۔ ۹۲/۷)۔

(۲۴) ثابت قدم رہو۔ باہمی نظم و ضبط رکھو۔ تقویٰ شعار رہو۔ تاکہ تم کامیاب ہو سکو۔ (۳/۱۹۹)

(۲۵) بنی اسرائیل کو ذلّت و خواری کے عذاب میں ماخوذ کیا گیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی تھی۔ (۳/۱۱۱)

ان مثالوں پر غور کرنے سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ خدا نے انسان کے سامنے دو ممکنات رکھ دیں اور اس سے کہہ دیا کہ ان میں سے جو راستہ چاہو اختیار کرو لیکن اتنا سمجھ رکھو کہ اگر تم نے یہ راہ اختیار کی تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا۔ اور اگر وہ راستہ اختیار کیا تو اس کا مآل وہ ہو گا۔

اسی کو غیر متبدّل قانون کہا جاتا ہے اور اس قانون کا مقرر کیا جانا **تقدیر** کہلاتا ہے۔ یعنی انسانی عمل کا قانونِ خداوندی کے مطابق فطری نتیجہ۔

ہم نے پہلے کہا تھا کہ جو حکم مستقل ہو (یعنی اس میں تبدیلی نہ کی جائے) وہ قانون کی شکل اختیار کر لیتا

ہے۔ اب اس میں یہ اضافہ کر لینا چاہیئے کہ

جب خدا کسی بات کا حکم مستقل طور پر دے دے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا، تو اس حکم کو غیر متبدّل قانون کہا جائے گا۔

اسلام دین ہے اور دین میں قوانین دیئے جاتے ہیں ـــــ خود لفظ دِین کے معنی بھی قانون کے ہیں۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب ہے اس لئے اس میں دیئے گئے احکام میں اب تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان احکام کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس لئے قرانِ کریم ضابطۂ قوانینِ خداوندی ہے۔

نواں باب

یہ کیسے ہو گیا؟

قرآنِ کریم کی جو آیات گذشتہ صفحات میں آپ کے سامنے آچکی ہیں، ان پر ایک بار پھر غور کیجئے اور یہ دیکھئے کہ کیا اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ، کوئی التباس و ابہام باقی رہتا ہے، یا خفیف سی غلط فہمی کا بھی امکان ہے کہ

(۱) سلسلۂ کائنات، خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔

(۲) انسان صاحبِ اختیار و ارادہ اور اپنے فیصلوں اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ زندگی کے ہر دوراہے پر، اس کے سامنے، غلط اور صحیح، دونوں راستے واضح طور پر موجود ہوتے ہیں اور اسے اس کا اختیار ہوتا ہے کہ وہ جونسا راستہ چاہے منتخب کر لے۔ وہ جس راستے پر چلے گا، اس کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے، جو اٹل اور غیر متبدل ہے ــــ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، زندگی کا بنیادی اصول ہے۔

ہمارے مروّجہ عقائد

ایک طرف ان حقائق کو سامنے رکھیئے اور دوسری طرف یہ دیکھئے کہ آپ بچپن سے اپنے گھروں میں، محلوں میں، بازاروں میں، مسجدوں میں، علماء کرام کی مجلسوں میں، صوفیاء عظام کی محفلوں میں، کیا سنتے، اور قرآنِ مجید کی تفسیروں میں، احادیث کے مجموعوں میں، ائمہ سلف کی کتابوں میں، شعراء کے کلام میں، بزرگوں کے احوال میں، کیا پڑھتے چلے آئے ہیں۔ یہ کہ

دنیا میں ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں مل سکتا۔ انسان، خدا کے حکم کے بغیر کچھ

نہیں کرسکتا۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ اس کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہوتا ہے، وہ سب، اس کی پیدائش سے پہلے ہی، اس کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے اور اس نوشتۂ تقدیر کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ مقدّر کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ خدا قادرِ مطلق ہے، وہ جو چاہے کرے کسی کو اس کے حکم کے سامنے مجالِ سرتابی نہیں۔ وہ جسے چاہے بے حد و حساب رزق دے، جسے چاہے تنگی دے، جسے چاہے امیر بنا دے، وہ جسے چاہے مفلس اور قلاش کر دے جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے۔ وہ چاہے تو بادشاہوں سے بھیک منگا دے اور چاہے بھکاریوں کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دے۔ تندرستی اور بیماری، موت اور زندگی، سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ انسانی تدبیر اس میں کچھ نہیں کرسکتی۔ مرضیٔ مولے بر ہمہ اولیٰ۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ اس کی مرضی کے خلاف دل میں شکایت کا احساس تک پیدا نہ ہونے دے۔ جو کچھ ہو، اس پر صابر و شاکر رہے۔ جس قدر انسان راضی برضا رہے گا، اسی قدر اس کا شمار مقربینِ بارگاہِ الٰہی میں ہو گا۔

سب کام اپنے کرنے تقدیر کے حوالے
نزدیک عارفوں کے تدبیر ہے تو یہ ہے

اب یہ ہے اسلام کی تعلیم اور یہ ہیں مسلمانوں کے عقائد! آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ قرآنِ کریم کی اس قدر صاف اور واضح تعلیم کے خلاف، یہ عقائد مسلمانوں میں کیسے رائج ہو گئے — اور رائج بھی اس انداز سے ہو گئے کہ عینِ دین بن گئے؟ اور ان کے تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس شدت سے اُتر گئے کہ اگر کسی کے دل میں، کسی وقت، ان کے خلاف کوئی خیال تک بھی ابھرے، تو وہ کانپنے لگ جائے کہ نہ معلوم اس سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے اور اگر کوئی شخص ان عقائد کے خلاف ایک لفظ تک بھی زبان پر لے آئے تو شور مچا دیا جائے کہ یہ ملحد ہے، دہریہ ہے، خدا کی قدرت کا منکر ہے، مادہ پرست ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہے؟ یقیناً یہ چیز موجبِ ہزار حیرت اور باعثِ صد ہزار تعجب نظر آتی ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم میں یہ تبدیلی کیسے پیدا ہوئی اور ہمارے عقائد میں ایسا محیّر العقول انقلاب کیسے آ گیا، درانحالیکہ خدا کی کتاب ہمارے پاس اس طرح موجود ہے کہ اس میں ایک حرف اور نقطہ تک

کا فرق نہیں آیا، اور دن رات، صبح و شام اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس کے درس دیئے جاتے ہیں اس کی تفسیریں لکھی جاتی ہیں۔

فرمائیے کہ یہ مقام ایسا ہے یا نہیں کہ اس پر رُکا جائے اور نہایت صبر و سکون اور انتہائی غور و فکر سے اس کے متعلق سوچا جائے کہ یہ کیسے ہوا؟ کب ہوا، کیوں ہوا — اور کیا اب اس کی اصلاح کا امکان ہے یا نہیں؟

ہمارے ہاں مسئلہ تقدیر کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی شاید کسی دوسرے مسئلہ کے حصہ میں نہیں آیا ہوگا۔ چونکہ اس مسئلہ کو "ایمانیات" کا جزو بنا دیا گیا (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی)، اس لئے ہو نہیں سکتا تھا کہ اسلام کے متعلق کتاب لکھی جائے اور اس میں **تقدیر** کا ذکر نہ آئے۔ ضمنی طور پر لکھے جانے کے علاوہ، اس موضوع پر بڑی بڑی ضخیم مستقل تصانیف مرتب کی گئیں لیکن اُلجھاوے ڈالنے والوں کا کمال ہے کہ اس مسئلہ کو جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی یہ اتنا ہی اُلجھتا چلا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق قرآنِ کریم کی رُو سے گفتگو کی جاتی، اسے فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں کی آماجگاہ بنا دیا گیا اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس پر خارج از قرآن گوشوں سے بحث کی گئی۔ ہم ان تفصیلات کی بحث میں جانا سعیٔ لاحاصل سمجھتے ہیں، صرف اس لئے نہیں کہ — سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے — بلکہ اس لئے بھی کہ اگر ہم انہیں آپ کے سامنے پیش کریں تو آپ سمجھ ہی نہ سکیں کہ ان کا مطلب کیا ہے اور دین کے ساتھ ان کا تعلق کیا؟ آج زندگی کے مسائل پر جس زاویۂ نگاہ سے غور و فکر کیا جاتا ہے، اس کی روشنی میں، اُس زمانہ کا علم الکلام اب بیکار اور فرسودہ ہو کر رہ گیا ہے — فرسودہ بھی، اور دورِ حاضر کے ذہن کے لئے پیچیدہ بلکہ مہمل بھی۔ (مثلاً) امام ابن حزم اندلسیؒ کا شمار ممتاز ترین اکابرینِ اسلاف میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب، الملل والنحل میں قضا و قدر کے عنوان سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اس بحث کا آغاز حسبِ ذیل سوال و جواب سے ہوتا ہے۔

سابقہ علم الکلام کی بحثیں آج لاحاصل ہیں

ان لوگوں نے جو فعل کے ساتھ استطاعت کے قائل ہیں کہا ہے کہ جب یہ سوال کیا

جائے کہ کافر کو اس ایمان کی استطاعت ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے یا اسے اسکی استطاعت نہیں ہے۔ انہوں نے جواب یہ دیا ہے کہ کافر کو بطور بدل کے ایمان کی استطاعت ہے یعنی کفر ہیں ہمیشہ نہ رہے گا لیکن اسے قطع کردے گا اور اس کو ایمان سے بدل دے گا۔

اس کا جو جواب دینا واجب ہے وہ یہ ہے کہ وہ بظاہر حال اپنے سلامت اعضا و ارتفاعِ موانع کی وجہ سے مستطیع ہے ایمان اور کفر کے جمع کرنے پر جب تک وہ کافر ہے اور جب تک اللہ اس کی مدد نہ کرے غیر مستطیع ہے۔ جب اس کی مدد کردی تو اس کی استطاعت مکمل ہوگئی تو اس نے فعل کیا۔ اگر کہا جائے کہ تب تو وہ مکلف و مامور ہوا تو ہم کہیں گے ہاں۔

آپ سوچئے کہ اگر اس بحث کو، جو سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے آپ کے سامنے پیش کردیا جائے تو آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ ہمارے ہاں اس مسئلہ پر اسی انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ کتابوں پر کتابیں اسی نہج سے لکھی گئی ہیں اور یہی کچھ ہمارے مذہبی مکتبوں اور دار العلوموں میں پڑھایا جاتا ہے۔

۱۰۔ اب رہا یہ سوال کہ ان نئے (اور خلافِ قرآن) عقائد کی ابتدا کس نے کی اور یہ کس طرح اسلام کا جزو ہی نہیں بلکہ اصل و اساس قرار پا گئے، تو اس کا تعلق تاریخ سے ہے، اور (یہ سنکر ایک دفعہ تو آپ یقیناً بھونچکے رہ جائیں گے لیکن ہے یہ حقیقت کہ) تاریخی نقطۂ نگاہ سے ابتدائی دَور سے متعلق ہماری تاریخ بڑی ناقابلِ اعتماد ہے۔ اس بحث کا تعلق ہمارے زیرِ نظر موضوع سے نہیں اس لئے ہم اس مقام پر اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے[1] مختصراً اس کی وجوہات یہ ہیں کہ

تاریخ ناقابلِ اعتماد ہے

(۱) ہماری سب سے پہلی مبسوط تاریخ ـــــ جسے مستند ہی نہیں بلکہ امّ التواریخ سمجھا جاتا ہے، امام طبری کی تاریخ ہے جو تیرہ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ یہ تاریخ، صدر اوّل (عہدِ رسالت مآبؐ) کے قریب تین سو سال بعد منضبط کی گئی اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی بنیاد کسی سابقہ تحریری ریکارڈ

---

[1] میں نے اپنی کتاب "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم میں "ہماری تاریخ میں کیا ہے" کے عنوان سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے۔

پر نہیں، بلکہ زبانی روایات پر ہے۔ یعنی امام طبری نے لکھا ہے کہ میں یہ بات فلاں سے سنی اور اس نے فلاں سے سُنی اور اس طرح روایات کا یہ زبانی سلسلہ، صدر اوّل تک پہنچا دیا گیا۔ جو تاریخ اس طرح مرتب کی جائے وہ جس حد تک قابلِ اعتماد ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔ اس کے بعد ہمارے ہاں تاریخ کی جو کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، ان کی بنیاد طبری کی تاریخ ہے۔ (اسی لئے اسے اُمّ التواریخ کہا جاتا ہے)۔

(۲) وہی تاریخ واقعات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کر سکتی ہے جو غیر جانبدارانہ اور معروضی طور پر (OBJECTIVELY) منضبط کی جائے۔ ہماری تاریخ جس زمانے میں منضبط ہوئی، امت فرقوں میں بٹ چکی تھی۔ اس لئے اس دور میں، تاریخ ہی نہیں بلکہ جو کچھ بھی لکھا گیا، وہ فرقہ وارانہ تصورات اور گروہ بندانہ تعصبات و رجحانات سے غیر متاثر نہیں رہ سکا۔ اُس زمانے میں خود مسئلہ تقدیر بھی فرقہ بندی کی بنیاد بن چکا تھا یہی وجہ ہے جو ابو زہرہ مصری نے کہا ہے کہ آج یہ متحقق کرنا بھی دشوار ہے کہ عقیدۂ جبر کا اوّلیں مؤسس کون تھا۔ اس کے الفاظ ہیں:-

> جو فرقہ خاص دھڑے کی صورت اختیار کر لے اس کے متعلق یہ فیصلہ کرنا بڑا دشوار ہے کہ اس کا اوّلین مؤسس کون ہے۔ لہٰذا اس فرقہ کا نقطۂ آغاز معلوم کرنا کچھ آسان کام نہیں۔
>
> (المذاہب اسلامیہ)

(۳) ہمارے ہاں، اسلاف کی عظمت و احترام کے سلسلہ میں یہ عقیدہ عام کر دیا گیا کہ جو کچھ انہوں نے لکھ دیا ہے (بلکہ جو کچھ ان کی طرف منسوب ہے) اس پر تنقید کرنا، ان کے علوِ مرتبت کے خلاف، فلہٰذا ان کی شان میں سخت گستاخی اور ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم میں، متقدمین کے متعلق اس قسم کے عقائد مروّج ہوں، اس کی تاریخ کو تنقیدی نقطہ نگاہ سے کیسے پرکھا جا سکتا ہے، بالخصوص جب اس قسم تنقید کو کفر اور ارتداد تک قرار دے دیا جائے۔ جس قوم کے بچوں کو سبق یہ پڑھایا جائے کہ ــــ خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست، اس کے قدیم لٹریچر کو علم و بصیرت کی چھلنی میں چھانا کیسے جا سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر، ہماری تاریخ قابلِ اعتماد قرار نہیں پا سکتی۔ جہاں تک حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ اور صحابہ کبارؓ کے احوال و کوائف کا تعلق ہے ان کے لئے ہمارے پاس خدا کی کتاب

تاریخ کے متعلق صحیح مسلک

(قرآنِ مجید) کی سند و شہادت موجود ہے جس کی صداقت و ثقاہت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہماری تاریخ کا جو حصّہ' اُس دَور سے متعلق ہے' اسے اس انداز سے پرکھا جا سکتا ہے کہ تاریخ میں جو واقعات ایسے ہیں جو قرآنی سند و شہادت کے خلاف جاتے ہیں' وہ غلط لہذا' رد کر دینے کے قابل ہیں اور جو واقعات اس کی سند و شہادت کے مطابق ہیں' انہیں صحیح اور قابلِ قبول سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس دور کے بعد کی تاریخ کے پرکھنے کے لئے ہمارے پاس اس قسم کا کوئی معیار نہیں۔ مسئلہ تقدیر کے متعلق چونکہ ہمارے پاس قرآن کی شہادات موجود ہیں' اس لئے ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بعد میں جو اعتقادات عام کئے گئے' ان میں کونسے قرآن کے مطابق ہیں اور کونسے اس کے خلاف۔

ظہورِ اسلام کے وقت عقیدۂ جبر

مسئلہ تقدیر کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ ہمارے سامنے آچکا ہے۔ قرآن ہی سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت' ایسے لوگ موجود تھے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔ انسان کا اس باب میں کوئی اختیار نہیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ ..... (۶/۱۴۹)۔

مشرکین یہ بات کہیں گے کہ اگر اللہ کو ایسا منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباء و اجداد۔ اور نہ ہی ہم کسی شے کو حرام قرار دیتے۔ (ہم یہ کچھ کر ہی اس لئے رہے ہیں کہ خدا کو ایسا منظور تھا۔ ہمارا اس میں کیا بس ہے)۔

قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ لوگ حقیقت اور صداقت کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں دیکھئے آیات (۱۶/۳۵ ؛ ۴۳/۲۰)۔ سورۂ یٰسین میں ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَھُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗٓ ...... (۳۶/۴۷)۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک دُور کرنے کے لئے اپنا مال خرچ کرو' تو

وہ لوگ جو کافر ہیں مومنین سے کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں تو وہ خود انہیں رزق عطا کر دیتا۔ ان کے بھوکے ہونے سے صاف ظاہر ہے کہ خدا انہیں رزق دینا چاہتا ہی نہیں۔ سو جسے خدا رزق نہیں دینا چاہتا' اسے ہم کس طرح رزق دے سکتے ہیں۔ یہ تو خدا کی مرضی کے خلاف چلنا ہوگا۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔

ان آیات سے واضح ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں ایسے لوگ موجود تھے جو عقیدۂ جبر کے قائل تھے۔ یہ مشرکین اور کفار تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کے اس عقیدہ کی تردید کی اور اس کے ساتھ ہی ایسی مثبت تعلیم دی جس سے اس قسم کے عقائد کی جڑ کٹ گئی۔ اس کی روشنی میں تقدیر کا مسئلہ اس آسانی سے حل ہوگیا کہ اس باب میں کسی قسم کا شک و شبہ تک باقی نہ رہا اور کسی کو کسی قسم کی مزید وضاحت کی بھی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ اگر کہیں اس کا شائبہ نظر بھی آیا تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی۔ (مثلاً) روایات میں ہے کہ ایک چور کو حضرت عمرؓ کے سامنے لایا گیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ تم نے چوری کیوں کی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ "خدا کا فیصلہ یہی تھا"۔ آپ نے اس پر حد بھی نافذ کر دی اور مزید کوڑوں کی بھی سزا دی۔ جب ان سے اس دوہری سزا کی وجہ دریافت کی گئی تو انہوں نے کہا کہ حد تو چوری کے جرم کی سزا ہے اور کوڑے اس لئے کہ اس نے خدا کے خلاف جھوٹا الزام لگایا ہے[1]۔

عقیدہ جبر کی وجہ سے سزا

مسلمانوں میں جب تک قرآنِ عظیم' دین کی اساس و بنیاد رہا' جبر کا عقیدہ ان کے ہاں بار نہ پا سکا — ظاہر ہے کہ جس عقیدہ کو قرآن بہ نصِ صریح' شرک اور کفر قرار دے' وہ مسلمانوں کے ہاں کس طرح بار پا سکتا تھا۔ لیکن جب قرآن نظروں سے اوجھل ہوگیا (یا اوجھل کر دیا گیا) اور وہ مرکزی اتھارٹی (یعنی نظامِ مملکت علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہی جو اُمت کے عقائد و مسالک کو قرآنی ساحلوں کے اندر محصور رکھنے کی ذمہ دار تھی تو ہر قسم کے غیر قرآنی نظریات و تصورات' اسلام کا جزو بنتے چلے گئے۔ انہی میں مسئلۂ تقدیر بھی تھا — بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ اُمت میں' اعتقاد کی بنا پر جو فرقہ سب سے پہلے

---

[1] ابو زہرہ مصری۔ المذاہب الاسلامیہ۔ اردو ترجمہ۔ ص ۱۳۹

وجود میں آیا، وہ جبریہ فرقہ تھا! اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے، عرب قوم، بیشتر صحرا نشین، خانہ بدوش، قبائل پر مشتمل تھی جو ریوڑ پال کر اور کھجوریں کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے دائیں بائیں، ایران اور روم کی وہ سلطنتیں تھیں جنکی تہذیب و تمدن اور قوت و حشمت کے غلغلے صدیوں سے بلند تھے۔ اہلِ ایران، ان عربوں کو کس قدر ذلت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے، اس شہادت آج آج بھی فردوسی کے شاہنامے سے مل سکتی ہے۔ انہوں نے اسلام جیسا دین قبول کیا تو اس سے ان کے قلب و نگاہ میں ایسا انقلاب پیدا ہو گیا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے، ایران کی وسیع و عریض مملکت کے مالک بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایرانیوں کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں عربوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے اور ان کے مفتوح و مغلوب ہو گئے لیکن اس سے ان کے دل پر جو گہرا زخم لگا، وہ مدتوں تک مندمل نہ ہو سکا۔ اس سے ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بدستور سلگتی رہی۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ عربوں کی اس بے پناہ قوت کا راز ان تصوراتِ حیات میں مضمر ہے جو انہیں قرآن نے عطا کئے ہیں میدانِ جنگ میں شکست کھانے کے بعد، جب ایران کا ایک گورنر، ھرمزان، قید ہو کر مدینہ آیا تو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ ایرانی تو وہ قوم تھی، جو عربوں سے لڑنا تک اپنے لئے باعثِ ہتک سمجھتی تھی اور اگر کہیں ان کے ساتھ عربوں کی جھڑپ ہو جاتی تھی، تو ان کی فوج کی چھوٹی سی ٹکڑی، انہیں مار بھگایا کرتی تھی۔ اب کیا ہوا کہ ایرانیوں کی پوری کی پوری قوم، مٹھی بھر عربوں سے اس بُری طرح شکست کھا گئی۔ ہرمزان نے اس سوال کا جو جواب دیا، وہ بڑا غور طلب ہے۔ اس نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے پہلے جب ہمارا ٹکراؤ ہوتا تھا، تو عرب، ایرانیوں کے مقابلہ میں تنہا آتے تھے، اس لیے ہمارے لئے ان پر غالب آجانا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب جو معرکہ پیش آیا تو اس میں ایرانی تو تنہا تھے لیکن "عربوں کے ساتھ ان کا خدا بھی تھا۔" ان دونوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے لہٰذا، ہمیں شکست ہو گئی۔

ہرمزان کی شہادت

"اب عربوں کے ساتھ ان کا خدا بھی تھا" ـــــ یہ تھا عربوں کی قوت کا اصلی راز جس سے اہلِ ایران اچھی طرح واقف تھے۔ " خدا کے ساتھ" ہونے سے مراد یہی تھی کہ عربوں میں یہ قلبِ ماہیت

اس دین کی وجہ سے ہوئی ہے جو ان کے خدا نے انہیں عطا کیا ہے۔ قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے ان میں انقلاب آفرینی کے جو جذبات اُبھرے تھے اور اپنے بلند و بالا نصب العین حیات کی خاطر، دنیا کی ہر غیر خدائی قوت کا بے باکانہ مقابلہ کرنے اور اس کے لئے جان تک دے دینے کا جو عزم ان کے سینوں میں بیدار ہوا تھا، اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوم نہیں کر سکتی تھی ــــ ایرانی اور بازنطینی، سب اس راز سے واقف تھے، لہذا، ان کی کوشش یہ تھی کہ عربوں کو ان تصوراتِ حیات سے بیگانہ کر دیا جائے جو ان کی کامرانیوں اور کامیابیوں کی اصل و اساس تھے۔

ظہورِ اسلام سے، یہودیت اور عیسائیت کے خود ساختہ مذاہب پر بھی کاری ضرب لگی۔ علاوہ ازیں، مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے، بازنطینی مملکت کے قصرِ مشید کی بنیادوں میں تزلزل آگیا تھا اور یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے دیس نکالا مل گیا تھا۔ لہذا، عربوں کے خلاف انتقام جوئی میں، یہ قومیں بھی ایرانیوں سے پیچھے نہیں تھیں۔ ان کے بھی وہی عزائم تھے جو اہلِ ایران کے تھے اور ان عزائم کے

عیسائیوں اور یہودیوں کی سازش

بروئے کار لانے کے لئے، حربہ بھی وہی جو ایرانیوں کے ذہن میں تھا۔ یعنی مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح قرآن کے عطا کردہ انقلاب آفریں تصوراتِ حیات سے بیگانہ بنا کر، ان کے دین میں بھی ویسی ہی تحریف کر دی جائے جیسی تحریف ان کے مذاہب میں ہو چکی تھی۔ علامہ اقبالؔ جب "عرب" کے مقابلہ میں "عجم" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد صرف اہلِ ایران نہیں ہوتے۔ اس میں تمام غیر عرب قومیں شامل ہوتی ہیں اور جب وہ عربی اسلام کے مقابلہ میں عجمی اسلام پیش کرتے

"عربی و عجمی" کی اصطلاحات

ہیں، تو عربی اسلام سے ان کی مراد، وہ دین ہوتا ہے جو قرآنِ خالص نے عطا کیا تھا اور عجمی اسلام سے مفہوم وہ تمام غیر قرآنی تصورات جو مجوسیت، یہودیت، نصرانیت وغیرہ سے مستعار لے کر اسلام کا جزو بنا دیئے گئے اور اس طرح خدا کا یہ دین، انسانوں کے خود ساختہ اس مذہب میں تبدیل ہو گیا جو صدیوں سے ہمارے ہاں مروج چلا آرہا ہے[1]۔ اس تحریف کا آغاز ایران سے ہوا تھا، اور اسکے

---

[1] مجھے اگر فرصت اور توفیق نصیب ہوئی تو میرا ارادہ (مسلمانوں کی نہیں بلکہ) اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کا ہے جس سے یہ بتایا

(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۷ پر دیکھئے)

پہلی کڑی، عقیدۂ تقدیر میں تبدیلی تھی۔ مجوسیت کی بنیاد مسئلہ خیر و شر پر تھی اس لئے اہلِ ایران خوب جانتے تھے کہ قوموں کی زندگی پر اس عقیدہ کا کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ اس راز سے اچھی طرح واقف تھے کہ جس قوم کا یہ عقیدہ ہو کہ انسان اپنی تقدیر خود اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے اور اقوامِ عالم کی صف میں اس کا مقام اس کے نظریاتِ حیات اور ان کے مطابق اس کے اعمال و کردار متعین کرتے ہیں، وہ قوم بے پناہ قوتوں کی مالک بن جاتی ہے۔ اسے ان قوتوں سے بے گانہ بنا دینے کا طریق یہ ہے کہ ان میں یہ عقیدہ رائج کر دیا جائے کہ انسان کی اپنی تدابیر و اعمال سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس نے دنیا میں جس حالت میں رہنا ہوتا ہے، وہ پہلے سے مقدر ہوتی ہے اور اس میں کوئی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا! چنانچہ دین (اسلام) میں اس تحریف کی ابتدا اسی مسئلہ سے ہوئی۔ اعتقادات کی بنیادوں پر مسلمانوں میں جو فرقہ سب سے پہلے نمودار ہوا، اس کی بنیاد، مسئلہ تقدیر کے متعلق باہمی اختلاف پر تھی۔ یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور انتہائی عبرت آموز اور الم انگیز بھی ـــ یہ داستان نہیں، یہ المیہ ہے اس کے زوال کا، یہ حزینہ ہے اسکی زبوں حالی کا، یہ مرثیہ ہے اس کی موت کا۔

ایران کے اساورہ

ایران میں اربابِ دانش و بینش اور ماہرینِ سیاست کا ایک گروہ تھا جسے اساورہ کہا جاتا تھا۔ انہیں شاہانِ ایران (اکاسرہ) کا حلقۂ مشیران سمجھ لیجئے (جیسے اکبر کے نورتن) ان مقربینِ بارگاہِ شہنشاہیت کو، سونے کا کنگن، بطور امتیازی نشان عطا ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں اساورہ کہا جاتا تھا۔ اَسوَارُ کے معنی کنگن کے ہیں ـــ (ضمناً، قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ اہلِ جنت کو "سونے کے کنگن" پہنائے جائیں گے تو اس استعارہ سے ان کے بلند ترین امتیازی مقام کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

ایران کی شکست کے بعد، ایرانی فوج نے بالعموم، اور اساورہ نے بالخصوص، حضرت سعدؓ بن وقاصؓ (فاتح ایران) سے درخواست کی کہ جو مراعات مسلمانوں کو حاصل ہیں، اگر وہ ہمیں بھی مل جائیں تو ہم اسلام لاکر، مسلمانوں کی بستیوں میں آباد ہونا چاہتے ہیں۔ ان یہ شرط منظور کر لی گئی اور اس طرح یہ لوگ

(بقیہ فٹ نوٹ صـ۱۷۶) جائے گا کہ قرآن کا دین، موجودہ مروجہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہوگیا اور غیر قرآنی نظریات، تصورات، معتقدات کہاں کہاں سے، اور کن کن راستوں سے در آئے۔

کوفہ اور بصرہ وغیرہ میں آباد ہوگئے۔ ... ... آج ہم ان مصالح کی تفصیلات سے تو واقف نہیں جن کے پیشِ نظر یہ اجازت دی گئی تھی لیکن جب ہم اس کے نتائج و عواقب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ قرینِ مصلحت نہیں تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ایران قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا جس کی وجہ سے، غلط تہذیب کے تصنعات اور مسخ شدہ تمدن کے تکلفات ان کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، نظامِ سرمایہ داری، ان کے معاشرہ کی رگوں میں بطور خونِ حیات رواں دواں تھے۔ مجوسی معتقدات ہر ان کے مذہب کی بنیاد تھی۔ ان کے ارباب دانش (بالخصوص اساورہ) فلسفہ، منطق، الٰہیات اور مابعد الطبیعیات وغیرہ سے متعلق مسائل پر بحث و نظر کے ماہر تھے۔

ان کے برعکس، عرب تھے کہ جن کی زندگی، دامنِ صحرا کی طرح سادہ، اور جن کا ذہن، فضائے دشت کی طرح صاف تھا۔ نہ وہ بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں سے واقف تھے اور نہ ہی نظری مسائل کی نکات آفرینیوں اور فلسفہ و منطق کی موشگافیوں سے آشنا۔ جس دین کے اتباع سے، انہیں دنیا میں یہ امتیازی مقام حاصل ہوگیا تھا، وہ بھی نہایت صاف، سیدھا اور سادہ تھا — چند واضح اور بیّن تصوراتِ حیات اور ان کی پیدا کردہ قوتِ عمل — یہ تھا ان کا نہجِ زندگی اور اساسِ زیست۔

اب سوچئے کہ اس قسم کی سادہ جبین اور مصفّا نگاہ قوم میں، اگر ایرانی ذہن کو خلا ملا کے مواقع حاصل ہوجائیں اور وہ آئیں بھی ایک خاص مقصد کو ساتھ لئے ہوئے، تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے[1] مسلمانوں کا سادہ ذہن، ان کی منطق آفرینیوں کا حریف نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی بستیوں میں ہل جل

---

[1] اس اختلاط کا ایک ایسا نتیجہ جس نے ملّتِ اسلامیہ کی بساط اُلٹ کر رکھ دی — نہیں؛ بلکہ جس نے انسانیت کی تاریخ کا رُخ غلط سمت کی طرف موڑ دیا، اس سے بہت پہلے مدینہ میں رونما ہوچکا تھا۔ فتحِ ایران کے بعد، وہاں کے گورنر، ہرمزان (اور اس کے ساتھیوں) کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیدی گئی۔ حضرت عمرؓ کی شہادت، انہی کی سازش کا نتیجہ تھی — وہ حادثۂ عظمےٰ جس پر انسانیت کی آنکھ آج تک خوننابہ فشاں ہے! اگر حضرت عمرؓ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

گئے اور وہاں انہوں نے، غیر محسوس طور پر اپنے خیالات کو پھیلانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں جس شخص نے سب سے پہلے مسئلہ تقدیر کو چھیڑا، تاریخ اس کا نام معبد بن خالد جہنیؔ بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو ابو یونس سے اخذ کیا تھا جس کا تعلق اساورہ سے تھا۔ معبد سے اس عقیدہ کو غیلان دمشقی نے لیا اور اسے آگے پھیلایا۔ اس عقیدہ کی رُو سے، انسان کو مجبورِ محض اور پہلے سے مقدر شدہ قسمت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، قرار دیا گیا۔ اس اعتبار سے، اس گروہ کو جبریہ کہا جاتا ہے۔

عیسائیت کے اثرات

جبر کا عقیدہ، عیسائیت کی بھی بنیاد تھا۔ یہ عقیدہ کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور انسان کا کوئی عمل، اس اوّلین گناہ کے دھبے کو دور نہیں کر سکتا، خالصتہً جبر ہے۔ پھر اناجیل کی رُو سے حضرت عیسےٰؑ نے اپنے آخری لمحات میں یہ دعا مانگی تھی کہ ــــ خدایا! تیری مرضی پوری ہو، نہ کہ میری مرضی ــــ یہ "راضی برضا" رہنے کے عقیدہ کی بنیاد تھی۔ چنانچہ، تاریخ کی ایک روایت کی رو سے، غیلان دمشقی نے (جو قبطی الاصل تھا) عقیدۂ جبر کو ایک نصرانی سے اخذ کیا تھا جو مسلمان ہو گیا تھا اور بعد میں پھر عیسائیت کی طرف پلٹ گیا تھا۔ خیر و شر کی ثنویت کا عقیدہ یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھا۔ جب، بابل کی اسیری کے زمانے میں، بنی اسرائیل کو کسریٰ کے زیرِ اقتدار علاقہ کے قرب و جوار میں رہنے کا اتفاق ہوا تو ان کا خلا ملا ایرانیوں کے ساتھ لازمی تھا۔

اور یہودیت کے

اس کے بعد، ان کی بابل سے رہائی اور اپنے سابقہ وطن میں دوبارہ آبادی بھی اکاسرۂ ایران ہی کی کرم گستری کی رہینِ منت تھی۔ اس سے وہ زرتشتیوں سے اور بھی زیادہ متاثر ہوئے۔ خیر و شر کی ثنویت کا عقیدہ اس طرح، ان کے ہاں در آیا۔ اور مابعد الطبیعیاتی فلسفیانہ مسائل سے ان کی دلچسپی نے اس پر اور بھی جلا کر دیا۔ (اسکندریہ میں یہودیوں کی دانش گاہ، اس زمانے میں فلسفہ کا مرکز تھی)۔

چنانچہ تاریخ کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ عقیدۂ جبر کا بانی جعد بن درہم تھا جو خود تو مسلمان تھا لیکن اس نے یہ عقیدہ شام کے ایک یہودی سے اخذ کیا تھا۔ درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان نے سیکھا جو خراسانی الاصل تھا۔ اس نے اس عقیدہ کی نشر و اشاعت اس زور و شور سے کی کہ فرقۂ جبریہ کا نام ہی جہمیہ پڑ گیا۔ چنانچہ تاریخ میں یہ فرقہ اسی نام سے متعارف ہے۔ ہماری تاریخ میں اس

عقیدہ کے موجد کے متعلق ہی اس قسم کا ابہام نہیں، بلکہ خود اس عقیدہ کے تعارف کے سلسلہ میں بھی التباس ہے۔ چنانچہ کبھی اس فرقہ کو جبریہ کہتے ہیں ـــ کیونکہ وہ خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر زور دیتے تھے ـــ اور کبھی قدریہ ـــ کیونکہ وہ انسان کی قدرتِ اختیار کی نفی کرتے تھے (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر آئے گی)۔

مسلمانوں میں اس عقیدہ کا موجد، معبد ہو یا جہم اور اس کا ماخذ، مجوسیت ہو، یا یہودیت اور نصرانیت، یہ حقیقت واضح ہے کہ اسلام میں یہ یکسر غیر قرآنی عقیدہ، غیر اسلامی سرچشموں سے آیا۔ یہ عباسیوں کے ابتدائی عہد کا واقعہ ہے[1]۔

اس مقام پر یقیناً ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ اس قسم کا غیر قرآنی عقیدہ، جس کا تعلق دین کے اساسات سے ہے، مسلمانوں میں عام کس طرح کیسے ہوگیا؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی نشر و اشاعت کرنے والے اس کی تائید میں، فلسفیانہ دلائل پیش کرتے ہوں گے، لیکن ذہن، اس چیز کو باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ (کم از کم) اُس زمانے کے مسلمان، محض فلسفیانہ دلائل کی رو سے اس قسم کے عقیدہ کو اپنے دین کا جزو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہوں۔ دین کے معاملہ میں وہ دین ہی کی سند مانگتے ہوں گے ـــ اور دین کی سند انہیں دیدی گئی!!

اس غیر قرآنی عقیدہ کی "دینی سند"

یہ سُن کر آپ یقیناً چونک اُٹھے ہوں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا تھا! "یہ کیسے ہوا" ـــ یہ داستاں بھی بڑی تعجب انگیز، اور عبرت آموز ہے۔ اس سے صرف اس ایک عقیدہ (تقدیر) ہی کی سند نہیں ملی۔

---

[1] مجوس، نصاریٰ، یہود وغیرہ کی طرف سے ایسا کچھ بطور سازش کیا گیا یا انہوں نے اس لئے ان خیالات کو مسلمانوں میں پھیلایا کہ وہ (اپنے عقیدہ کی رُو سے) انہیں صحیح اور سچا سمجھتے تھے، ہم اس سوال کا جواب حتمی طور پر نہیں دے سکتے کیونکہ نیتوں کا جاننے والا خدا ہے۔ لیکن تاریخ سے جو کچھ ہمارے سامنے آتا ہے، اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ایسا کچھ دانستہ (بطور سازش) کیا گیا تھا لیکن دانستہ کیا گیا ہو یا نادانستہ، یہ قوم تو تباہ ہوگئی۔

دین میں جس قدر غیر قرآنی تصورات کی آمیزش ہوئی' ان کی بنیاد اسی سند پر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآنِ کریم) کو دین کی بنیاد قرار دیا تھا اور خود حضور نبی اکرمؐ اسی کا اتباع فرماتے اور اسی کی تعلیم دیتے تھے۔ جب تک قرآنِ مجید دین کی اساس رہا' اسلام میں کسی غیر اسلامی نظریہ کی آمیزش نہ ہو سکی۔ دین میں آمیزش کرنے والوں نے' سب سے پہلے' اس بنیاد کو اس کے مقام سے ہٹایا اور یہ عقیدہ عام کیا کہ دین میں سند اور حجت (دلیلِ آخر) صرف قرآن نہیں۔ قرآن کے ساتھ اس کی مانند (مثلہٗ معہٗ) ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہیں روایات۔ روایات

روایات

کے متعلق' پہلے تو فقط اتنا ہی کہا گیا کہ ان سے قرآن کی تشریح ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا۔ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ نبی کو خدا کی طرف سے جو وحی ملتی ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ــــ ایک تورۂ شبکتب (یعنی وحیٔ جلی یا وحیٔ مکتوب) اور دوسری تورۂ شبعلفہ' (یعنی وحیٔ خفی یا وحیٔ غیر مکتوب)۔ وحیٔ مکتوب تو حضرت موسیٰؑ کی کتاب میں درج ہے اور وحیٔ غیر مکتوب ان روایات پر مشتمل ہے جو حضرت ہارونؑ کی وساطت سے قوم میں مروّج ہیں۔ شریعتِ یہودیت کا سارا مدار انہی روایات پر ہے۔ قرآنِ کریم نے وحی کی ایک ہی قسم بیان کی ہے جو ساری کی ساری اس کے اندر محفوظ ہے لیکن اب مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ نبی اکرمؐ کو بھی جو وحی خدا کی طرف سے ملی تھی' اس کی دو قسمیں تھیں ــــ ایک وحیٔ مکتوب یا وحیٔ متلو (جو قرآن کے اندر درج ہے) اور دوسری وحیٔ غیر مکتوب' یا وحیٔ غیر متلو' جس کا مجموعہ روایات ہیں۔ (انہی کو احادیث کہا جاتا ہے) یہ دونوں خدا کی طرف سے ہیں اور ہم پایہ ہیں۔

اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ اگر وحی کے پیش کردہ دو نظریات یا احکام میں باہمدگر تضاد[1] پایا جائے تو ان دونوں میں سے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس عقیدہ کے منطقی نتیجہ کے طور پر یہ کہا گیا کہ اگر قرآن اور حدیث میں کہیں تضاد پایا جائے' تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ حدیث نے قرآن کے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ یعنی احادیث' قرآن کی ناسخ قرار پا گئیں۔ بالفاظِ دیگر' دین میں سند اور حجت

---

[1] وحی میں تضاد! یا للعجب۔ قرآنِ کریم نے اپنے منزل من اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں لیکن بعد میں عقیدہ عام کیا گیا کہ وحی میں تضادات عام ہوتے ہیں۔

روایات قرار پا گئیں اور قرآن محض ثواب کی خاطر تلاوت کے لئے رہ گیا۔

نبی اکرمؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ حضورؐ نے صرف قرآن (مکمل اور مرتب شکل میں) امت کو دیا تھا جو حرفاً حرفاً ہمارے پاس موجود ہے۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدین حتّیٰ کہ دیگر صحابہؓ کبارؓ نے بھی، احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا ـــــ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے تو احادیث کے لکھنے اور بیان کرنے تک کی بھی سخت ممانعت کردی تھی تاکہ دین میں کوئی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لیکن جب حدیث کے متعلق مذکورہ بالا عقیدہ وضع کیا گیا تو پھر احادیث کے مجموعے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ احادیث کے جس مجموعے کو سب سے زیادہ صحیح قرار دیا جاتا ہے (یعنی امام بخاریؒ کا مجموعہ) وہ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوا تھا۔ (امام بخاریؒ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی تھی) ـــــ باقی مجموعے ان کے بعد مرتب ہوئے تھے۔ صرف امام مالکؒ کا مجموعہ (موطا) اس سے پہلے مرتب ہوا تھا لیکن اس میں بہت کم احادیث تھیں ـــــ احادیث کے یہ تمام مجموعے، کسی پہلے سے موجود، تحریری مواد (WRITTEN RECORD) سے مرتب نہیں کئے گئے تھے۔ لوگوں سے زبانی سن سنا کر مرتب کئے گئے تھے۔ آپ سوچئے کہ رسول اللہ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد، محض لوگوں کی زبانی روایات کی بنا پر، جو احادیث جمع کی جائیں گی ان کی (دینی تو ایک طرف) علمی اور تاریخی حیثیت کیا ہوگی! لیکن ان احادیث کو (جو زیادہ سے زیادہ منسوب الی الرسولؐ تھیں۔ یعنی زبانی روایت بیان کرنے والوں نے جن کی صرف نسبت رسول اللہ کی طرف کی تھی، انہیں) خود رسول اللہ کی صحیح ترین احادیث قرار دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ ان میں سے کسی ایک کے انکار سے بھی کفر لازم آجاتا ہے۔ اس طرح احادیث بیان کرنے میں راویوں سے جو سہو اور نسیان ہو سکتا ہے اسے تو ایک طرف رکھئے، اس سے جھوٹی حدیثیں وضع کر کے انہیں ذاتِ رسالت مآبؐ کی طرف منسوب کرنے کی جو گنجائش پیدا ہوگئی، اس پر غور کیجئے۔ یہ وضعی احادیث کس وسعت سے پھیلائی گئیں اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگائیے کہ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے جب احادیث جمع کرنے کا کام شروع کیا تو انہیں چھ لاکھ حدیثیں ملیں۔ ان میں سے انہوں نے قریب سات ہزار حدیثوں کو اس قابل سمجھا کہ انہیں اپنے مجموعہ میں داخل کر لیا جائے۔ باقی (قریب پانچ لاکھ ترانوے ہزار روایات) کو انہوں نے مسترد کر دیا۔ جن احادیث کو انہوں نے اپنے مجموعہ میں داخل کیا ان کے صحیح ہونے کی سند بھی ان کی اپنی بصیرت اور

قیاس تھا۔ انہیں خود رسول اللہ کی تصدیق اور توثیق حاصل نہیں تھی[1]۔

آپ یقیناً تعجب کریں گے کہ اس قدر کمزور معیاروں کے مطابق جمع کردہ روایات کو احادیثِ رسول اللہ کس طرح تسلیم کر لیا گیا! اس کی بنیاد جذباتی تھی۔ یعنی اُمت کو حضورِ رسالت مآبؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ بے پناہ محبت ہے۔ (اور ہونی بھی چاہیئے بشرطیکہ اسے قرآن کی حدود کے اندر رکھا جائے)۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس چیز یا جس بات کو بھی حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا جاتے اسے امت سر آنکھوں پر اٹھاتی ہے ـــــ ان روایات کو تو پھر بھی حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی کہا جاتا ہے۔ ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا میں بشر مقامات پر بعض پتھر رکھے ہیں جن پر قدم کے نشانات منقوش ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ حضورؐ کے قدمِ مبارک کے نقوش ہیں۔ لوگ جا جا کر ان پتھروں کو بھی سجدے کرتے ہیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جسے جعلی روایات وضع کرنے والوں نے (EXPLOIT) کیا اور جو جی میں آیا اسے حضورؐ کی طرف منسوب کر کے، احادیثِ رسول اللہ کے طور پر اُمت میں پھیلاتے چلے گئے۔ یہ تھا وہ دروازہ جس سے غیر اسلامی نظریات اور معتقدات دین کا جزو بنتے چلے گئے۔

عقیدۂ جبر کی تائید میں روایات

تقدیر کے مسئلہ کے متعلق کس قسم کی روایات وضع کی گئیں ان کا اندازہ دو چار مثالوں سے لگائیے جنہیں ہم 'احادیث کے نہایت معتبر مجموعہ' مشکوٰۃ (باب التقدیر) سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہ نے خداوند تعالےٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی **تقدیروں** کو لکھا ہے جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے ہر چیز **تقدیر** پر موقوف ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جسکا ٹھکانا نہ

---

[1] ان تمام امور کی تفصیل آپ کو "ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" میں ملے گی۔

لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانہ آگ میں ہوگا یا جنّت میں۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالےٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری و مسلم)۔ نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالےٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی آدم کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی اور فرمایا، پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنّتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی۔ اور پھر فرمایا کہ ــــ پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسولؐ اللہ کا یہ ارشاد سُن کر ایک شخص نے عرض کیا۔ یارسولؐ اللہ! پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسولؐ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالےٰ جب کسی بندے کو جنّت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنّتیوں ہی کے کام کراتا ہے .... اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کردیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے....... اور خدا اس کو اسکے کاموں کے سبب دوزخ میں داخل کردیتا ہے۔ (بحوالہ مالک۔ ترمذی، ابوداؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسولؐ اللہ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپؐ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یارسولؐ اللہ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنّتیوں کے نام ہیں..... اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جاسکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے الٹے ہاتھ کی کتاب..... کی طرف اشارہ کرکے فرمایا۔ یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جاسکتا ہے، نہ کم۔ (بحوالہ ترمذی)

(۵) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسولؐ اللہ نے کہ خداوند تعالےٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کرلی ہے۔ یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی **تقدیر** میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر)۔ اس کا نیک و بد عمل۔ اس کے رہنے کی جگہ۔ اس کی واپسی اور رزق۔ (بحوالہ احمد)۔

اس قسم کی بے شمار روایات کتب احادیث میں مروی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص ان روایات پر قرآنِ کریم اور علم و بصیرت کی رُو سے غور کرے گا، اس کے دل میں قسم قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور وہ ان پر اعتراضات کرے گا اور مزید وضاحت کے لئے سوالات بھی کرے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے، .. .. ایسی صورتِ حال سے بچنے کی خاطر پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں۔ مثلاً ـــــ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ رسولِ خدا تشریف لے آئے اور ہماری گفتگو کو سُنکر آپؐ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

ان پر بحث اور گفتگو کی ممانعت

اتنا سُرخ ہوگیا کہ انار کے دانوں کا پانی آپؐ کے رخسارں میں نچوڑ دیا گیا ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم کو یہی حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تمہارے درمیان اسی لئے بھیجا گیا ہوں۔ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں، جب انہوں نے اس مسئلہ پر مناقشہ کیا تو انکو ہلاک کر دیا گیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں اور مکرر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ میں جھگڑا نہ کرنا اور کوئی بحث و گفتگو نہ کرنا۔ (بحوالہ ترمذی)۔

آپ نے غور فرمایا کہ تقدیر کے متعلق خلافِ قرآن روایات وضع کرنے والوں نے کس طرح پیشبندی کر دی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ تم سے (تقدیر سے متعلق جو احادیث بیان کی جائیں، تم انہیں آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لو۔ جس شخص نے ان کے متعلق کسی قسم کی بحث یا گفتگو کی وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ان وضعی روایات پر تنقید اور اعتراضات کا دروازہ بند کر دینے کے بعد، یہ لوگ ایک قدم اور آگے بڑھے۔ اور یہ مقام پھر بڑا غور طلب ہے۔

قرآنِ کریم میں بعض حقائق کو تشبیہات کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ (انہیں آیاتِ متشابہات کہا جاتا ہے)۔ انہیں اربابِ علم و بصیرت اپنی اپنی فکر کے مطابق سمجھ سکتے ہیں اور اس قسم کے

آیاتِ متشابہات و محکمات

اختلافِ فہم سے "اصلِ دین پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثلاً قرآنِ کریم میں خدا کے متعلق ہے ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ۔ وہ عرش پر متمکن ہوگیا۔ بعض نے لفظ عرش کے حقیقی معانی لے کر کہا کہ آسمانوں پر

پہ سچ مچ کا ایک تخت ہے جس پر خدا بیٹھا ہوا ہے۔ دوسروں نے عرش کے مجازی معانی لے کر کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جملہ کائنات پر اقتدار و اختیار ــــ کنٹرول ۔ خدا کا ہے ۔ ان ہر دو مفاہیم کے موافق یا مخالف دلائل دیئے جا سکتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس اختلاف سے انسان کے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ یعنی یہ نہیں کہ ایک طرح سے مانا جائے تو انسان مومن قرار پائے اور دوسری طرح سے مانا جائے تو وہ کافر ہو جائے ۔

لیکن بعض امور ایسے ہیں جنہیں اصولی طور پر اسی طرح ماننا ہوتا ہے، جس طرح وہ قرآنِ کریم میں مذکور ہیں ۔ مثلاً قرآن میں ہے ۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (کہہ دے کہ اللہ ایک ہے)، خدا کا **واحد** ماننا اصلِ دین سے متعلق ہے ۔ اس میں اس کی گنجائش نہیں کہ ایک شخص چاہے تو خدا کو ایک مان لے، اور دوسرا چاہے تو اسے (معاذ اللہ) دو یا تین تسلیم کر لے ۔ خدا کا ایک ماننا ایمان ہے ۔ اور ایک سے زیادہ ماننا کفر ۔

کن باتوں کے ماننے سے ایک شخص مسلمان ہو سکتا ہے اور کن امور کے انکار کرنے سے وہ کافر ہو جاتا ہے، قرآنِ کریم نے ان کی صراحت کر دی ہے ۔ انہیں اجزائے

اجزائے ایمان

ایمان کہا جاتا ہے اور یہ پانچ ہیں ۔ یعنی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ (۲/۱۷۷) ۔ اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب ۔ اور آخرت پر ایمان ۔ دوسری جگہ ہے وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (۴/۱۳۶) ۔ جس نے انکار کیا اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخرت سے، وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا ــــ سارے قرآنِ کریم میں ایمان کے یہی پانچ اجزا بتائے گئے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب کسی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے اس سے کس قسم کا اقرار لیا جاتا ہے؟ اس سے کہا جاتا ہے (اور شاید آپ سے بھی یہ کہا گیا ہو) کہ کہو

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ

میں ایمان لایا اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، موت کے

بعد دوبارہ جی اٹھنے پر اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی، برائی اور بھلائی، نفع نقصان، خیر اور شر، سب خدا کی طرف سے مقدّر ہو چکا ہے۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزا تو خدا نے مقرر کئے تھے، اب اس میں چھٹے جزو کا اضافہ کیا گیا۔ یعنی تقدیر پر ایمان کا اضافہ ـــ اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ خدا، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت کے علاوہ، تقدیر پر بھی ایمان لا لائے۔ اور یہ اضافہ ہوا روایات کی رُو سے۔ مثلاً

چھٹے جزو کا اضافہ تقدیر پر ایمان

(۱) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ بندہ اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر یقین نہ رکھے (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی **معبود** نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) **موت** کو حق جانے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ مانے۔ اور (۴) **تقدیر** پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی۔ ابن ماجہ)

(۲) حضرت ابن دیلمیؒ کہتے ہیں کہ (حضرت) ابن ابی کعبؓ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ تقدیر کے متعلق میرے دل میں کچھ شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ تم کوئی حدیث بیان کرو تاکہ اس کو سُنکر شاید میرے شبہات دُور ہو جائیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر خداوند تعالےٰ آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب میں مبتلا کردے تو وہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ ان پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہرحال بہتر و برتر ہوگی۔ اگر تو اُحد پہاڑ کے برابر بھی خدا کی راہ میں سونا خرچ کرے تو تیرا یہ عمل خیر اس وقت تک خدا کے ہاں قبول نہ ہوگا جب تک تو تقدیر پر کامل اعتقاد و ایمان نہ رکھے اور تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ نہ لے کہ جو کچھ تجھ کو پہنچا ہے وہ رکنے والا اور خطا کرنے والا نہیں تھا۔ (یعنی تجھے اس سے دوچار ہونا تھا)۔ اور جو چیز تجھ کو نہ پہنچنے والی تھی وہ ہرگز ہرگز تجھ کو نہ پہنچتی (یعنی جو کچھ تجھ کو حاصل ہوا وہ تیری سعی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ **مقدّر** میں اسی طرح تھا اور جو چیز تجھ کو نہیں ملی، وہ تیری کوشش سے بھی تجھے نہ ملتی، اس لئے کہ تقدیر الٰہی یونہی تھی) اگر تو اس اعتقاد کے خلاف اعتقاد رکھے گا (یعنی تقدیر الٰہی پر تیرا کامل اعتقاد نہ ہوگا) اور اسی حالت میں تو مر جائے گا تو تُو یقیناً دوزخ میں جائے گا۔ ابن دیلمیؒ کہتے ہیں کہ ابی ابن کعبؓ کا یہ بیان سُنکر میں عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی

یہی کیا۔ پھر حذیفہؓ بن الیمان کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر میں زید ابن ثابتؓ کے پاس گیا۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی حدیث کو رسول اللہ سے روایت کیا۔ (بحوالہ احمد۔ ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

یوں تقدیر کا یہ نظریہ جسے مجوسیوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے مستعار لیا گیا تھا، ہمارے ہاں جزوِ ایمان بن گیا ـــــ ہمارے مذہبی حلقہ میں اس نظریہ نے کس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے، اس کا

سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصریح

اندازہ اس سے لگائیے کہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرت النبیؐ پر سلسلہ وار مجلدات شائع کی ہیں۔ اس سلسلہ کی چوتھی جلد میں انہوں نے عقائد سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور آخرت پر گفتگو کرنے کے بعد "قضاو قدر" کے عنوان سے ایک مستقل باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی ابتداء وہ یوں کرتے ہیں۔

> اگرچہ قرآنِ پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ بعض صحیح حدیثوں میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار دی گئی ہے۔ (صـ۸۶۰)

کسی نظریہ کے "جزوِ ایمان" قرار پا جانے کے عملی عواقب کیا ہوتے ہیں، آپ، آج اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کا اندازہ اس وقت لگ سکتا ہے، جب اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہو۔ ان حضرات کا فتوٰے یہ ہے کہ جو مسلمان، اجزائے ایمان میں سے کسی جزو کا منکر ہو (یعنی وہ اسے اس طرح نہ مانتا ہو جس طرح یہ حضرات کہیں) وہ مرتد ہو جاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ جس زمانے میں ہماری مذہبی پیشوائیت ذی اقتدار تھی، مسئلہ تقدیر کے ضمن میں، خونِ مسلم کی جس قدر ارزانی ہوئی اور جو قتل و غارت گری، اس "فتنۂ ارتداد" کو دبانے کے لئے روا رکھی گئی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس مقام پر آپ کے ذہن میں یقیناً یہ سوال بار بار ابھرتا ہو گا کہ جب اس قسم کے خلافِ قرآن نظریہ کی عام اشاعت ہو رہی تھی، تو کیا امت میں کسی گوشے سے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج

اس کے خلاف صدائے احتجاج

بلند نہ ہوئی؟ کیا مسلمانوں میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں رہے تھے جو قرآنی نقطۂ نگاہ پیش کرکے اس عجمی تصور کی تردید کرتے! ایسے لوگ موجود تھے اور انہوں نے اس کے خلاف پوری شدت سے آواز بھی بلند کی تھی ان طرف سے پیش کردہ دلائل یہ تھے کہ

(۱) دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے جسے عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے۔

(۲) قانونِ مکافاتِ عمل قرآن کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس کی رُو سے انسان اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے اور ان کے اچھے یا بُرے نتائج کا سزاوار۔ سلسلہ رشد و ہدایت (رسل و کتب) اور جزا و سزا (آخرت)، سب اسی مقصد کے لئے ہیں۔ اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ مجبور ہے ــــ یعنی وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ــــ تو ان میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جمادات، نباتات، حیوانات، مجبور ہیں۔ ان کی طرف نہ کوئی نبی بھیجا گیا نہ ہی وہ جزا اور سزا کے مکلف ہیں۔

اس پر آپ پوچھیں گے کہ نظریۂ جبر کے حامیوں کی طرف سے ان دلائل کا جواب کیا دیا گیا۔ ــــ بحث کی خاطر تو ان کی طرف سے جواب دیا گیا ــــ اور جواب وہی احادیث تھیں جن میں سے چند ایک پہلے درج کی جا چکی ہیں ــــ لیکن درحقیقت ان حضرات کو، دلائل کا جواب، دلائل کی رو سے، دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ــــ اس کے لئے ان کی ٹیکنک ہی اور ہوتی ہے۔ وہ، جس مخالف کے دلائل کا جواب نہیں دے سکتے، اس کے لئے ایک لیبل تراش لیتے ہیں، اور پھر مسلسل پراپیگنڈہ

بس لیبل لگا دینا کافی ہے

سے، اس لیبل کو اس قدر گھناؤنا بنا دیتے ہیں کہ جس پر اسے چسپاں کر دیا جائے، عوام (بلا سوچے سمجھے) ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے کی باتوں کو چھوڑیئے۔ ہمارے دور میں سرسیدؒ نے کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے قدامت پرست طبقہ کو اختلاف تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ لوگ اس کے اعتراضات کا جواب دلائل سے دیتے، انہوں نے اس کے خلاف ایک لیبل تراشا ــــ سرسیدؒ نے کہا تھا کہ اقوامِ مغرب کی ترقی کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے فطرت کی قوتوں کو مسخر

سرسیّد کے خلاف لیبل

کیا ہے اور ان سے قسم قسم کے کام لے رہے ہیں. ہم بھی جب تک "نیچرل سائنس" کی تعلیم حاصل نہیں کرتے، مصاف زندگی میں ان اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکتے. ان حضرات نے "نیچر" (NATURE) کا لفظ پکڑ لیا اور مشہور کر دیا کہ سرسیّد "نیچری" ہے. اور پھر "نیچری" کو وہ معنی پہنائے کہ یہ لیبل، دہریہ، ملحد، بے دین کے مرادف ہوگیا. سرسیّد جو بات بھی کہتا، اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا کہ یہ شخص نیچری ہے اس لئے کوئی شخص اس کی بات نہ سُنے، ورنہ وہ بھی نیچری ہو جائے گا ___ اور کوئی شخص اتنا بھی نہ پوچھتا کہ صاحب! نیچری کہتے کسے ہیں اور اس میں برائی کیا ہوتی ہے. یہ ہوتی ہے لیبل تراشی کی ٹیکنک.
اس سلسلہ میں آپ نے وہ مشہور حکایت بھی سُنی ہو گی کہ سرحد کے ایک گاؤں میں بنیا (ہندو) رہتا تھا گاؤں کا ملّا کسی بات پر اس سے خفا ہوا تو مسجد میں جاکر اعلان کر دیا کہ لوگو! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے گاؤں کا بنیا وہابی ہوگیا ہے. یہ سُنکر گاؤں کے لوگ، اس "وہابی" کے خلاف اُمنڈ پڑے اور جب تک اس نے ملّا سے جاکر معافی نہیں مانگی (یعنی یہ نہیں کہا کہ وہ وہابی نہیں، ہندو ہے) اس کا پیچھا نہیں چھوڑا. یہ ہوتی ہے لیبل تراشی!

نظریۂ تقدیر کے مؤیدین نے بھی اپنے مخالفین کے خلاف اسی قسم کے لیبل تراش لئے تھے کہیں انہیں معتزلہ کہا گیا. کہیں قدریہ کہہ کر پکارا گیا. پھر قدریہ کے متعلق اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

اَلْقَدْرِیَّۃُ مَجُوْسُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ

قدریہ، اس اُمّت کے مجوس ہیں.

اب ظاہر ہے کہ جس شخص (یا فرقہ) کو مجوس قرار دے دیا جائے اس کے مرتد، فلھذا واجب القتل ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے (بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ روایت وضعی ہے اور محض پراپیگنڈہ کی تخلیق. اس لئے کہ عہدِ رسالت مآبؐ میں نہ جبر و قدر کی بحثیں چھڑی تھیں اور نہ ہی اُس وقت اُمّت میں کسی فرقہ کا وجود تھا. لیکن پراپیگنڈہ سے متاثر فضا میں، ان باتوں پر غور کون کرتا ہے؟). بہرحال، تقدیر کا قرآنی نظریہ پیش کرنے والوں کو مرتد قرار دے کر، نہ صرف یہ کہ انہیں حوالۂ دار و رسن کیا گیا بلکہ ستم بالائے ستم، کہ ان کی تصانیف کو ڈھونڈ کر، نذرِ آتش کر دیا

گیا، اور اس طرح انسانیت اس قدر گراں بہا علمی متاع سے محروم ہو گئی۔ معتزلہ (یا قدریہ) تو یوں ختم ہو گئے، لیکن اس کے بعد یہ روش عام ہو گئی کہ یوں ہی کسی نے عقل و فکر کے مطابق کوئی بات کی، بارگاہ پیشوائیت سے اس پر اعتزال کا لیبل لگا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ یوں، اُمّت میں فکر کی شمعیں گل ہوتی اور عقل کے چراغ بجھتے چلے گئے۔ چنانچہ سرسیّد کو بھی معتزلہ قرار دیا گیا تھا اور راقم الحروف کے خلاف ایک ہزار "علمائے کرام" نے جو کفر کا فتوےٰ صادر فرمایا تھا، اس میں بھی فردِ جرم یہی تھی کہ اس شخص کے خیالات میں اعتزال کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ یعنی یہ کچھ سمجھ بوجھ کی باتیں کرتا ہے! ظاہر ہے کہ پیشوائیت کی عدالت میں اس سے بڑا جرم اور کون سا ہو سکتا ہے!!

بہرحال، یہ تھا نظریۂ تقدیر کے خلاف آواز اٹھانے کا نتیجہ۔ اس بحث و نظر کے سلسلہ میں عقیدۂ جبر کے مؤیدین کی طرف سے، قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات بھی پیش کی گئیں جن میں (مثلاً) یہ کہا گیا ہے کہ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ اور جس کا ترجمہ یوں کیا

مسئلہ جبر کی تائید میں قرآنی آیات

جاتا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔ یا یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ۔ وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے دے۔ آئندہ ابواب میں ہم اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ واضح رہے کہ اگر عقیدہ جبر کے مؤیدین کی طرف سے یہ آیات نہ بھی پیش کی جاتیں، تو بھی ہمارے لئے ضروری تھا کہ ان کا صحیح مفہوم سامنے لایا جائے۔ اس لئے کہ اس کے بغیر مسئلہ تقدیر کماحقہٗ، سمجھ میں نہیں آسکتا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ان آیاتِ قرآنی تک پہنچیں، فہمِ قرآن کے سلسلہ میں دو ایک اصولی باتیں

فہمِ قرآن کے سلسلہ میں بنیادی اصول

تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآنِ کریم نے اپنے منجانب اللہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲)۔ کیا

یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے بجائے کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلافات پاتے۔ لہذا، پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ سارے قرآن میں، متضاد باتیں کہیں نہیں ملیں گی۔ یعنی ایسا کہیں نہیں ہوگا کہ ایک جگہ تو وہ یہ کہہ دے کہ جس کا جی چاہے سیدھی راہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے گمراہ ہو جائے۔ اور دوسری جگہ کہہ دے کہ تم اپنی مرضی سے کوئی راستہ اختیار نہیں کر سکتے ہم جسے چاہیں صحیح راستے پر لگا دیں اور جسے چاہیں گمراہ کر دیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر قرآنِ کریم میں ایسی آیات ملیں جن میں بادی النظر میں تضاد دکھائی دیتا ہو، تو نہ تو انہیں سطحی نظر سے دیکھنا چاہیئے اور نہ ہی آنکھیں بند کر کے ان سے آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ قرآن نے اس مقصد کے لئے تدبر کو شرط قرار دیا ہے۔ ان آیات پر تدبر و تفکر سے، ان کا حقیقی مفہوم سامنے آجاتا ہے اور تضاد باقی نہیں رہتا۔

تدبر فی القرآن کے سلسلہ میں دو اہم نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن کی کسی ایک آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مضمون کی جتنی آیات قرآن میں جا بجا بکھری پڑی ہوں ان سب کو سامنے رکھا جائے۔ اس طرح، قرآن کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ "تصریفِ آیات" سے اپنا مفہوم واضح کرتا ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے — قرآن فہمی کے لئے یہ شرط لاینفک ہے۔

اور دوسرا نکتہ یہ کہ قرآنِ کریم کی کسی آیت کا کوئی ایسا مفہوم صحیح نہیں سمجھا جا سکتا جو اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف ہو۔ مثلاً قرآن کی مجموعی تعلیم یہ ہے کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کو الخالق کہا گیا ہے (تخلیق کرنے والا)۔ اور دوسری جگہ اسے اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ کہا گیا ہے، یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین اور متوازن تخلیق کرنے والا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآن، خدا کے علاوہ اور بھی خالق تسلیم کرتا ہے، جبھی تو اس نے اُسے خالقین میں کا احسن قرار دیا ہے۔ اس سے (بنظر بظاہر) شرک کا پہلو متبادر ہوتا ہے۔ یہ تضاد، قرآنِ کریم کی دیگر آیات کو سامنے لانے سے رفع ہو جاتا ہے۔ اس نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ وہ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یا بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ یعنی وہ ایسا خالق ہے جو کائنات کو عدم (NOTHINGNESS) سے وجود (EXISTENCE) میں لایا ہے۔ ایسا کوئی اور نہیں

کرسکتا۔ لہٰذا، خدا کے خالق ہونے اور انسان کے خالق ہونے میں فرق یہ ہے کہ خدا، اشیائے کائنات کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور انسان صرف اتنا کرسکتا ہے کہ جو مسالہ موجود ہے اس سے مختلف قسم کی چیزیں تخلیق کرلے۔ اس سے، نہ تو شرک کا شائبہ باقی رہا اور نہ ہی ان دو آیات میں کوئی تضاد پیدا ہوا۔

یہ ہے قرآن فہمی کا صحیح طریق۔ اس کے مطابق ہم آئندہ ابواب میں ان آیات کو سامنے لائیں گے جن کو عرفِ عامہ میں آیاتِ مشیت کہا جاتا ہے۔ یعنی مَایَشَآء۔ مَنْ یَّشَآءُ۔ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ کے قبیل کی آیات۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔

لیکن اس سلسلہ میں بھی ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ ان آیات کے متعلق، آئندہ صفحات میں، آپ کے سامنے اس قسم کے الفاظ اکثر آئیں گے کہ "اس آیت کا عام طور پر مفہوم یہ لیا جاتا ہے" یا "اس آیت کا مروجہ ترجمہ یہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کا مفہوم یوں ہے" "عام مفہوم" یا "مروجہ ترجمہ" سے مراد یہ نہیں کہ عوام الناس میں ایسا مشہور ہے۔ یہ مفاہیم ہماری کتبِ تفاسیر میں دیئے گئے ہیں جو علماء کی لکھی ہوئی ہیں اور قرآن کریم کے ترجمے بھی جہلا کے کئے ہوئے نہیں۔ اس مقام پر پھر یہ سوال آپ کے دل میں پیدا ہوگا کہ مفسرین کرام نے ان کا ایسا مفہوم کیوں بیان کیا اور ان کا ایسا ترجمہ کس طرح کردیا گیا۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے۔

قرآن کریم کی تفسیریں

جس طرح ہماری پہلی تاریخ امام طبری نے قریب چوتھی صدی ہجری میں مرتب کی، اسی طرح انہی (امام طبری) نے ہماری سب سے پہلی مبسوط تفسیر القرآن بھی لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے ہر آیت کی تشریح میں روایات نقل کردیں اور اس طرح یہ خیال قائم کردیا کہ وہ تشریح ان کی اپنی یا کسی اور عالم کی نہیں بلکہ وہ خود ذاتِ رسالتمآبؐ کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس تفسیر کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ ارشادِ رسول اللہ ہے، کون مسلمان اس سے انکار کرسکتا، یا یہ کہنے کی مجال اور جرأت کرسکتا ہے کہ (معاذ اللہ) وہ تفسیر صحیح نہیں، میری بیان کردہ تفسیر صحیح ہے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفاسیر لکھی گئیں، ان کی بنیاد امام طبری کی تفسیر پر ہے۔ اگر کسی نے اس سے اختلاف کیا ہے تو صرف اس حد تک کہ امام طبری کی بیان کردہ فلاں روایت کمزور ہے۔ اس کی جگہ یہ روایت صحیح ہے، یعنی تفسیر پھر روایات ہی کی بنیاد پر کی گئی۔ اس کے بعد جب تراجم کی باری آئی، تو ظاہر ہے کہ اس بات کا التزام کیا گیا کہ ترجمہ کے الفاظ اس تفسیر سے مختلف نہ ہوں جو روایات کی رو سے متوارث چلی آرہی ہے۔

روایات کے ساتھ یہ عقیدہ بھی ہمارے ہاں متوارث چلا آرہا ہے کہ اسلاف کی روش سے ذرا سا اختلاف

بھی سخت گناہ کا موجب ہے۔ اگر روایات کے متعلق یہ سمجھا جاتا کہ وہ حتمی اور یقینی طور پر حضور نبی اکرمؐ کے ارشادات نہیں بلکہ آپؐ کی طرف منسوب کردہ اقوال افعال ہیں اور اسلاف بھی بہرحال ہماری طرح کے انسان تھے، تو علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے، قرآنی آیات کا ' ان تفاسیر سے جداگانہ مفہوم لیا جاسکتا تھا۔ ایسا نہ سمجھے جانے کا نتیجہ تھا کہ قرآن فہمی جامد ہو کر رہ گئی۔ اگر قرآنِ کریم کا مفہوم خود قرآن سے متعین کیا جاتا اور اسے اپنے اپنے زمانے تک کے علمِ انسانی کی روشنی میں سمجھا جاتا تو قرآنی تفاسیر کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ میں نے قرآنِ کریم کو اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کی آیات کا مفہوم اسی طرح متعین کیا ہے۔ باقی رہا ترجمہ، سو جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں واضح کیا جاچکا ہے، قرآنِ کریم کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ قرآنی الفاظ کے مرادفات کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔ اس لئے قرآنِ کریم کا مفہوم تو بیان کیا جاسکتا ہے، ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ ترجمہ کے الفاظ سے اس کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ وجہ ہے کہ میں نے قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس کا مفہوم ہی مرتب کیا ہے۔ یہی مفہوم آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیگا اور اس کی سند خود قرآنی آیات ہوں گی۔

دسواں باب

قانونِ مشیّت

عربی زبان میں ایک مادہ (ROOT) ہے ــــ ش - ی - ء ــ اس سے شَآءَ - یَشَآءُ - شَیْئًا ــ مَشِیْئَۃٌ جیسے الفاظ بنتے ہیں. ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ "چاہنا" کیا جاتا ہے. یہی ترجمہ، یا یوں کہئے کہ "مشیّت" کا غیر واضح مفہوم ہے جو مسئلہ تقدیر کے ضمن میں بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن گیا ہے. اس لئے اسے اچھی طرح سے سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

مشیّت کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں. بعض متکلّمین نے ارادہ اور مشیّت میں کوئی فرق نہیں کیا

ارادہ اور مشیّت میں فرق

لیکن لغت کے اعتبار سے ان دونوں میں فرق ہے۔ ارادہ تو فقط کسی بات کے چاہنے کو کہتے ہیں اور جب اس ارادہ کے مطابق، وہ بات وجود میں آجائے تو اسے مشیّت کہا جاتا ہے. اس لئے شَیْءٌ کسی ارادہ کی وجود پذیر شکل کا نام ہے. جب ان الفاظ کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے تو ارادہ اور مشیّت کے اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اگرچہ عام استعمال میں دونوں کے معنی "چاہنے" کے لئے جاتے ہیں. مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ٥ (۳۶/۸۲). خدا کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے. یہاں سے واضح ہے کہ جب ارادۂ خداوندی، فَیَكُوْنُ (وجود میں آجانے) کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسے مشیّت کہا جاتا ہے۔

دوسرے باب میں بالتفصیل بتایا جاچکا ہے کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کے دو حصّے ہیں. ایک

عالمِ امر، اور دوسرا عالمِ خلق۔ عالمِ امر کے سلسلہ میں، میں نے اپنی کتاب، لغات القرآن میں لکھا ہے۔

یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو ایک مقام ایسا ضرور آئے گا جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہاں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک معلول (EFFECT) بغیر کسی سابقہ علت (CAUSE) کے ظہور میں آگیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے کائنات کا سلسلہ، خدا کی مرضی، منشاء، ارادہ اور اس کی پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلۂ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔ اس مقام پر مشیّتِ خداوندی (ہمارے تصورات کے مطابق) کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔

(مادہ۔ ش۔ ی۔ أ صفحہ ۹۸۸)

یہ خدا کا عالمِ امر ہے، جہاں ہر شے اس کی اسکیم کے مطابق، وجود میں آتی ہے ـــ یعنی اس کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے لئے قوانین مقرر ہوتے ہیں۔ یہ سب، خدا کے اقتدارِ مطلق کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہی قوانین، عالمِ خلق میں کارفرما ہیں۔ اگر کوئی پوچھے کہ پانی نشیب کی طرف کیوں بہتا ہے، آگ حرارت کیوں پہنچاتی ہے، سنکھیا مہلک کیوں ہے، تو اس کے جواب میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکے گا کہ "خدا کی مشیّت" ہی ایسی تھی۔ یعنی یہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جو مشیّتِ خداوندی کی رُو سے، عالمِ امر میں، مقرر ہوئے تھے۔ طبیعی کائنات میں جو قوانینِ فطرت کارفرما ہیں، قرآنی نقطۂ نگاہ سے وہ بھی قوانینِ مشیّت ہیں اور انسانی زندگی سے متعلق جو قوانین بذریعہ وحی عطا ہوئے ہیں، انہیں بھی قوانینِ مشیّت کہا جائے گا ـــ یعنی یہ حقیقت کہ انسانی جسم کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ کھاتا پیتا ہے، قانونِ مشیّت ہے اور یہ بات کہ انسانی ذات کی نشوونما ان چیزوں سے ہوتی ہے جنہیں وہ دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیتا ہے، یہ بھی قانونِ مشیّت ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں خدا کے متعلق شَاءَ۔ یَشَآءُ۔ جیسے الفاظ آئیں ان کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ "خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" ان کا ترجمہ یوں ہونا چاہیئے کہ

سب کچھ خدا کے قانونِ مشیئت کے مطابق ہوتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ترجمہ کے اتنے سے فرق سے، قرآنِ کریم کے وہ مقامات کس طرح واضح ہو جاتے ہیں جو، پہلے ترجمہ کی رُو سے، وجہ ہزار پریشانی بنے رہتے ہیں اور جنہیں سلجھانے کے لئے ہزار قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ان کے باوجود، یہ مقامات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھتے چلے جاتے ہیں۔ طبیعی کائنات میں یہ قوانین، علومِ سائنس کی رُو سے سمجھ میں آئیں گے اور انسانی دنیا میں، قرآنِ کریم میں غور و تدبّر سے۔ زیرِ نظر باب میں انہی مقامات کو سامنے لایا جائے گا۔

---

(۱) لَوْ شَآءَ اللّٰہُ

قرآنِ کریم میں یہ ترکیب، متعدد مقامات میں آئی ہے۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے "اگر اللہ چاہتا تو......" اس کا صحیح ترجمہ یوں کرنا چاہیئے کہ "اگر اللہ اس قسم کا قانون مشیئت مقرر کر دیتا تو ایسا ہو جاتا۔۔۔" مثلاً اگر کہا جائے کہ نمک، نمکین کیوں ہے، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون مشیئت یہ ہے کہ نمک نمکین ہو۔ اگر اس کا قانونِ مشیت یہ ہوتا کہ نمک میٹھا ہو، تو نمک میٹھا ہو جاتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ـــ اگر خدا چاہے تو اب بھی نمک، میٹھا ہو سکتا ہے یا نہیں، تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اگر وہ چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ ایسا چاہے گا نہیں، کیونکہ اس نے قوانینِ مشیئت مقرر کر دینے کے بعد خود ہی کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا۔ (تفصیل ان امور کی پہلے گذر چکی ہے)۔

لَوْ کا مفہوم

اس ترکیب (لَوْ شَاءَ) میں (عربی زبان کی رُو سے) لَوْ کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ سیوطی نے اتقان میں کہا ہے کہ

ابنِ ابی حاتم نے ضحاک کے طریق پر ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ

قرآن شریف میں جس جگہ بھی "لَنْ" آیا ہے اس کے معنی ہیں کہ یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔

(اتقان حصہ اوّل۔ چالیسویں نوع)

قرآنی مثالیں

امام ابنِ حزم نے بھی الملل و النحل میں یہی کہا ہے اور پھر اس کی بڑی تفصیلی تشریح کی ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) اشیائے کائنات (یعنی انسان کو چھوڑ کر باقی تمام مخلوق، جمادات، نباتات، حیوانات، وغیرہ) کے متعلق خدا کا قانونِ مشیت یہ ہے کہ جس روش پر چلنے کے لئے انہیں پیدا کیا گیا ہے، وہ اس پر از خود چلی جاتی ہیں۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ جس کا جی چاہے اس روش پر چلے اور جس کا جی چاہے اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرلے۔ یہ ہدایت (کہ کس نوع کو کس روش کے مطابق چلنا ہے) ہر نوع کے ہر فرد کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اسے جبلّت (INSTINCT) کہتے ہیں اور قرآنِ کریم نے اسے، ان چیزوں کی طرف "وحی" سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو ان چیزوں کی فطرت کہا جاتا ہے۔ پانی کی یہ فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ بکری کی یہ فطرت ہے کہ وہ گھاس کھائے، گوشت نہ کھائے۔ شیر فطرۃً گوشت خور ہے۔ وہ گھاس کھا ہی نہیں سکتا۔

اس اصول کے مطابق، تمام دنیا کی بکریوں کی ایک ہی فطرت ہے۔ تمام شیروں کی ایک ہی روش ہے۔ بالفاظِ دیگر، ان میں سے ہر نوع، امتِ واحدہ ہے۔ ان میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔

ان کے برعکس، انسان ہے کہ اس کی نہ کوئی فطرت[1] ہے جس کے مطابق چلنے کے لئے اسے مجبور پیدا کیا گیا ہو اور (اس لئے) نہ ہی نوعِ انسانی کے ہر فرد (ہر انسانی بچے) کے اندر از خود

---

[1] انسانی فطرت (HUMAN NATURE) کا تصور، اس قدر عالمگیر ہونے کے باوجود، یکسر خلافِ واقعہ اور خلافِ قرآن ہے۔ فطرت مجبور کی ہوتی ہے، صاحبِ اختیار کی نہیں۔ خود ہمارے (مسلمانوں کے) ہاں بھی فطرتِ انسانی کا تصور عام ہے۔ بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اور اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ تصورات قرآن کے خلاف ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھئے لغات القرآن عنوان (ف۔ ط۔ ر)۔

کوئی ہدایت موجود ہے۔ انسان کو یہ ہدایت خارج سے (بذریعہ وحی) ملتی ہے اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے اس ہدایت کے مطابق چلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر کے دوسری روش اختیار کر لے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام نوعِ انسان از خود " اُمّتِ واحدہ " نہیں ہے۔ ان میں اختلافات ہیں۔ کوئی مومن ہے کوئی کافر، کوئی نیک ہے کوئی بد، کوئی آج بد ہے کل کو نیک ہوسکتا ہے۔

دنیا میں شر اور فساد، ظلم و استبداد کو عام دیکھ کر، سطحی بین لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے ایسا کیوں نہ کیا کہ سب انسان نیک ہی ہوتے۔ کوئی برائی کر ہی نہ سکتا۔ اس نے ہر ایک کو مومن ہی کیوں نہ بنا دیا۔ خدا کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ ساری نوعِ انسان کو امتِ واحدہ ایک روش پر چلنے والے) بنا دیتا تاکہ نہ ان میں باہمی اختلافات ہوتے، نہ جھگڑا اور فساد برپا ہوتا۔

تمام انسانوں کو نیک ہی کیوں نہ پیدا کر دیا گیا

قرآن نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اگر خدا کی مشیئت میں ایسا ہوتا تو وہ انسان کو بھی دوسری مخلوقات کی طرح مجبور پیدا کر دیتا اور اس طرح پوری نوعِ انسان (بھیڑوں، بکریوں کی طرح) امتِ واحدہ ہوتی۔ ان میں کوئی اختلاف ہوتا ہی نہ۔ لیکن اس کی مشیئت ایسی نہیں تھی۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اب کوئی ایسا طریق، انداز یا نظام جس سے اس کے اختیار و ارادہ کو سلب کر کے، اسے کسی خاص روش پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا جائے، خلافِ قانونِ مشیئت ہوگا۔ نہ تو اب خدا ہی ایسا کرے گا اور نہ ہی کسی انسان کو ایسا کرنا چاہیئے۔ حضور نبی اکرمؐ ایک طبیب مشفق کی طرح بدل و جان چاہتے تھے کہ لوگ، غلط روش چھوڑ کر، صحیح راستہ اختیار کر لیں اور اس طرح ہلاکت سے بچ جائیں۔ قلبِ نبویؐ کی یہی شدتِ آرزو تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، خدا نے کہا کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ٥ (۲۶/۳)۔ تم اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے، اپنی جان گھلا لو گے! (نیز ۱۸/۶)۔

اب دیکھئے کہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے قرآنِ کریم اسے کس انداز میں پیش کرتا ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا۔ اگر مشیتِ خداوندی

میں ایسا ہوتا تو وہ انسانوں کو پیدا ہی ایسا کر دیتا کہ وہ سب ایمان لے آتے۔ وہ، انہیں بھی، دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا کر دیتا لیکن اس کی مشیّت ایسی نہیں تھی۔ اس نے انسان کو مجبور پیدا نہیں کیا۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ (۱۰/۹۹)۔ تو (اے رسولؐ!) کیا تو لوگوں کو جبراً مسلمان کرنا چاہتا ہے؟ یہ تو خدا کے قانونِ مشیّت کے خلاف ہوگا۔ انسان کو جبراً مومن بنانا مقصودِ مشیّت ہوتا تو ہر انسانی بچے کی فطرت میں یہ راہ نمائی رکھ دی جاتی اور اس طرح وہ (دیگر حیوانات کی طرح) اپنے جبلّی تقاضوں کے ماتحت ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور ہو جاتے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا...... (۳۲/۱۳)۔ [اگر ہماری مشیّت کا تقاضا ہوتا کہ تمام انسان مجبوراً ایک ہی راہ پر چلیں تو ہم ان کے اندر ایسی جبلّت رکھ دیتے]۔ لیکن ہمارا قانونِ مشیّت یہ نہیں۔ انسانوں کے لئے قانون یہ ہے کہ ہم نے رسول کی وساطت سے انہیں بتا دیا ہے کہ ان کے لئے صحیح راستہ کون سا ہے اور اس کے بعد کہہ دیا کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوگی اور اس بات کی پرکھ کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ کو کس طرح استعمال کرتے ہیں (۴۸ ـ ۴۹/ ۵)۔ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے صحیح راہ کا انتخاب کر کے ایک دوسرے کے ساتھ ہم فکر و ہم عمل ہو جائیں۔ اس طرح ان کے اختلافات مٹ سکیں گے۔ انہیں جبراً نہیں مٹایا جائے گا۔ (۱۱۸ ـ ۱۱۹/ ۱۱)۔ ایسی صورت میں (یعنی اگر انسان کو **مجبور** پیدا کیا جاتا تو) نہ کوئی کافر ہوتا نہ مشرک (۶/۱۰۸ ؛ ۶/۱۳۸) لیکن پھر انسان، انسان نہ رہتے، پتھر کی چٹانیں یا حیوانات کا گلہ بن کر رہ جاتے۔

پیدائشی طور پر صاحبِ اختیار و ارادہ، انسان سے، کسی بات کو جبراً منوانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے سر پر تلوار رکھ دی جائے۔ اور دوسرا طریقہ (جو پہلے طریقہ سے کہیں زیادہ مؤثر اور کامیاب ہے)، یہ کہ کسی طرح اس کے اختیار و ارادہ کی قوّت کو سلب کر دیا جائے۔ نشہ پلا کر ـــ کلوروفارم سنگھا کر، یا (اب) ہپناٹزم کے ذریعہ مسحور کر کے۔ مسلکِ خانقاہیت میں یہ مقصد کرامات دکھا کر حاصل کیا جاتا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت، یہ روش ساری دنیا میں عام تھی۔ اس کے پیشِ نظر کفارِ عرب، حضورؐ سے باربار فرمائش اور تقاضا کرتے تھے کہ وہ کوئی فوق الفطرت کام کر کے دکھائیں۔ عام اصطلاح میں

معجزہ کا مطالبہ اُسے **معجزہ** کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ، آپؐ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے[1]۔ اس کے جواب میں، خدا اپنے رسول سے کہتا تھا کہ ان سے کہو کہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ تم اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے، انسانوں کی طرح غلط اور صحیح کے متعلق خود فیصلہ کرو اور تم چاہتے ہو کہ معجزات دکھا کر تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر دیا جائے اور اس طرح تم سے جبراً بات منوائی جائے۔ اگر تم سے جبراً ہی بات منوانی ہوتی تو تمہیں اختیار کی استعداد کیوں دی جاتی۔ یہ خدا کے شایانِ شان نہیں کہ تمہیں اختیار کی صلاحیت دے کر، اسے پھر سلب کر لے۔ (اقبال کے الفاظ میں)۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند
آدم بمیرد، از بے یقینی

سورۂ یونسؑ کی مذکورہ صدر آیت میں، جہاں رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ کیا تو چاہتا ہے کہ انہیں مجبوراً مومن بنا دیا جائے، تو اس سے کفار کے اسی مطالبہ کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْہِ اٰیَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا اپنے رسول کو کوئی معجزہ کیوں نہیں دیتا۔

اس کا جواب قُلْ اِنَّ اللّٰہَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَۃً وَّ لٰکِنَّ اَکْثَرَھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۶/۳۷)۔ ان سے کہو کہ معجزات کا رُونما کر دینا خدا کے لئے ناممکن نہیں۔ لیکن انہیں اس حقیقت کا علم نہیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتا۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ تم اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر صحیح اور غلط فیصلہ کرو۔ وہ تمہاری عقل و فکر کو ماؤف کر کے تم سے حقیقت منوانا نہیں چاہتا۔ اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے کہہ دیا گیا کہ "اگر تم ایسا کر سکو کہ زمین میں کوئی سرنگ لگا کر (پاتال تک جا پہنچو)۔ یا آسمان میں سیڑھی لگا کر عالمِ بالا تک پہنچ جاؤ اور وہاں سے کوئی ایسا معجزہ لے آؤ جس سے ان کی تسلی ہو جائے تو یہ اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ یہ لوگ اس طرح مبہوت ہو کر تمہارے سامنے سپر ڈال دیں،

---

[1] قرآنِ کریم کی جن آیات کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان میں انبیائے سابقہ کے معجزات کا ذکر آیا ہے ان کے صحیح مفہوم کے لئے "مفہوم القرآن" (از مصنف) کے متعلقہ مقامات دیکھئے۔

لیکن اُسے ایمان تو نہیں کہا جائے گا۔ ایمان تو، دل اور دماغ کی کامل رضامندی اور اطمینان کے بعد صداقت تسلیم کرنے کو کہتے ہیں۔ جبراً مسلمان ہو جانے سے (خواہ اس جبر کی نوعیت کیسی ہی ہو) کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا۔ لہٰذا، تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ، جو حقیقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے کہا کرتے ہیں کہ خدا نے تمام انسانوں کو یک اور مومن کیوں نہ بنا دیا۔ (۶/۳۵) ایمان اسی کا ہوگا جو بات کو دل کے کانوں سے سُنکر اس پر لبیک کہے گا۔ (۶/۳۶)۔

دوسری جگہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے جو معجزات کا مطالبہ ہوتا ہے (۱۳/۲۷) تو اس سے خود تمہاری جماعت کے بعض افراد کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کا مطالبہ پورا کر دیا جائے تو یہ ایمان لے آئیں اور یہ بہت اچھا ہو۔ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی ایسا قرآن بھی ہوتا جس سے پہاڑ چلنے لگ جاتے اور زمین کی دور دراز کی مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ اس سے مردے بھی بولنے لگ جاتے، تو بھی یہ لوگ مومن نہ بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے تمام امور کو اپنے قوانین کے تابع رکھا ہے۔ (۱۳/۳۱)۔ اور اس باب میں اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر معاملہ مشتبہ رہ جاتا ہے۔ (۱۰/۱۰۰) اس کے بعد کہا کہ کیا اب بھی تمہاری جماعت کے لوگ اس بات کو نہیں سمجھے کہ اَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ لَھَدَی النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ (۱۳/۳۱)۔ اگر خدا کی مشیت کا تقاضا ہوتا تو اس کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کر دیتا کہ وہ سب راہِ راست پر چلتے۔

(۲) دنیا میں جنگ و جدال اور قتل و غارت دیکھ کر بھی اکثر لوگوں کے دل میں یہ خیال اُبھرتا ہے

یہ قتل و غارت گری کیوں؟

کہ خدا ایسا کیوں نہیں کرتا کہ لوگ باہمی خونریزیاں نہ کریں۔ (قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں، ملائکہ نے جو اعتراض کیا تھا کہ ہمیں اس کے پیکر میں خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کی چنگاریاں نظر آتی ہیں، تو اس سے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود تھا)۔ اس کے جواب میں، سورۂ بقرہ میں ہے، کہ ہم نے انبیاء کی وساطت سے جو راہ نمائی بھیجی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ لوگ باہمی جنگ و قتال نہ کریں۔ لیکن انبیاء کے چلے جانے کے بعد ان کے نام لیوا پھر آپس میں لڑائی جھگڑے شروع کر دیتے۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقْتَتَلَ .... (۲/۲۵۳)۔ اگر مقصودِ مشیت یہ ہوتا کہ انسانوں میں اختلاف اور قتال کو جبراً روک دیا جائے،

تو خدا انہیں پیدا ہی مجبور کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انہیں صاحبِ اختیار پیدا کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۝ (۲/۲۵۳)۔ ان میں کچھ لوگ ایمان لے آتے ہیں، کچھ انکار کر دیتے ہیں۔

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ کا جو مطلب ہمارے ہاں عام طور پر لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کو منظور ہی ایسا ہے کہ دنیا میں یہ خرابیاں رہیں۔ اگر اسے ایسا منظور نہ ہوتا تو کس کی مجال تھی کہ دنیا میں فتنہ و فساد برپا کر سکتا اور جب خدا کو منظور ہی ایسا ہے تو پھر کسی کو فتنہ و فساد پر مطعون کرنا، اور یہ کوشش کرنا کہ ایسا نہ ہو، خلافِ منشائے خداوندی ہے۔ شاید آپ کہیں کہ آجکل تو کوئی ایسا نہیں کہتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب عقل و بصیرت کی روشنی کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ ایسا نہیں کہتے لیکن اگر آپ تقدیر سے متعلق اپنے ہاں کے اسلاف کا لٹریچر اٹھا کر دیکھیں، بالخصوص مدعیانِ تصوف کا، تو اس میں آپ کو یہی خیالات ملیں گے۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت، مشرکین اور کفار، لَوْ شَآءَ اللّٰهُ سے یہی مراد لیتے تھے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا .... (۶/۱۴۹)۔ اگر اللہ کو ایسا منظور نہ ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے آباء و اجداد ایسا کرتے۔ (نیز ۱۶/۳۵ ؛ ۴۳/۲۰)۔ سورۂ یٰسین میں ہے کہ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھوکوں اور ناداروں کی مدد کرو تو کفار یہ کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ (۳۶/۴۷)۔ کیا ہم ان لوگوں کی روٹی کا انتظام کریں، جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اُسے انہیں بھوکا رکھنا منظور نہ ہوتا تو وہ انہیں امیر کیوں نہ بنا دیتا۔ اس نے جو انہیں غریب رکھا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ انہیں روٹی دینا ہی نہیں چاہتا۔ اگر ہم انہیں روٹی دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم خدا کی مشیت سے جنگ کریں!

قرآن نے یہ ذہنیت مشرکین اور کفار کی بتائی ہے اور اسے سخت جہالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ کا قرآنی مفہوم وہی ہے جسے پہلے بیان کیا گیا ہے۔

۲- مَا شَآءَ اللّٰہُ

ہمارے ہاں مَا شَآءَ اللّٰہُ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے ___ جو اللہ چاہے گا ___ اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہم جو جی میں آئے کریں، ہوگا وہی جو خدا چاہے گا۔ یعنی جو خدا کو منظور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم، تقدیر کے اس تصور سے پیدا ہوتا ہے جس کی رُو سے انسان کو مجبور قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) تقدیر کا یہ تصور خلافِ قرآن ہے، اس لئے مَا شَآءَ اللّٰہُ کا مذکورہ صدر مفہوم بھی صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہو رہا ہے۔ جو شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، وہ اس کا خمیازہ بھگتتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ (۲/۲۵۵)۔ انسان علمِ خداوندی میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا بجز اس طریق کے، اور اسی حد تک، جو اس کے قانونِ مشیّت نے مقرر کر رکھا ہے۔ یعنی عقل و بصیرت کی رو سے یا وحی کے ذریعے۔ یہی دونوں طریق ہیں جو قانونِ مشیّت نے حصولِ علم کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کے ذریعے بھی انسان کو، علمِ خداوندی کے مقابلہ میں، محدود علم ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآنی مثالیں

(۲) سورۂ کہف میں، دو باغ والوں کا قصہ تمثیلاً بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک، صحیح نگاہ رکھتا تھا اور دوسرے کے متعلق کہا ہے وَ ہُوَ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ (۱۸/۳۵)۔ وہ اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کرتا تھا۔ وہ خدا کا بھی منکر تھا اور اس کے قانونِ مکافات کا بھی۔ قانونِ مکافاتِ عمل سے انکار (یعنی اس حقیقت سے انکار کہ انسان جو کچھ بوتا ہے وہی کچھ کاٹتا ہے) کا نتیجہ یہ ہوا کہ (اس نے کھیتی کی طرف سے غفلت برتی اور) وہ تباہ ہو گئی۔ اس پر اس کے ساتھی نے (جو ان امور پر ایمان رکھتا تھا) اس سے کہا کہ تجھے چاہیئے تھا کہ اپنی کھیتی اور باغات کو دیکھ کر ہمیشہ یہ کہتا کہ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ (۱۸/۳۹)۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی میں ایسی قوت و اقتدار نہیں کہ انہیں پیدا کر سکے اور پروان

چڑھا سکے۔

(۳) "خیر و شر" کے عنوان میں، نفع اور نقصان کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر ایک بار پھر نگاہ ڈال لیجئے۔ یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق عمل کرنے سے نفع ہوتا ہے، اس کی خلاف ورزی سے نقصان۔

سورۂ یونس میں ہے کہ اے رسولؐ! یہ مخالفین تجھ سے بار بار پوچھتے ہیں کہ تم جو کہتے ہو کہ اگر ہم غلط روش پر چلتے رہے تو ہماری تباہی آجائے گی، تو ہمیں بتاؤ کہ وہ تباہی کب آئے گی۔ اس

نفع اور نقصان

کے جواب میں کہا کہ ان سے کہو کہ تم مجھ سے اس طرح پوچھتے ہو، گویا اس انقلاب کا لانا میرے اپنے اختیار میں ہے، لہذا میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کب آئے گا۔ یہاں سب کچھ خدا کے قانونِ مشیّت کی رُو سے ہوتا ہے۔ وہ انقلاب تو ایک طرف لَآ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (۱۰/۴۹) میں تو خود اپنی ذات کے لئے بھی، خدا کے قانونِ مشیت کے خلاف نفع نقصان کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اپنی مرضی سے اپنے لئے سنکھیا کو ممدِ حیات بناؤں یا پانی میں زہر کی خاصیت پیدا کر دوں۔ یا ایسا کر سکوں کہ میرے کھیت میں گندم، دو ماہ کے بعد فصل دے دے اور فریقِ مخالف کے کھیت میں سال بھر کے بعد۔ یہاں ہر بات کے لئے ایک قانونِ مہلت مقرر ہے۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ۔ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ فَلَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ (۱۰/۴۹) جب مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے تو پھر ایک ثانیہ کی بھی دیر سویر نہیں ہوتی۔ لہذا، یہ انقلاب بھی اسی قانونِ مہلت کے مطابق واقع ہوگا۔

یہاں سے لَآ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِیۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو گیا۔

قوموں کی موت و حیات کے اس قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ الرعد میں کہا

مہلت کا قانون

گیا کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ۔ ہر میعاد کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَیُثۡبِتُ۔ جسے ثابت و مستحکم رہنا ہوتا ہے، وہ بھی اس قانون کے مطابق ثابت اور باقی رہتا ہے۔ جسے مٹنا ہوتا ہے وہ بھی

اس کے مطابق مٹتا ہے۔ یہاں نہ کسی قوم کو ثبات یونہی حاصل ہو جاتا ہے، نہ ہی وہ ظلم اور دھاندلی سے مٹادی جاتی ہے۔ یہاں بھی مَا یَشَآءُ کا مفہوم واضح ہے[1]۔ اس کے بعد ہے وَ عِنْدَہٗۤ اُمُّ الْکِتٰبِ (۱۳/۳۹)۔ یہ تو تم سمجھ سکتے ہو کہ قانونِ محو و ثبات کیا ہے۔ یعنی وہ کون سے اسباب ہیں جن کے مطابق ایک قوم کو عروج حاصل ہوتا ہے اور وہ کون سی وجوہات جن کی بنا پر قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ و اسباب کا تو تمہیں علم ہو سکتا ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ قوانین ایسے کیوں بنائے گئے ہیں۔ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے کیونکہ اس کا تعلق اس کے عالمِ امر سے ہے۔ قانون کی اس اصل کو اُمُّ الْکِتٰب کہا گیا ہے۔ یعنی قانون کا سرچشمہ، اس کی جڑ، قانونِ مشیّت محسوس شکل میں کائنات میں کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی اصل، علمِ خداوندی میں ہوتی ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کا مفہوم

(۳) قرآنِ کریم میں بعض مقامات پر، اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ آتا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعلیٰ میں ہے کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ (۸۷/۶-۷)۔ اے رسولؐ! ہم نے تجھے قرآن کو اس انداز سے دیا ہے کہ تو اس میں سے کچھ بھی بھول نہیں سکتا۔ اس کے بعد ہے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تو اس میں سے صرف اتنا بھلا سکتا ہے جتنا خدا چاہے۔ اس سے زیادہ نہیں بھلا سکتا۔ خدا کی طرف سے حضورؐ کو جو وحی عطا ہوئی تھی، اس کا ایک حرف بھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا۔ (۱۷/۸۶)۔ صاحبِ المنار (مفتی محمد عبدہٗ (مرحوم) نے لکھا ہے کہ "استثنار بالمشیت قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے۔ یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَاءَ اللّٰہُ وغیرہ الفاظ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ ان مقامات میں اِلَّا کہنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ان امور کا ثابت اور دائم رہنا خدا کی مشیّت کی رو سے ہے۔ اگر اس کی مشیّت اس کے خلاف ہوتی تو وہ انہیں ویسا ہی بنا دیتا[2]۔ لہٰذا، فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ کے معنی یہ ہیں کہ تو اسے ہرگز ہرگز نہیں بھلا سکے گا۔

---

[1] تفصیل ان امور کی اس باب میں ملے گی جس میں قوموں کی تقدیر کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

[2] تفسیر المنار، جلد اوّل، صفحہ ۴۱۶ — ۴۱۹۔ نیز لغات القرآن صفحہ ۱۶۱۸۔

اسی ضمن میں، سورۃ ھود کی وہ آیات ہیں جن میں جہنّم اور جنّت میں خلود (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنے) کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ...... (۱۱/۱۰۷؛ ۱۱/۱۰۸؛ ۶/۱۲۹)۔ وہ اس میں رہیں گے جب تک سلسلۂ کائنات باقی ہے۔ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ۔ اس کے معنی (مفتی محمد عبدہٗ کی تشریح کے مطابق) یہ ہیں کہ وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہاں میں خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق رہیں گے۔ اس قانون کی تشریح قرآنِ کریم کے دیگر مقامات میں موجود ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ مَا شَآءَ اللّٰہ کے معنی یہ نہیں کہ جیسا خدا چاہے گا ویسا ہوگا۔ اس لئے

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ

کہ انسان کے لئے تو خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ جس طرح تمہارا جی چاہے کرو۔ خدا کی "مشیت" قانون مقرر کرنے تک تھی۔ جب اس نے غیر متبدّل قوانین بنا دیئے تو اس کے بعد انسان کی "مشیت" کارفرما ہوگی۔ یعنی اس کا جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق کام کرے، جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرلے۔ البتہ اس بات کو ذہن میں رکھے کہ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ٥ (۴۱/۴۰)۔ خدا کا قانونِ مکافات دیکھتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ تمہارے کاموں کا نتیجہ اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتّب ہوگا۔ نتیجہ کو بدل دینا تمہاری "مشیت" میں نہیں۔ یہ خدا کی "مشیت" کی رو سے مرتّب ہوتا ہے۔

۳۔ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ

"اِنْ شَآءَ اللّٰہُ" (جس کے معنی کئے جاتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو.....) ہمارے ہاں اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ یہ گویا ہمارا تکیہ کلام بن گیا ہے۔ یہ کن معانی میں استعمال ہوتا ہے

---

[1] خلودِ جنّت و جہنّم سے کیا مراد ہے، اس کے لئے دیکھئے میری کتاب "جہانِ فردا"۔

اس کا اندازہ ذیل کی (تمثیلی) گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک دوست: تم چار بجے پہنچ جاؤ گے ناں!

دوسرا دوست: انشاء اللہ۔

پہلا دوست: بھائی معاملہ بڑا اہم ہے۔ انشاء اللہ کو چھوڑو۔ بات پکی کرو کہ چار بجے پہنچ جاؤ گے یا نہیں۔

یعنی ہمارے ہاں اِنْشَاءَ اللّٰہ اس وقت کہا جاتا ہے جب بات یقینی نہ ہو۔ انشاء اللہ کا یہ استعمال بظاہر عامیانہ سا نظر آتا ہے لیکن بنظرِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ مفہوم عامیانہ نہیں۔ جب عقیدہ یہ ہو کہ انسان لاکھ کوشش کرے، ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو، تو پھر آپ کوئی بات بھی تیقّن سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ میں خود اعتمادی پیدا ہی نہیں ہو سکتی کہ آپ حتمی طور پر کہہ سکیں کہ میں ایسا ضرور کروں گا۔ آپ کو یہی کہنا پڑے گا کہ اگر اللہ کو منظور ہوا تو میں چار بجے پہنچ جاؤں گا۔ چونکہ عقیدۂ جبر ہمارا جزوِ ایمان بن چکا ہے، اس لئے اس کا (شعوری یا غیر شعوری طور پر) نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی بات یقینی طور پر (بغیر اِنْشَاءَ اللّٰہ کے کہی جائے) تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں۔

پی۔ آئی۔ اے کے حادثات

پاکستان کی ہوائی جہاز کی سروس (پی۔ آئی۔ اے) بڑی پُر وثوق اور قابلِ اعتماد شمار کی جاتی تھی۔ اتفاق (یعنی عدم تدبّر) سے ایک دو جہازوں کو کچھ حادثات پیش آ گئے جس کی وجہ سے ملک میں بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ ان حادثوں کے اسباب و وجوہ معلوم کرنے اور نقائص کو دُور کرنے کے لئے تحقیقات شروع ہوئی تو ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے کہا گیا کہ ان حادثات کا حقیقی سبب یہ ہے کہ جہاز کی پرواز کے وقت، کپتان اعلان یہ کرتا ہے کہ ہم اتنے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر کے، اتنے بجے فلاں مقام پر پہنچ جائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ "اِنْشَاءَ اللّٰہ" نہیں کہتا۔ خدا کے ہاں اس قسم کی تعلّی پسند نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اس پر طے کیا گیا کہ جہاز کا کپتان انشاء اللہ ضرور کہا کرے۔

اور اس کے باوجود حادثے ہوتے رہے!

اِنْ شَآءَ اللّٰہُ میں شَآءَ کا مفہوم ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی خدا کا قانونِ مشیّت۔ باقی رہا

حرف اِنْ کے معانی

حرف اِنْ تو اس کے معنی عام طور پر "اگر" کئے جاتے ہیں لیکن اس کے ... ... ایک اور معنی بھی ہیں. جنہیں (بدقسمتی سے) ہمارے ہاں کے قرآنِ کریم کے تراجم میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی رُو سے اِبا جائے گا کہ یہ حرف، تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی، جس مفہوم کے لئے ہم اُردو زبان میں 'چونکہ' استعمال کرتے ہیں، عربی زبان میں ان معانی کے لئے اِنْ بھی آتا ہے. سیوطی نے (اتقان) میں، اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ اِنْ کے ان معانی کی رُو سے دیکھئے کہ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے۔ اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ اپنے دوست سے کہتے ہیں کہ بھائی! مجھے جلدی جانا ہے۔ چائے کا تکلف چھوڑو۔ اس میں بہت وقت لگ جائے گا۔ وہ دوست دیگچی چولھے پر چڑھا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ چائے میں کیا دیر لگے گی۔ آگ جل رہی ہے۔ پانی میں نے رکھ دیا ہے. اب دس منٹ میں چائے تیار ہو جائے گی۔ آپ اس سے کہتے ہیں کہ — دس منٹ میں؟ — وہ کہتا ہے کہ اِنْشَآءَ اللّٰہ۔ یعنی جو کچھ میں کر رہا ہوں چونکہ یہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے، اس لئے اس کا نتیجہ ایسا مرتب ہو کر رہے گا۔ یا، بالفاظِ دیگر، جو کچھ میں کر رہا ہوں، جب یہ قانونِ مشیت کے مطابق ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کا نتیجہ ایسا نہ نکلے۔ لہٰذا، ایسا ہو کر رہے گا — (کتبِ لغت میں ہے اِنْ بمعنی اِذْ بھی آتا ہے۔ جس کا ترجمہ "جب" ہے)۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وہی "انشاء اللہ" جو فقدانِ یقین اور عدمِ خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا، اب حتم و یقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے اِنْ شَآءَ اللّٰہ کا قرآنی مفہوم۔ سیوطی نے اِنْ بمعنی "چونکہ" یا "جب" کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی مشہور آیت وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (۳/۱۳۸)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ تم مومن ہو، اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے یا، جب تم مومن ہو تو ہو نہیں سکتا کہ تم بلند ترین مقام پر فائز نہ ہو۔

ایسا ضرور ہو گا

سورۂ فتح میں ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ .... (۴۸/۲۷)۔ چونکہ تمہارا تمام پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے اس لئے تم ضرور امن و

عاقبت سے کعبہ (یا مکہ) میں داخل ہو گے۔ یا، بالفاظِ دیگر، جب تمہارا پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم مسجدِ حرام میں داخل نہ ہو۔ تم داخل ہو گے اور بالضرور داخل ہو گے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہلِ خاندان، مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا۔ قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ (۱۲/۹۹)۔ چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو رہا ہے، اس لئے تم مصر میں امن و آرام سے رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت شعیبؑ تھے) حضرت موسیٰؑ سے کارندگی کا معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۸/۲۷)۔ چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند رہوں، اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں سے پاؤ گے۔ (نیز ۱۸/۶۹؛ ۳۷/۱۰۲)۔

جنگِ احزاب میں منافقین نے بڑی غداری کی تھی۔ بعد میں یہ سوال سامنے آیا کہ ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے۔ مجرمین کے سلسلہ میں، خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر کسی میں اصلاح کا امکان نظر آئے اور وہ اپنے کئے پر نادم ہو، تو اسے معاف کر دیا جائے۔ اور اگر ایسی صورت نہ ہو تو جرم کی سزا دی جائے۔ اس قانون کے پیشِ نظر، ان (منافقین) کے متعلق بھی کہا گیا کہ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ (۳۳/۲۴)۔ انہیں سزا دی جائے، یا معاف کر دیا جائے، اس کا فیصلہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہو گا (جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے)۔

سورۂ لقمان میں ہے کہ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (۳۱/۳۴)۔ کوئی شخص یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا۔ یہ اس لئے کہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے سلسلہ میں، بعض ایسی کڑیاں بھی رونما اور مؤثر ہو جاتی ہیں جن کا انسان کو قبل از وقت علم نہیں ہو سکتا۔

یہ مت کہو کہ میں کل ایسا ضرور کروں گا

یہی وہ کڑیاں ہیں جنہیں غیب کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جن کے متعلق کہا ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں کہا گیا کہ مستقبل کے جو امور ایسے ہوں جن کے

اسباب (CAUSES) کی تمام کڑیوں کا تمہیں قبل از وقت علم نہ ہو، ان کے متعلق تم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً یہ تو تم کہہ سکتے ہو کہ آج سے سو سال بعد، سورج گہن کس وقت لگے گا، لیکن یہ تم نہیں کہہ سکتے کہ یہ مکھی اس جگہ سے اڑ کر کس جگہ بیٹھے گی۔ ایسے معاملات کے سلسلہ میں کہا کہ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ۔ تم یہ مت کہو کہ میں کل یقینی طور پر ایسا کروں گا۔ جو کچھ تم نے کرنا ہے اس کے لئے، قانونِ خداوندی کے مطابق، ضروری اسباب مہیا کرتے جاؤ اور یہ کہو کہ اگر اس کے قانون کے مطابق جملہ اسباب مہیا ہو گئے تو پھر یقیناً ایسا ہو گا۔ لیکن اگر اس میں ایسی کڑیاں آ گئیں جن کا مجھے قبل از وقت علم نہ ہوا، تو پھر ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ان اسباب و ذرائع کے متعلق سوچنے اور انہیں مہیا کرنے کے سلسلہ میں کہا کہ تم خوب دیکھ بھال کر ضروری تدابیر اختیار کرتے جاؤ۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ۔ اور اگر کوئی بات بھول جاؤ اور اس طرح تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو سکے تو مایوس ہو کر مت بیٹھ جاؤ۔ یاد کرو کہ تم کون سی بات بھول گئے تھے۔ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ۝ (۲۳-۲۴/۱۸)۔ بلکہ کہو کہ مجھے یقین ہے کہ اب مجھے ایسا راستہ نظر آ جائے گا جو منزلِ مقصود تک پہنچنے میں پہلے سے بھی زیادہ قریب کا ہو گا۔

اب وہ مقامات سامنے لائیے جہاں اِنْ شَآءَ اللّٰهُ میں اِنْ بمعنی لَوْ (اگر) آیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ کے عنوان پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے کہ سنکھیا موجبِ ہلاکت نہ ہو، تو ہم اس قسم کا قانون بنا دیتے، لیکن چونکہ ہم ایسا چاہتے نہیں تھے ــ ہماری مشیت یہی تھی کہ سنکھیا باعثِ ہلاکت ہو۔ اس لئے ہم نے ویسا قانون نہیں بنایا، بلکہ ایسا قانون بنایا ہے۔ یہی مفہوم ان آیات کا ہے جن میں اِنْ بمعنی "اگر" آیا ہے۔ مثلاً

اِنْ بمعنی اگر

(۱) سورۂ یٰسٓ میں ہے کہ تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں، اس قدر وزن لادنے کے باوجود، کس طرح سطحِ آب پر بطخ کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ یہ ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ .... (۳۶/۴۳)۔ اگر ہمارا قانونِ مشیت ایسا نہ ہوتا تو پھر یہ کبھی تیر

نہ سکیں، پانی میں ڈوب جاتیں. تم سوچو کہ لوہے کی ایک سوئی پانی میں جھٹ ڈوب جاتی ہے۔ لیکن ہزاروں ٹن وزنی لوہے کا جہاز' اس قدر سامان اور سواریاں لاد کر' کس طرح تیرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے قانونِ مشیت کی کارفرمائی جس کی رُو سے طے کر دیا گیا ہے کہ کس جسامت اور وزن کی چیز پانی پر تیرتی رہے گی اور کونسی شے اس میں ڈوب جائے گی۔ یہی بات ان ہواؤں کے سلسلہ میں کہی جن کے زور پر بادبانی کشتیاں چلتی ہیں۔ (۴۲/۳۳)۔

(۲) حضرت نوحؑ اپنی قوم کو تنبیہ کرتے کہ اگر تم اپنی غلط روش سے باز نہ آئے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ تم جو ہمیں اس طرح ڈراتے رہتے ہو تو وہ تباہی تم لے ہی کیوں نہیں آتے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے کہ اِنَّمَا يَأْتِيكُمْ بِهِ اللَّهُ إِنْ شَاءَ ...... (۱۱/۳۳)۔ یہ تباہی خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق (مہلت کے وقفہ کے بعد) آیا کرتی ہے۔ اُسی قانون کیمطابق تم پر آجائے گی۔

(۳) خدا نے قرآن نازل کیا' اسے مکمل کیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود ہی لے لیا۔ لہذا' یہ تصوّر تک بھی نہیں کیا جاسکتا کہ قرآن کا کچھ حصہ' ضائع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں کہا کہ وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ..... (۱۷/۸۶)۔ اگر ہماری مشیت میں ایسا ہوتا تو ہم قرآن کا کچھ حصہ لے جاتے۔ لیکن ہماری مشیت میں ایسا نہیں تھا۔ اسی لئے ہم نے اسے مکمل کر کے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا ایک حرف بھی ضائع نہیں ہوگا۔

بلکہ یہاں تک بھی کہہ دیا کہ فَإِنْ يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ..... (۴۲/۲۴)۔ اگر اس کی مشیت میں ہوتا تو (اے رسولؐ) وہ تیرے دل پر مہر لگا دیتا اور اس طرح یہ قرآنی پیغام تیرے قلب میں داخل ہی نہ ہو سکتا۔ لیکن خدا کی مشیت ایسی نہیں تھی۔

(۴) خدا نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے کہہ دیا کہ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (۲/۳۶)۔ یہ تمہاری قرارگاہ ہے اور اس میں تمہیں ایک مدت تک رہنا ہے۔ یہ خدا کا قانونِ مشیت ہے۔ یہ سلسلۂ کائنات' ارض و سما' کب تک علیٰ حالہ رہے گا' یا یہ زمین کب تک انسان کا مسکن بننے کے قابل رہے گی' یا خود نسلِ انسانی کا سلسلہ کب تک علیٰ حالہ جاری رہے گا' ان امور کا تعلق' خدا کی مشیت سے ہے جس کا انسان کو کچھ علم نہیں۔ اس لئے کہا کہ إِنْ يَشَأْ

یُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَ يَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ (۴/۱۳۳)۔ اے نوعِ انسانی! اگر خدا کی مشیّت میں ایسا ہو تو وہ تم سب کو یہاں سے لے جائے اور تمہاری جگہ کوئی دوسری مخلوق لے آئے۔ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا (۴/۱۳۳)۔ خدا نے اس کے لئے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔ اس حقیقت کو دیگر مقامات میں بھی دہرایا گیا ہے۔ مثلاً (۱۴/۱۹ و ۳۵/۱۶) میں۔

قوموں کے استخلاف و استبدال (یعنی ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کے آجانے) کے متعلق بھی قوانینِ مشیّت مقرر ہیں، ان کا محو و ثبات انہی قوانین کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس کے لئے بھی اِنْ يَّشَاْ کے الفاظ آئے ہیں۔ (۶/۱۳۴)

چونکہ ہم، ہدایت و ضلالت، عزت و ذلت، حکومت و اقتدار، غریبی اور امیری وغیرہ سے متعلق قوانینِ مشیّت کی بحث آئندہ ابواب میں کر رہے ہیں، اس لئے، اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں البتہ ایک مقام ایسا ہے جو نہایت اہم اور تشریح طلب ہے۔ اس لئے اس کا تذکرہ اسی جگہ ضروری ہے۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے انسانوں سے کہا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ جیسا تم چاہو کرو۔ خود قرآنِ کریم کے متعلق ہے۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ آگاہ رہو کہ یہ ان صداقتوں کی یاد دھانی ہے جنہیں فراموش کر دیا گیا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۱۱-۱۲/۸۰)۔ سو جس کا جی چاہے اس سے تجدیدِ یادداشت کر لے۔ اس سے نصیحت حاصل کر لے لیکن قرآنِ کریم میں اس قسم کی آیات بھی ہیں۔

(۱) اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ..... (۲۹-۳۰/۷۶)۔

(۲) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ؕ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ

الْعٰلَمِیْنَ ۞ (۸۱/۲۹-۲۷) - (نیز ۵۶/۷۴)۔

پہلی آیت کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

یہ تو نصیحت ہے۔ پھر جو کوئی چاہے کر رکھے اپنے رب تک راہ۔ اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ (ترجمہ مولانا محمود الحسن مرحوم)

اور دوسری آیت کا یوں۔

نہیں یہ نصیحت مگر واسطے عالموں (تمام جہانوں) کے واسطے اس شخص کے تم میں سے کہ سیدھی راہ چلے۔ اور نہیں چاہتے مگر یہ کہ جو چاہے اللہ۔ پروردگار عالموں کا۔

(ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)

آپ غور کیجئے کہ ان معانی کی رُو سے صورت کیا سامنے آتی ہے؟ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے یہ ضابطۂ ہدایت نازل کر دیا ہے۔ اب تم میں سے جس کا جی چاہے اس سے سیدھی راہ اختیار کرلے۔ جو ایسا نہ چاہے، غلط راستوں پر چل کر تباہ ہو جائے۔ لیکن اسی سانس میں ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم اپنی مرضی اور اختیار و ارادہ سے کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہاری خواہش، آرزو، مرضی، ارادہ، تمہارا چاہنا یا نہ چاہنا، تمہارے اپنے اختیار کی بات نہیں۔ تم وہی چاہ سکتے ہو جو خدا چاہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس کو تم اپنا فیصلہ کہتے ہو وہ تمہارا فیصلہ ہوتا ہی نہیں۔ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے تم سے کرا لیتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک عقیدۂ جبر وضع کر دینے سے، خود قرآن اور قرآن کے نازل کرنے والے خدا، کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ اگر بات یہی تھی کہ انسان کا عمل تو ایک طرف، اس کی آرزو اور فیصلہ بھی اس کے اپنے اختیار میں نہیں۔ خدا جو فیصلہ چاہتا ہے اس سے کرا لیتا ہے۔ انسان کو وہی چاہنا پڑتا ہے جو خدا چاہتا ہے، تو پھر پہلے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ کتاب ہم نے نازل کر دی ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اس قسم کی بات کرنا، می نسزد خدائے را۔

ان آیات میں مَا تَشَآءُوْنَ کے الفاظ غور طلب ہیں۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے — تم نہیں چاہتے۔ اس میں مَا نفی (نہیں) کے لئے ہے اور تَشَآءُوْنَ مضارع ہے۔ عربی گرامر کی رُو سے، نفی مضارع کے معنی — نہی، یعنی مت کرو — بھی ہوتے ہیں۔ گرامر کی اصطلاح میں اُسے

کہتے ہیں، خبر کا انشاء کے معنوں میں استعمال ہونا۔ یہ ایک فنّی بحث ہے جسے ہم نے لغات القرآن میں مستند کتبِ لغت اور گرامر کی سندات سے تفصیل سے لکھا ہے۔ جو احباب اس تفصیل سے دلچسپی رکھتے ہوں، اس کا مطالعہ فرمائیں۔ ان معانی کی رُو سے، وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی (ارشاد خداوندی ہے کہ) ہم نے تمہیں اختیار دے رکھا ہے کہ تم جو فیصلہ چاہو کر لو۔ لیکن تمہیں چاہیئے کہ تم اپنے اختیار و ارادہ اور اپنے فیصلہ کو ہمارے قوانینِ مشیّت سے ہم آہنگ رکھو۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم ہمارے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ سو تم بھی ایسا ہی چاہو۔ ہم تمہیں مجبور نہیں کرتے، لیکن اتنا ضرور کہتے ہیں کہ تم بطیبِ خاطر، اپنے اختیار و ارادہ سے، وہی راہ اختیار کرو جو ہمارے قوانینِ مشیّت کے مطابق ہو ــــ "تم وہی چاہو جو ہم چاہتے ہیں۔" ہم کیا چاہتے ہیں، اسے تم جانتے ہو۔ اگر نہیں جانتے، یا بھول گئے ہو تو سن لو کہ لَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم کفر کی راہ اختیار کرو وَ اِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۔ اگر تم ایمان کی راہ اختیار کرو گے تو وہ ہماری منشاء کے مطابق ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لو کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ تم کفر کی راہ اختیار نہ کرو، تو اس سے ہمیں کوئی اپنا فائدہ مقصود و مطلوب نہیں۔ اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۔ اگر تم کفر کی راہ اختیار کرو گے، تو کچھ اپنا ہی بگاڑو گے۔ ہم تو اس سے بے نیاز ہیں کہ تم کفر کی راہ اختیار کرتے ہو یا ایمان کی۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ؕ (۳۹/۷)۔ ہمارا قانونِ مکافات یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ ہر ایک اپنے اپنے اعمال کا، ذمہ دار ہے اور ان کے نتائج ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے سامنے آجائیں گے۔ یہ اس خدا کا قانون ہے جو تمہارے ظاہرا اعمال تو ایک طرف، تمہارے دلوں کے پوشیدہ رازوں تک کا بھی علم رکھتا ہے۔ اس لئے تمہاری خواہشات اور ارادے بھی اس کے قانونِ مکافات کی رُو سے نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ وہی آیات جن کے معانی یہ کئے جاتے ہیں کہ "تمہارا چاہنا بھی تمہارے اختیار میں نہیں"، کس طرح انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ قرار دیکر، اسے اس کے تمام اعمال اور ارادوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

یعنی اگر تم قرآن کے مطابق چلو تو یہ تمہیں ایسا بنا دے گا جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔ یہ ہے مفہوم وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ کا۔ تمہیں اس کا اختیار ہے کہ تم اپنے لئے جو فیصلہ چاہو کرو لیکن، جب تمہیں اس کا اختیار ہے تو تم وہی کیوں نہ چاہو جو ہمارے قانونِ مشیت کا منشا ہے۔ تم اپنے اختیار کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ کیوں نہ کر لو۔ اس سے تم خوشگواریوں کی زندگی بسر کرو گے۔ اقبال کس خوبصورتی سے اس حقیقت کو بیان کرتا ہے، جب کہتا ہے کہ

تری دعا ہے کہ ہو تری آرزو پوری
مری دعا ہے، تری آرزو بدل جائے

اور آرزو کے بدل جانے سے، انسان کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ

تم اپنی آرزو کو اس طرح بدلو کہ وہ ہمارے قانونِ مشیت سے
ہم آہنگ ہو جائے۔

ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ مومن سب سے بلند اور سب پر غالب ہوتے ہیں۔ تم مومن بن جانے کی آرزو کرو تاکہ تمہیں وہ مقام حاصل ہو جائے۔

۴۔ مَنْ یَّشَآءُ

عقیدۂ جبر کی سند اور تائید میں جو آیات شد و مد سے پیش کی جاتی ہیں، وہ، وہ ہیں جن میں مَنْ یَّشَآءُ کے الفاظ آتے ہیں اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے "جسے چاہے"۔ مثلاً یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ (۱۶/۹۳)۔ "وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔" یا فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (۲/۲۸۴)۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے، جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے یا یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ (۱۷/۳۰)۔ وہ جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے۔ جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وغیرہ۔

اگر اس قسم کی آیات کے یہی معنی لئے جائیں جو ان کے عام ترجموں کی رُو سے متعین ہوتے ہیں، تو

ہیں، انہی مضامین سے متعلق، قرآنِ کریم کی بے شمار دیگر آیات کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً ہدایت و ضلالت کے متعلق ہے۔ وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَّمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ عذاب و مغفرت کے متعلق بیشمار مقامات میں کہا گیا ہے کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ٥۔ یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔ رزق کی بسط و کشاد وغیرہ کے سلسلہ میں اصول یہ بیان کیا گیا ہے کہ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹)۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اگر مَن يَشَآءُ سے متعلق آیات کے معنی یہ لئے جائیں کہ "وہ جسے چاہتا ہے" دیدیتا ہے۔ اس کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں، تو قرآنِ کریم کی مختلف آیات ایک دوسرے سے متضاد ہو جائیں گی۔ اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) قرآنِ کریم نے اپنے مِن جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہذا، مذکورہ صدر آیات، باہم گر متضاد نہیں ہو سکتیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

دو معنی عربی زبان کے قاعدے کی رُو سے، مَن يَشَآءُ کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ "جسے اللہ چاہے"۔ اور دوسرے یہ کہ "جو شخص ایسا چاہے"۔ مثلاً يُضِلُّ مَن يَشَآءُ وَيَهْدِي مَن يَشَآءُ کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے وہ گمراہ رہتا ہے۔ اسی طرح رزق سے متعلق آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اللہ جسے چاہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ اسے رزق کشادہ ملے، اسے کشادہ مل سکتا ہے۔ جو اپنے لئے رزق کی تنگی چاہے، اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں معانی میں، ترجیح کن معانی کو دی جائے گی۔ سو اس کا جواب آسان ہے۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہوگا جو قرآنِ کریم کی دیگر آیات اور اس کی کلی تعلیم کے مطابق ہو۔ قرآنِ کریم کی کلی تعلیم کا محور، قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ یعنی انسان کو

اس کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہذا، ان آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہوگا جس میں مَنْ یَّشَآءُ کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سورۃ النحل کی وہ آیت جس کا ایک حصّہ

سورۂ نحل کی اہم آیت

ہم نے (ایک باب میں) پہلے بھی درج کیا ہے، بڑی غور طلب ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۹۳) اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا ـــ اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی ڈگر پر چلنے والی نوع بنا دیتا۔ لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے تاکہ وہ تم سے پوچھے کہ تم نے کس قسم کے کام کیے تھے۔

آپ دیکھئے کہ اس ترجمہ سے کیسی عجیب و غریب صورت سامنے آتی ہے۔ یعنی قرآنِ کریم پہلے یہ کہتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت تمہارے اپنے اختیار کی بات نہیں۔ خدا جسے چاہے ہدایت دیدے، جسے چاہے گمراہ کر دے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جب ہدایت و ضلالت انسان کے اپنے بس کی بات نہیں، اس باب میں انسان مجبور ہے، اللہ جسے چاہے ہدایت دیدے، جسے چاہے گمراہ کردے، تو پھر لوگوں سے ان کے اعمال کی باز پُرس کیسے ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ اور مفہوم صحیح نہیں۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ اگر خدا چاہتا کہ سب انسان، ایک ہی راستے پر چلیں، تو وہ انھیں (حیوانات کی طرح) مجبور پیدا کر دیتا لیکن اس کی مشیئت ایسی نہیں تھی۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کا قانون یہ ہے کہ جس کا جی چاہے (مَنْ يَّشَآءُ) صحیح راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے اور انسان کا یہی صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اس لئے، اسے اختیار سونپنے کے بعد، ہم اس سے پوچھیں گے کہ اس نے اپنے اختیار کو استعمال کس طریق سے کیا تھا!

لہذا، اس قسم کی آیات کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہ ہوگا کہ انسان کے سامنے دونوں قسم کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ وہ، ان میں سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے۔ جس قسم کا راستہ وہ اختیار کرے گا، اُسی قسم کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔

بعض آیات میں مَنْ یَّشَآءُ کے بجائے مَنْ نَّشَآءُ (جسے ہم چاہیں) یا مَنْ اَشَآءُ (جسے میں چاہوں) کے الفاظ آتے ہیں۔ لہذا، ان آیات میں تو فاعل بہرحال اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہم اس باب کے شروع میں جو کچھ آئے ہیں اس سے واضح ہے کہ "خدا کے چاہنے" سے مراد ہے "خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق"۔ اس سے، اس قسم کی آیات کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۶/۸۴)۔ ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق درجات بلند کرتے ہیں اور اس کا قانونِ مشیّت یہ ہے کہ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۱۹/۴۶)۔ ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں"۔ یہی صورت ان قوانینِ مشیت کی ہے جن کا تعلق خارجی کائنات یا انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ مثلاً سورۂ روم میں ہے کہ خدا ہواؤں کو چلاتا ہے تو وہ سمندر سے بخارات اوپر کو لے جاتی ہیں۔ فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ..... (۳۰/۴۸)۔ پھر وہ انہیں اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق فضا میں پھیلا دیتا ہے۔ اسی قسم کے طبیعی قوانینِ مشیت انسانوں کے ہاں بچوں کی پیدائش (اولاد) کے سلسلہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ (۴۹-۴۲/۵۰)۔

جسے خدا چاہے

چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) ہم ہدایت و ضلالت، عزت و ذلت، رزق وغیرہ سے متعلق تفصیلی گفتگو، الگ الگ ابواب میں کر رہے ہیں، اس لئے اس مقام پر انہی اصولی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مَنْ یَّشَآءُ۔ مَنْ نَّشَآءُ، وغیرہ سے متعلق مزید آیات اپنے اپنے مقام پر آئیں گی۔

۵۔ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ——— ۶۔ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ——— وہ جو ارادہ کرتا ہے اسکے مطابق فیصلہ کرتا ہے

آپ دوسرے باب پر نگہ بازگشت ڈالئے۔ اس میں بتایا گیا (اور اسے بعد میں بھی دہرایا گیا ہے) کہ خدا کے تخلیقی مراحل کے دو بڑے پروگرام ہیں۔ مرحلۂ اول، عالمِ امر کا ہے جس میں "خدا، اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا اور ان کے حفظ و بقاء، نشوو ارتقا اور محو و ثبات کے لئے قوانین مقرر

کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس کی قدرتِ مطلقہ اس طرح کارفرما ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے لئے نہ پہلے سے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر ہوتا ہے، نہ کوئی حدود و قیود عائد۔ یہاں یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ (۴۲/۴۹)۔ کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہی ہے کہ وہ، جو جی میں آئے پیدا کرتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ ۝ (۲۲/۱۴)۔ جو کچھ اس کے ارادے میں ہوتا ہے، وہ ویسے ہی کرتا ہے۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ ھُمْ یُسْئَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۳)۔ اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ اس نے فلاں چیز کو ایسا کیوں بنایا ہے۔ یا جو قوانین وہ وضع کرتا اور جو احکام نافذ کرتا ہے، وہ ویسے کیوں ہیں۔ (۵/۱ و ۲/۲۵۳)۔

تخلیق میں اضافے

خدا کے تخلیقی پروگرام کا یہ مرحلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے اپنی تخلیقات کے لئے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں وہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا، لیکن وہ اب سلسلۂ تخلیق کی طرف سے فارغ نہیں ہو بیٹھا۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱)۔ وہ اپنی تخلیقات میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو نئی مخلوق ظہور میں آتی ہے اس کے لئے نئے قوانین بھی وضع کرتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؔ نے اپنے انداز میں، ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

اور غالبؔ نے اپنے مخصوص اسلوب میں یوں، کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہماری معلوم کائنات تو اس کے سلسلۂ تخلیق میں، ایسی ہی ہے، جیسے صحرا میں ذرہ، یا سمندر میں قطرہ۔ ہمیں نہ تو اس کی موجودہ جملہ مخلوق کا یقینی طور پر علم ہے اور نہ ہی اس کے لامتناہی سلسلۂ تخلیقِ مزید کا کوئی اندازہ۔

اس کے تخلیقی پروگرام کا دوسرا مرحلہ وہ ہے جس میں ہر کام اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے، جن میں وہ کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس مرحلہ میں، یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ کے معنی

ہوں گے ـــ وہ ہر بات اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق کرتا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں قرآنِ کریم میں موجود ہیں. مثلاً

قانونِ مشیّت کے مطابق

(۱) سورۃ الرّعد میں ہے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَمْحُوْ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۳۸- ۳۹/ ۱۳)- ہر عمل کے نتیجہ کے لئے ایک میعاد ہوتی ہے اور یہ میعاد خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق متعیّن ہوتی ہے. اس کے مطابق اقوام یا اشیاء کا محو و ثبات (باقی رہنا یا مٹ جانا) ہوتا ہے. اور یہ سب کچھ اس کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے. آپ نے دیکھا کہ یہاں پہلے یہ کہا ہے کہ ہر بات کے لئے ایک قانون (کتاب) مقرر ہے اور اس کے بعد مَا يَشَآءُ کہا. ظاہر ہے کہ یہاں مَا يَشَآءُ کے معنی " خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق" ہی ہو سکتے ہیں۔

(۲) محو و ثبات کے اس اصول کے متعلق سورۃ ابراہیم میں ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِى الْاٰخِرَةِ ۚ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ قف خدا نے ایک محکم قانونِ حیات، نظریہ زندگی، مقرر کر رکھا ہے. اُسی کے مطابق دنیا اور آخرت میں، جماعتِ مومنین کو قیام و ثبات نصیب ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ظالمین تباہ ہوتے ہیں. اس کے بعد کہا وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۱۴/۲۷)۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ قانونِ مشیّت کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ایسا محکم قانون اور اصول بنانے کے بعد بھی " وہ جس طرح جی میں آئے" کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، جسے چاہتا ہے یونہی تباہ کر دیتا ہے!

(۳) سورۃ بنی اسرائیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ طبیعی دنیا کے مفادات، اپنی اپنی کوشش کے مطابق

طبیعی قوانین میں مومن و کافر کی بھی تمیز نہیں

حاصل ہو سکتے ہیں. اس میں مومن اور کافر کی بھی کوئی تمیز نہیں. جو جیسی کوشش کرتا ہے اس کے مطابق اسے پھل مل جاتا ہے۔ جو صرف دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں۔ جو دنیاوی مفاد کے ساتھ اُخروی خوشگواریاں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے دونوں مل سکتی ہیں۔ سعی و عمل کے اس میدان میں کسی کے آگے روک نہیں

گھڑی کی جاتی کہ دوسرے تو آگے جاسکتے ہیں تم نہیں جاسکتے۔ کُلًّا نُّمِدُّ ھٰٓؤُلَآءِ وَ ھٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّکَ ؕ وَمَا کَانَ عَطَآءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا ۰ ہمارے قوانینِ طبعی کے مطابق کافر کوشش کرتے ہیں تو ہم انہیں بھی آگے بڑھاتے جاتے ہیں، مومن ایسا کرتے ہیں تو انہیں بھی ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے جاتے ہیں. ہم کسی کے راستے میں بند نہیں لگادیتے ۔ یہ کچھ کہنے کے ساتھ کہا ہے مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ (۱۸، ۲۰ /۱۷). ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ "ہم جیسا چاہتے ہیں اور جس کے لئے جو ارادہ کرتے ہیں آسے وہی مل سکتا ہے" اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے جنہیں ہم نے اپنی مشیت اور ارادے کے مطابق متعین کر رکھا ہے۔ اس کا "ارادہ" یہی تھا کہ دنیاوی مفادات کے سلسلہ میں تو کافر و مومن میں کوئی فرق نہ ہو. لیکن آخرت میں کفار کا کوئی حصہ نہ ہو ۔ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَلَّا یَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَۃِ ج (۳/۱۷۵) - یہاں ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتی ہے، ظلم اور دھاندلی سے نہیں ہوتی۔ وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳/۱۰۷) - "خدا نے اقوام عالم کے لئے ظلم کا ارادہ ہی نہیں کیا" یہاں اگر کسی کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس کی اپنی ہی غلط روش کی وجہ سے ہوتی ہے. اس باب میں خدا کا ارادہ (قانونِ مشیت) یہی ہے (۵/۴۹). خارجی کائنات میں خدا کا یہ ارادہ، قوانینِ طبیعی کی شکل میں کارفرما ہے اور انسانی زندگی کے لئے یہ قوانین وحی کے ذریعے عطا کر دیئے گئے ہیں۔ وَکَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ لا وَّاَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ۰ (۲۲/۱۶)۔ "اس طرح ہم نے یہ واضح قوانین نازل کر دیئے۔ اب سیدھا راستہ انہی کے مطابق مل سکتا ہے۔"

(۴) قرآنِ کریم میں داستانِ بنی اسرائیل بڑی شرح و بسط سے بیان ہوئی ہے، اس لئے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ابدی قوانین عملی شکل میں نکھر کر سامنے آجاتے ہیں. اس ضمن میں، سورۂ قصص میں ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہو گئی اور خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے 'مہلت کا وقفہ ختم ہونے کے بعد' اس کی تباہی کا وقت آپہنچا' تو صاحبِ ضربِ کلیمؑ حضرت موسٰیؑ مقابلہ کے لئے اُٹھے۔ انہوں نے، بنی اسرائیل کی مناسب تعلیم و تربیت کی' اور

انہیں فرعون کی غلامی سے نجات دلا کر سینا کی آزاد فضاؤں کی طرف لے گئے تاکہ وہاں انہیں جہانبانی کے لئے تیار کیا جائے. داستان کی اس کڑی کا آغاز قرآنِ کریم نے اس طرح کیا ہے کہ جب فرعون کے مظالم کی انتہا ہوگئی۔ وَ نُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ.... (۲۸/۵)۔ تو ہم نے "ارادہ کیا" کہ جس قوم کو اس نے کچل کر رکھ دیا تھا، اسے نوازا جائے، فرعون اور ہامان کو تباہ کیا جائے اور بنی اسرائیل کو ان کا جانشین بنایا جائے۔

خدا نے اس کا "ارادہ کیا" لیکن اس کا یہ ارادہ اُس طرح عمل میں نہیں آگیا جس طرح عالمِ امر میں آیا کرتا ہے کہ "جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے کہ ہوجا، اور وہ ہوجاتی ہے۔"

خدا کا ارادہ کس طرح بروئے کار آتا ہے

اس ارادے کو عملی شکل میں لانے کے لئے، اس نے بنی اسرائیل کو ایک تفصیلی پروگرام دیا اور کہہ دیا کہ اگر وہ اس کے مطابق چلتے رہے تو انہیں تمکّن حاصل ہوجائے گا. لیکن اس قوم نے خدائی راہ نمائی کا پورا پورا اتباع نہ کیا. وہ اس میں کٹ حجّتیاں کرنے لگے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی خطۂ زمین جس کے متعلق کہا گیا تھا۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ (۵/۲۱)۔ "خدا نے اسے ان کے نام لکھ دیا تھا" اس کے متعلق کہہ دیا کہ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً (۵/۲۶) وہ چالیس سال تک ان پر حرام قرار دے دی گئی. اس دوران میں اس قوم کی پرانی نسل ختم ہوگئی اور نئی پود، جس کی تربیت ان آزاد فضاؤں میں ہوئی تھی، اُبھری اور اس نے ایک ہی جھپٹے میں اس زمین پر قبضہ کر لیا. آپ نے غور فرمایا کہ عالمِ خلق میں خدا کے ارادے کس طرح، قوانینِ خداوندی کے مطابق پورے ہوتے ہیں؟ یہاں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ "وہ سرزمین جو ان کے لئے لکھ دی گئی تھی" تو اس سے مراد کیا ہے؟ "لکھ دی گئی" کے یہ معنی نہیں کہ وہ آرام سے بیٹھے رہیں، اس کا قبضہ انھیں خود بخود مل جائے گا. جیسا کہ ایک باب میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے، عربی زبان اور قرآنِ کریم میں "کتاب" کے معنی قانون کے ہیں، اس لئے کَتَبَ کے معنی ہوں گے قانون کے مطابق بنی اسرائیل سے کہا یہ گیا تھا کہ اگر انھوں نے قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا تو انہیں یہ سرزمین مل جائے گی۔ اُن کی اُس وقت کی موجودہ نسل نے ان قوانین کا اتباع نہ کیا تو وہ اس سرزمین سے محروم رہ گئی. ان کے بعد، دوسری نسل نے ان کا اتباع کیا تو وہ اس پر قابض ہوگئے۔ (تفصیل ان امور کی کسی آئندہ باب

ہیں ملے گی)۔

(۵) سورۂ حج میں ہے وَ مَنۡ یُّہِنِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ (۲۲/۱۸)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ "جسے اللہ ذلیل کردے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

عزت اور ذلت سے متعلق قانون

اس ترجمہ کی رُو سے ظاہر ہوتا ہے کہ عزت اور ذلت کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ خدا جسے چاہتا ہے عزت دے دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے ــــ لیکن یہ تصور صحیح نہیں۔ خدا نے عزت اور ذلت کے لئے قوانین اور اصول مقرر کر رکھے ہیں۔ (اس نقطہ کے متعلق تفصیلی بحث تو آئندہ چل کر سامنے آئے گی۔ اس مقام پر صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔ سورۂ الفجر میں ہے کہ جب کوئی شخص (یا قوم) ذلیل ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ رَبِّیۡۤ اَہَانَنِ ۔ دیکھو! مجھے خدا نے یوں ہی ذلیل کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یاد رکھو! خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ اس کی وجوہات ہوتی ہیں۔ تم اس لئے ذلیل ہوئے ہو کہ کَلَّا بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ .... (۸۹/۱۷-۱۶)۔ تم اس شخص کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرہ میں بے سہارہ جاتا تھا۔ تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس میں انسان کی عزت، انسان ہونے کی جہت سے نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے لئے تم نے اور ہی معیار وضع کر رکھے تھے۔ تم جو ذلیل ہوئے ہو تو اس کی یہ وجہ ہے۔ خدا یوں ہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتا۔

آپ نے دیکھا کہ سورۂ حج کی مذکورہ بالا آیت (۲۲/۱۸) میں، مَا یَشَآءُ کا مفہوم کیا ہے، یعنی "خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق"۔

(۶) اسی سورۂ (حج) میں ہے کہ وَ نُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۲۲/۵)۔ ہم جنین کو ایک مدت تک کے لئے رحمِ مادر میں رکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کی پیدائش ہوتی ہے۔ یہ مدت مَا نَشَآءُ کے مطابق ہوتی ہے۔

جنین کی حالت

ظاہر ہے کہ یہاں بھی مَا نَشَآءُ کے یہ معنی نہیں کہ ہم ہر جنین کے متعلق یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اسے اتنی مدت تک رحمِ مادر میں رہنا چاہیئے اور اُسے اتنی مدت کے لئے۔ حمل کا زمانہ، خدا کے قانونِ طبیعی کے مطابق متعین ہے۔ اگر کسی کیس میں، اس مدت میں کمی بیشی ہوتی

ہے تو وہ بھی طبیعی قانون کے مطابق ہوتی ہے اور میڈیکل سائنس کی رُو سے اس کے متعلق بتایا جاسکتا ہے۔

اولاد کی پیدائش کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور وہ ہے حضرت زکریّا کے ہاں (حضرت) یحییٰؑ کی پیدائش۔ حضرت زکریّا بوڑھے ہو رہے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھی۔

حضرت زکریّاؑ کے ہاں اولاد

اس لئے انہیں اولاد کی امید باقی نہیں رہی تھی۔ انہیں جب ایک لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا گیا تو انہوں نے تعجب سے کہا کہ ان حالات میں، میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (۳/۳۹)۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ "جس طرح خدا چاہتا ہے کر دیتا ہے"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ خدا نے خود ہی دوسری جگہ بتا دیا ہے کہ ان کے ہاں بچہ عام قانونِ طبیعی (قانونِ مشیّت) کے مطابق پیدا ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰)۔ حضرت زکریّا میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی لیکن ان کی بیوی میں کوئی نقص تھا۔ وہ نقص دُور ہو گیا اور اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نمودار ہو گئی۔ لہٰذا، اس بچے کی پیدائش عام قانونِ طبیعی کے مطابق ہوئی۔ اس قسم کے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں کہ عورت ایک مدّت تک عقیم (بانجھ) رہی اور مناسب علاج سے آخری عمر میں ان کے ہاں اولاد پیدا ہو گئی۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ جہاں تک عالمِ امر کا تعلق ہے يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کے معنی یہی ہیں کہ وہاں سب کچھ خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ لیکن یہی الفاظ جب عالمِ خلق سے متعلق ہوں، تو ان کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ایسا کچھ خدا کے قانونِ مشیّت کی رُو سے ہوتا ہے جس کا علم انسان کو دے دیا گیا ہے ــــ علومِ فطرت کی رُو سے یا وحی کے ذریعے ــــ اس سلسلہ میں ایک ایسی اہم بات سامنے آتی ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔

لہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں تفصیلی بحث میری کتاب "شعلۂ مستور" میں ملے گی۔

عالمِ امر میں خدا کے فیصلوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ ۝ (۲۱/۲۳)۔ خدا سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔ یعنی وہاں خدا کسی قانون کا پابند نہیں ہے۔

لیکن عالمِ خلق کے سلسلہ میں خدا نے کچھ اور کہا ہے۔ قرآنِ کریم میں بہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ اگر تم اس قسم کے کام کرو گے تو ان کے نتیجے میں تمہیں جنت مل جائے گی۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ (اس کو حتمی اور یقینی قانون کہا جاتا ہے)۔ سورۂ فرقان میں ہے کہ یہ خدا کا وعدہ ہے کہ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ خٰلِدِیْنَ۔ اہلِ جنت، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور اس میں انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے۔ اس کے بعد ہے۔ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا (۲۵/۱۶)۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور وعدہ ایسا ہے کہ (بفرضِ محال) اگر یہ پورا نہ ہو تو اس سے پوچھا جا سکے گا کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟

خدا سے بھی پوچھا جا سکے گا کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟

اللہ اکبر! وہی خدا جس نے (عالمِ امر کے سلسلہ میں) کہا تھا کہ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ۔ خدا سے پوچھا نہیں جا سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے، اب یہ کہتا ہے کہ اگر میرا کوئی وعدہ پورا نہ ہو، تو تم مجھ سے بھی پوچھ سکتے ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا۔ اور میں تمہیں اس کا جواب دوں گا۔ تمہیں بتاؤں گا کہ یہ وعدہ (قانون) فلاں فلاں شرائط کے ساتھ مشروط تھا۔ تم نے چونکہ وہ شرائط پوری نہیں کیں اس لئے ہمارا وعدہ پورا نہیں ہوا ـــــ قانون اسی کو کہتے ہیں نا، کہ اگر یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا! ایک مستبد، ڈکٹیٹر اور ایسے حاکم میں جس کی مملکت میں قانون کی عملداری ہو، یہی فرق ہوتا ہے۔ ـــــ "ڈکٹیٹر" جو اس کے جی میں آئے، "کرتا ہے اور اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ قانون کی عملداری میں ہر بات کا فیصلہ قانون کے مطابق ہوتا ہے اور ہر فیصلہ کے متعلق پوچھا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ خدا کی مملکت میں ایک مستبد ڈکٹیٹر کی حکومت نہیں، قانون کی حکمرانی ہے اور قانون بھی ایسا کہ جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ذرا سوچئے کہ خدا کے متعلق، کسی مذہب میں بھی ایسا تصور ملتا ہے؟ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا، تو ان کے ہاں بھی خدا کا تصور ایک مطلق العنان، ڈکٹیٹر کا سا پیدا ہو گیا کہ جس

ہمارے دورِ ملوکیت کا تراشا ہوا خدا کا تصوّر

کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے اور اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک اُمّت میں قانون کی حکمرانی رہی (اسے خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے) اس وقت تک خدا کے متعلق قرآنی تصوّر قائم رہا۔ لیکن جب، اس کے بعد، خلافت، بادشاہت میں تبدیل ہوگئی تو خدا کے متعلق بھی تصوّر بدل گیا۔ ہمارے ہاں کہنے کو تو یوں کہا جاتا ہے کہ السلطان ظل اللہ علی الارض، بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت ہم نے خدا کو زمین کے بادشاہوں کے قالب میں ڈھال رکھا ہے — یعنی ایک مستبد آمرِ مطلق، جو نہ کسی قاعدے کا پابند ہے نہ قانون کا۔ جو اس کے جی میں آئے کرے، اس کے حضور کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔ جسے چاہے عزّت دے جسے چاہے ذلیل کردے، جسے چاہے جاگیریں بخش دے، جس سے چاہے سب کچھ چھین لے۔ اس کا مزاج (سعدی کے الفاظ میں) "مزاج شاہاں" کے مطابق ہے کہ گاہے بہ سلامے بر نجند و گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند۔ اگر موڈ خراب ہوا تو سلام کے جواب میں تھپّڑ رسید کردیا۔ موڈ اچھا ہوا تو گالی دینے والے کو جاگیر بخشدی۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ قرآن کا خدا انسانوں کے ان خودساختہ تصوّرات سے بہت بلند ہے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اُمّت میں جب تک قانون کی حکمرانی رہی، خدا کا تصوّر بھی ایک، قانونی حکمران، کا سا رہا — جب ان میں شاہنشاہیت آگئی تو اس کا تصوّر ایک آمرِ مطلق کا سا ہوگیا۔ — لیکن، ہم سمجھتے ہیں کہ، بالفاظِ صحیح کہنا یوں چاہیئے کہ اُمّت میں جب تک خدا کا تصوّر یہ رہا

خدا کا تصوّر بدل جانے سے اجتماعی نظام بدل گیا

کہ اس کا ہر فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے، ہمارے نظام کی بنیاد قانون کی حکمرانی پر رہی۔ جب عقیدہ جبر کی رُو سے، خدا کا تصوّر ایک آمرِ مطلق کا سا ہوگیا، ہمارا نظامِ حکومت (قیصر و کسریٰ کی طرح) خودمختار شاہنشاہیت میں بدل گیا۔ اور چونکہ یہ نظام شاہنشاہوں کو خوب راس آتا تھا، اس لئے ہمارے سلاطین نے عقیدہ جبر کی خوب خوب پشت پناہی کی حتیٰ کہ اُسے مسلمانوں کے ایمان

کا جزو بنا دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کا تصور بدلنے سے، کس طرح نظامِ معاشرہ بدل جاتا ہے۔ یہ ہے انسانی زندگی میں ایمان کی اہمیت۔ غالباً کامتے (COMTE) نے کہا ہے کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ کسی قوم کے ہاں خدا کا تصور کس قسم کا ہے، اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن، اور سیاست و معاشرت کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔

قرآن، خدا کے متعلق صحیح تصور دیتا ہی اس لئے ہے کہ انسانی معاشرہ، اس تصور کا عکس ہوتا ہے۔ قرآنی تصور کے مطابق خدا پر ایمان رکھنے والی قوم میں شاہنشاہیت اور ڈکٹیٹرشپ کبھی بار نہیں پا سکتی۔ اس میں ہمیشہ قانون کی حکمرانی کارفرما ہوگی۔ جس نظام کی بنیاد اس ابدی اور غیر متبدل اصول پر ہو کہ هُمْ يُسْئَلُوْنَ ــــ ہر انسان سے باز پرس کی جا سکتی، ہر ایک سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کہا اور ویسا کیوں کیا ہے ــــ کیا اس میں ڈکٹیٹرشپ (ملوکیت) کی ذرا سی بھی گنجائش ہو سکتی ہے! "هُمْ يُسْئَلُوْنَ" میں چھوٹے بڑے سب آ جاتے ہیں۔ اس میں کسی کی بھی استثناء نہیں۔

اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نظامِ مملکت میں اقتدارِ اعلےٰ (SOVEREIGNTY) کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے معنی ہوتے ہیں وہ اتھارٹی جسے آخری اختیار حاصل ہو، جس کے فیصلے کی کہیں اپیل نہ ہو، جس سے پوچھا نہ جا سکے کہ اس نے ایسا فیصلہ کیوں دیا ہے۔ اسلامی نظام میں یہ حیثیت صرف خدا (کی کتاب) کو حاصل ہے۔ لَا يُسْئَلُ صرف اس کے لئے ہے، کسی اور کے لئے نہیں۔ اس ایک اصول کے مطابق، ملوکیت، آمریت، مذہبی پیشوائیت اور روحانی آقائیت، سب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ یہی لَا اِلٰہ کا عملی مفہوم ہے۔

اور اب آپ نے اس کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ایک عقیدۂ تقدیر کے بدل دینے سے، امت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا!

"کتنی گہری تھی یہ سازش ــــ اور کیسے تباہ کُن تھے اس کے نتائج"!!

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

یہ الفاظ قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں آئے ہیں۔ ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے ــــ بیشک اللہ تمام چیزوں پر قادر ہے ــــ اور اس کے قادر ہونے سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اس کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے۔

آپ دوسرے باب کو ایک بار دیکھئے، جس میں، قدر، تقدیر، قادر، قدیر، وغیرہ الفاظ کے معانی بیان کئے گئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ قدیر کے معنی ہیں، پیمانے مقرر کرنے والا۔ لہٰذا، اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے ہر چیز کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق وہ سرگرمِ عمل رہتی ہیں۔ یہی وہ خدا کا کنٹرول ہے جس کے باہر کائنات کی کوئی شے جا نہیں سکتی۔ وَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ (۴۵/۱۳)۔ اس نے ارض و سما کی ہر چیز کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ خدا کا یہ اقتدار ساری کائنات کو محیط ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، وہ اپنے ارادہ اور انتخاب میں صاحبِ اختیار ہے لیکن اس کے ہر ارادہ اور ہر عمل کا نتیجہ بھی خدا ہی کے مقرر کردہ پیمانوں (قوانین) کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے سلسلہ میں خدا کے قدیر ہونے سے یہی مراد ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ عَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶)۔ انسان جو اچھے کام کرتا ہے ان کا فائدہ بھی اسی کو ہوتا ہے اور جو برے کام کرتا ہے، اس کا نقصان بھی وہی اٹھاتا ہے اور اس سے دو ہی آیات پہلے ہے۔ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۲/۲۸۴)۔ جو شخص چاہے خدا سے سامانِ حفاظت لے لے، جو چاہے تباہی خرید لے۔ بیشک خدا نے ہر بات کے لئے پیمانے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ "ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے چھپاؤ یا ظاہر

کرو، اللہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اسے ارض و سما کی ہر چیز کا علم ہوتا ہے۔ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ظہورِ نتائج کے وقت ہر شخص کے صحیح اور غلط اعمال کے نتائج اس کے سامنے آجائیں گے۔ (۲۸-۲۹/۳)
نیز (۵/۴۰؛ ۱۱۹- ۵/۱۲۰)۔ خدا کا یہی قانون ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ "جو لوگ اپنی غلط روش پر اتراتے رہتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ جو کام وہ سرانجام نہیں دیتے ان کی وجہ سے ان کی تعریف کی جائے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ خدا کی گرفت سے چھوٹ نہیں سکتے۔ کائنات کی وسیع و عریض مملکت خدا ہی کی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ اور اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، جن کے مطابق نتائج مرتّب ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کس طرح اس کے قانونِ مکافات کے احاطہ سے باہر جا سکتا ہے؟ (۱۸۷- ۳/۱۸۸)۔

اسی سورۃ میں، دوسرے مقام پر، یہ بات اور بھی واضح ہوگئی ہے۔ جماعتِ مومنین کو ایک جنگ (احد) میں کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قُلۡتُمۡ اَنّٰی ھٰذَا تم پوچھنے لگے کہ ہمیں یہ نقصان کیوں ہوا ہے۔ قُلۡ ھُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِکُمۡ۔ اے رسول اللہ ان سے کہہ دو کہ یہ تمہاری اپنی غلطی سے ہوا ہے۔ .. .. اس کے ذمہ وار تم خود ہو اور اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (۳/۱۶۴)۔ خدا نے ہر معاملہ کے متعلق قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ جو ان کے مطابق چلتا ہے، کامیاب ہوتا ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے، نقصان اٹھاتا ہے۔

سورۂ توبہ میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ "اگر تم جہاد کے لئے باہر نہیں نکلو گے تو تم سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے اور خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا"۔ اس کے بعد ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝ (۹/۳۹)۔ قوموں کے عروج و زوال کا فیصلہ اُسی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی نکتہ کی وضاحت کے لئے دوسری جگہ کہا کہ یہ لوگ جو نظامِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں، ان سے کہو کہ تم مختلف مقامات میں آتے جاتے ہو اور وہاں اقوامِ سابقہ کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات

کو دیکھتے ہو۔ وہ قومیں تم سے بھی زیادہ طاقت ور تھیں۔ تو کیا تم اس سے بھی یہ بات نہیں سمجھتے کہ جب وہ قومیں اپنی روش کے تباہ کن نتائج سے محفوظ نہ رہ سکیں تو تم کس طرح بچ جاؤ گے۔ اس کے بعد ہے
اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ٥ (۳۵/۴۴)۔

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر، قانونِ مکافاتِ عمل کو کھیتی کی مثال سے سمجھایا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کھیتی، خدا کے مقرر کردہ قوانینِ زراعت کے مطابق ہوتی ہے۔ بارش ہر قسم کی زمین پر برستی ہے، جو زمین فصل بونے کے لئے تیار کر لی گئی ہو، اس سے روئیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بنجر رہ گئی ہو، اس میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی اس کا قانون ہے کہ، گندم از گندم بروید جو ز جو ـــــ یہی موت اور حیات کا اصول ہے۔ سورۂ روم میں ہے

کھیتی کی مثال

فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔
تم خدا کی رحمت (بارش) کے اثرات پر غور کرو۔ وہ کس طرح زمینِ مُردہ کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔
اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى۔ اس طرح خدا، مردوں کو زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ہے
وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (۳۰/۵۰؛ ۱۸/۴۵؛ ۳۹/۴۱)۔ اس دنیا میں قوموں کی موت و حیات کے لئے بھی یہی اصول مقرر ہیں اور حیات بعد الممات کے متعلق بھی۔[1]

بنی اسرائیل، اپنی غلط روش کے تباہ کن نتائج کی وجہ سے اہلِ بابل کی غلامی کی ذلت آمیز زنجیروں میں جکڑے گئے، اور قریب سو سال کی محکومی کے بعد، انہیں دوبارہ آزادی نصیب ہوئی قرآنِ کریم نے، ان کی حیاتِ قومی کے اس حادثہ کو تمثیلی رنگ میں بیان کرنے کے بعد کہا کہ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ (۲/۲۵۹)۔ قوموں کی موت اور حیات کا فیصلہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل میں، مہلت کے وقفہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیج کے درخت بن کر پھل لانے (عمل کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آنے) میں ایک وقفہ ہوتا ہے اور (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے)۔ یہ وقفہ، مدت یا میعاد، خدا کے قانون کے مطابق مقرر ہے۔ قرآنِ کریم

---

[1] حیات بعد الممات کے لئے دیکھئے میری کتاب "جہانِ فردا"۔

میں اس نکتہ کو (ایک مقام پر) بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ حضورؐ نبی اکرم کے سامنے عالمِ انسانیت میں انقلاب برپا کرنے کا ایک عظیم پروگرام تھا۔ اس

حضورؐ کی آرزو

مقصد کے حصول کے لیے حضورؐ کی ساری عمر نہایت حوصلہ آزما جدوجہد میں بسر ہوئی جس میں مخالفتوں کے ہجوم کا مسلسل مقابلہ کرنا پڑا ___ عمر کے آخری مراحل میں حضورؐ کے دل میں اس قسم کی آرزو کا بیدار ہوجانا فطری امر تھا کہ ان کوششوں کا نتیجہ میری زندگی میں میرے سامنے آسکے گا، یا میری تمام عمر مشکلات کا مقابلہ کرنے ہی میں گذر جائے گی! اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَ اِنَّا عَلٰۤی اَنۡ نُّرِیَكَ مَا نَعِدُهُمۡ لَقٰدِرُوۡنَ ۝ (۲۳/۹۵)۔ ہم بے شک اس پر قادر ہیں کہ تمہارے مخالفین کو جس تباہی کی بابت متنبّہ کیا جاتا ہے، اس کا ظہور تمہارے سامنے ہی ہوجائے، لیکن عمل اور اس کے نتیجہ کے درمیان وقفہ کے متعلق ہمارا ایک قانون مقرر ہے جس میں کسی کی خاطر کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ فلہذا، عَلَیۡكَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (۱۳/۴۰)۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اس پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے جاؤ۔ تمہاری کوششوں کا نتیجہ کب برآمد ہوگا، اس کا "حساب کرنا" ہمارے ذمہ ہے۔

آپ سوچئے کہ جو خدا، اپنے رسولؐ کی خاطر بھی، اپنے مقرر کردہ "حساب" میں کمی بیشی نہیں کرتا، اس کے متعلق یہ تصور کس طرح صحیح ہوگا کہ وہ جب جی چاہے، اور جیسا جی میں آئے، کرتا رہتا ہے۔ یہ ساری کائنات "حساب" کے زور پر چل رہی ہے۔ اگر اس حساب میں ذراسی کمی بیشی ہوجائے تو سارا سلسلۂ کائنات ایک ثانیہ میں تہس نہس ہوجائے۔ انسان اگر زمین سے اڑ کر چاند پر جا پہنچتا ہے اور جن چیزوں کو وہاں بھیجتا ہے، ان کا کنٹرول زمین پر بیٹھے کرتا رہتا ہے، تو یہ حساب کی رُو سے ہوتا ہے۔

چاند پر جانے کا ذکر آیا، تو قرآنِ کریم کی ایک عظیم آیت سامنے آگئی۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے وَ مِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَثَّ فِیۡهِمَا مِنۡ دَآبَّةٍ۔ خدا کی آیات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور

فضائی کُرّوں میں آبادی

اجرامِ فلکی کو پیدا کیا اور اِن دونوں میں، ذی حیات مخلوق کو پھیلا دیا۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اجرامِ فلکی میں بھی بعض ایسے کُرّے ہیں جن میں،

"زندگی" موجود ہے۔ اس کے بعد ہے وَ هُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (۴۲/۲۹)۔ اس وقت تو ان مختلف کرّوں میں آبادیاں (جیسی شکل میں بھی وہ ہیں) الگ الگ ہیں لیکن جب خدا کے قانونِ مشیت کا تقاضا ہوگا تو یہ آبادیاں آپس میں مل جائیں گی۔ انسان نے آسمانی کرّوں سے رابطہ پیدا کرنے کی ابھی ابتدا کی ہے۔ کیا معلوم کہ اس کے بعد، یہ جن کرّوں سے رابطہ قائم کرے ان میں زندگی موجود ہو۔ یہ رابطہ کس طرح خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے، اس کے متعلق پوچھئے ان خلانوردوں سے، جو چاند پر ہو آئے ہیں! یا جن کا آج بھی چاند سے رابطہ قائم ہے۔

سورۂ حج کی پانچویں اور چھٹی آیت میں، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کا مفہوم، نہایت حسین انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ اسے ہم نے "مفہوم القرآن" میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> ان سے کہو کہ اگر تم مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں اس لئے شک و شبہات میں ہو کہ تمہیں ایسا ہونا بظاہر محال نظر آتا ہے، تو ذرا اس حقیقت پر غور کرو کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ (INORGANIC MATTER) سے کی۔ (اس میں پانی کے امتزاج سے زندگی کے اوّلین جرثومہ کی نمود ہوئی) پھر یہ کاروانِ حیات، مختلف منازل طے کرتا، اس منزل میں آپہنچا جہاں، افزائشِ نسل بذریعہ تولید (PROCREATION) ہوتی ہے۔ رحمِ مادر میں حمل قرار پاتا ہے۔ پھر وہ ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ان مراحل میں سے اس لئے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر امکانات مضمر طور پر موجود تھے، وہ بتدریج نشوونما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔
>
> وہ جنین، ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق، کچھ وقت کے لئے رحم کے اندر رہتا ہے۔ پھر تم ایک جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو۔ پھر رفتہ رفتہ، اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ (۱۶/۷۰)۔ تم میں سے بعض جوانی کے عالم ہی میں انتقال کر جاتے ہیں اور بعض بوڑھے ہو کر، عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس

میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد، پھر بے سمجھی کی طرف چلا جاتا ہے۔

یہ تو خود تمہارے اپنے تخلیقی مراحل کی مثال ہے۔ اس کے بعد تم اپنے سے باہر کی دنیا کی طرف دیکھو اور زمین کی حالت پر غور کرو۔ وہ کس طرح خشک اور ویران پڑی ہوتی ہے کہ اس میں زندگی اور نمو کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔ پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو وہ اچانک لہلہانے لگتی ہے اور اس کی روئیدگی روز بروز اُبھرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس زمینِ مُردہ سے خوشنما مناظر کی ایک دنیا ظہور میں آجاتی ہے۔

یہ سب اس لئے ہے کہ خدا کی ہستی بھی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اس کا قانون بھی ہمیشہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے۔ وہ بے جان اشیاء کو جاندار بناتا ہے اس لئے مردوں کو زندگی عطا کر دینا اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں۔

(مفہوم القرآن صفحہ ۷۵۱ ـ ۷۵۲)

اور اس کے بعد ہے وَ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۲/۶﴾۔ یعنی یہ سب کچھ خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔

تقدیراتِ الٰہی

یہ ہیں وہ تقدیراتِ الٰہی (خدا کے مقرر کردہ پیمانے) جن کے مطابق چلنے کے لئے خارجی کائنات کی اشیاء مجبور ہیں لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جی چاہے تو ان کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے تو ان سے سرکشی اختیار کر لے۔ اس کا تو اسے اختیار ہے لیکن اس کا اسے اختیار نہیں کہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھی اپنی مرضی کے مطابق برآمد کر لے۔ اس کے اعمال کے نتائج خدا ہی کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق مرتب ہوں گے۔ ان معانی میں خود انسان پر بھی خدا کے قانونِ مکافات کا کنٹرول ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآنِ کریم میں ہر جگہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ آیا ہے۔ یعنی ان آیات میں "اشیا" کہا گیا ہے۔ اِنسان نہیں کہا۔ اس سے یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ اشیائے کائنات تو خدا کے پیمانوں (قوانین) کے مطابق چلنے کے لئے مجبور ہیں،

لیکن انسان مجبور نہیں۔ انسان کو خدا "تقدیرات" کی زنجیروں میں جکڑتا نہیں۔ اُسے صرف حکم دیتا ہے کہ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ خدا کے اس حکم کو مانے یا اس سے سرتابی برتے۔ غالباً یہی وہ نکتہ ہے جسے ملحوظ رکھتے ہوئے اقبالؔ نے کہا ہے کہ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

گیارھواں باب

ہدایت وضلالت

آپ نے، جمعہ، عیدین اور نکاح کے خطبات، بلکہ ہر وعظ کے آغاز میں یہ الفاظ سنے ہونگے کہ

مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔

اور ان کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

جس شخص کو خدا ہدایت دے، اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ اور جسے خدا گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

آپ ان الفاظ کو اپنے ذہن میں رکھئے اور پھر حسبِ ذیل حقائق پر غور کیجئے۔

سلسلۂ رُشد و ہدایت

(۱) قصۂ ہبوطِ آدم میں ہے کہ اللہ تعالٰے نے نوعِ انسان کو مخاطب کرکے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایات آتی رہیں گی۔ جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں ہوگا۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ (۳۸۔ ۲/۳۹)۔ اور جو لوگ ہمارے قوانین سے انکار کریں گے اور انکی تکذیب کریں گے، وہ جہنم میں جائیں گے اور وہیں رہیں گے۔

(۲) خدا نے، اپنے اس وعدے مطابق، نوعِ انسان کی طرف انبیاء کرامؑ کے بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول بھیجے جو ان تک خدا کی ہدایت پہنچاتے تھے۔

(۳) وہ انبیاءؑ انسانوں تک خدا کی وحی پہنچاتے تھے اور ان سے کہہ دیتے کہ یہ حق و صداقت پر مبنی تعلیم تم تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے بعد

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)

تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے لیکن اتنا سمجھ لو کہ جو شخص اس راہ نمائی کا اتباع کریگا، وہ خوف و حزن سے مامون رہے گا۔ جو اس کے خلاف چلے گا، تباہ و برباد ہو جائے گا۔

آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر ان الفاظ کو دوبارہ سامنے لائیے جن سے اس باب کا آغاز کیا گیا ہے اور سوچئے کہ اگر بات یہی ہو کہ "جسے خدا ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا" تو پھر یہ تمام سلسلۂ رشد و ہدایت، انبیاء کرامؑ کی بعثت، نزولِ وحی، تبلیغِ رسالت، اور جزا و سزا سے متعلق قانونِ مکافات، بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیا آپ سوچ بھی سکتے ہیں کہ ایک طرف تو خدا یہ کہے کہ "حق و صداقت پر مبنی تعلیم تمہارے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے اسے قبول کرلے، جو چاہے اس سے انکار کر دے" اور دوسری طرف وہی خدا یہ بھی کہے کہ "جسے ہم راہِ راست پر لے آئیں اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے ہم گمراہ کر دیں اسے کوئی صحیح راستے پر نہیں لا سکتا"۔ خدا کی شان تو بہت بلند و بالا ہے، کوئی عام عقل و فکر کا انسان بھی اس قسم کی متضاد باتیں نہیں کرے گا۔

لیکن چونکہ یہ الفاظ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ ۥ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ) مفہوم کے اعتبار سے، قرآنِ کریم ہی کے بعض مقامات سے اخذ کردہ ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان کے صحیح مفہوم کے لئے قرآن ہی کی طرف رجوع کیا جائے، بالخصوص اس لئے کہ خدا، وحی، رسالت آخرت پر ایمان، ہدایت و ضلالت کی بنیادوں پر مبنی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا قرآنی مفہوم ہمارے سامنے آجائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قصۂ ہبوطِ آدم میں یہ کہا گیا ہے کہ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى (۲/۳۸) - تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان سے کہہ دیا گیا تھا کہ کائنات کے طبیعی قوانین کا علم تو تم (مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے) خود حاصل کرو گے لیکن جہاں تک تمہاری انسانی زندگی کا تعلق ہے، اس کی راہ نمائی کے لئے قوانین و اقدار، نہ تو کوئی انسان اپنے ذہن سے وضع کر سکے گا اور نہ ہی، خدا کی طرف سے عطا کردہ

سرچشمۂ ہدایت خدا ہی ہے

وحی کے علاوہ، کہیں اور سے پا سکے گا۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر واضح کیا ہے مثلاً

(۱) سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰/۵۰) - ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اسے (اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے) ہدایت (راہ نمائی) دی۔

(۲) سورۃ الاعلیٰ میں، خدا کے تخلیقی پروگرام کے چار مدارج بتائے گئے ہیں۔ اَلَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ (۸۷/۲-۳)۔ خدا نے ہر شے کی تخلیق کی ابتدا کی۔ پھر اس میں سے حشو و زوائد کو الگ کر کے اس میں تناسب و توازن پیدا کیا۔ پھر اس کے لئے پیمانے (قوانین) مقرر کئے اور ان کی طرف ان کی راہ نمائی کر دی (انہیں ان قوانین کا علم دے دیا۔ اس کو ہدایت کہتے ہیں)۔

(۳) سورۃ اللیل میں ہے۔ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۙ (۹۲/۱۲)۔ یقیناً ہدایت دینا ہماری ذمہ داری ہے۔

(۴) سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۳/۷۲)۔ ان سے کہہ دو کہ ہدایت وہی ہدایت ہے جو خدا کی طرف سے ملے۔ انسانوں کی خود ساختہ ہدایت کسی کو اس کی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ صحیح راہ نمائی صرف خدا کی طرف سے مل سکتی ہے۔ (نیز ۲/۱۲۰، ۶/۷۱)۔

اب آگے بڑھئے۔ اشیائے کائنات کے اندر، خدا کی یہ ہدایت از خود موجود ہوتی ہے۔ یعنی ان کی طرف، کہیں خارج سے راہ نمائی نہیں بھیجی جاتی۔ ہر شے کے اندر یہ راہ نمائی موجود ہوتی ہے کہ اسے

رسولوں کی وساطت سے ہدایت انسانوں تک پہنچائی جاتی تھی

کس نہج کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔ تفصیل ان امور کی پہلے گذر چکی ہے، لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، یہ راہ نمائی ان کے اندر از خود موجود نہیں ہوتی۔ اس کے لئے پروگرام یہ تھا کہ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی، بذریعہ وحی، رسول کو دی جاتی تھی اور رسول اسے دوسرے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔ سورۃ النساء میں، مختلف رسولوں کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ انہیں اس لئے بھیجا گیا تھا۔ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴/۱۶۵)۔ تاکہ لوگوں کو خدا کے خلاف یہ حجت نہ رہے کہ اس نے ہمیں بتایا ہی نہیں تھا کہ صحیح راستہ کونسا ہے، اس لئے اگر ہم غلط راستوں پر چلتے رہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۙ (۳۹/۵۷)۔ یا لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اگر اللہ ہمیں راہ نمائی دیتا تو ہم بھی متقین میں سے ہوتے۔ رسول بھیجے ہی اس غرض کے لئے جاتے تھے۔ لَعَلَّهُمْ یَهْتَدُوْنَ (۳۲/۳)۔ تاکہ لوگ صحیح راستے پر چلیں۔ وَ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۠ (۱۳/۷)۔ یہ، ہدایت دینے والے، رسول دنیا کی ہر قوم میں بھیجے گئے تھے۔

رسول بھیجا جاتا تھا اور اس سے کہا جاتا تھا کہ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵/۶۷)۔ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے، اسے لوگوں تک پہنچا دے۔ "جو کچھ خدا کی طرف سے نازل کیا جاتا تھا" اُسے اس رسول کی کتاب کہا جاتا ہے۔ لہذا، خدا کی ہدایت، لوگوں کو اس کتاب کے ذریعے ملتی تھی جسے رسول ان تک پہنچاتا تھا۔ خدا کی آخری مکمل اور محفوظ کتاب، قرآنِ مجید ہے جس میں تمام اقوامِ عالم کے لئے ہدایت موجود ہے۔ یَّهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ یَهْدِیْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ (۵/۱۶)۔ خدا اپنی کتاب (قرآنِ مجید) کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔ خدا، اس طرح اپنا ضابطۂ ہدایت لوگوں تک پہنچا دیتا اور ان سے کہہ دیتا کہ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ

عَلَيْهَا (۱۰/۱۰۸) ۔ جو شخص اس سے راہ نمائی حاصل کر کے سیدھے راستے پر چلے گا، اس کا فائدہ خود اسی کو ہوگا۔ جو، اس کے باوجود، غلط راستے اختیار کرے گا، اس کا نقصان بھی اس کو ہوگا۔ (نیز ۳۹/۴۱)

یہاں سے ہم نے دیکھ لیا کہ خدا انسانوں کو ہدایت کس طرح سے دیتا ہے۔ یعنی،

(۱) خدا، رسولوں پر ہدایت بذریعہ وحی نازل کرتا تھا۔ اور

(۲) رسول اسے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے اور ان سے کہہ دیتے تھے کہ جس کا جی چاہے اسے اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

جہاں تک اس پروگرام کے پہلے حصے کا تعلق ہے ___ یعنی رسول کو بذریعہ وحی ہدایت ملنے کا تعلق، اس میں اس شخص کے جسے وحی دی جاتی تھی (یعنی رسول کے) اختیار و ارادہ کا کوئی دخل نہیں

نبوت جسے خدا چاہتا تھا دیتا تھا

ہوتا تھا۔ خدا اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق، ایک برگزیدہ ہستی کو اس مقصد کے لئے منتخب اور مختص کر لیتا تھا۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَآءُ (۲/۱۰۵)۔ اللہ، اپنی مشیت کے مطابق، جسے چاہتا اس منصبِ جلیلہ کے لئے مختص کر لیتا۔ (نیز ۳/۷۳)۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (۶/۱۲۵)۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ تاجِ رسالت کس کے سر پر رکھے گا۔ اس میں، اس ہونے والے رسول کی سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ نبوت، وہبی شے تھی، اکتسابی نہیں۔ یہ مشیتِ خداوندی کے مطابق جسے ملتی تھی احساناً ملتی تھی نہ کہ معاوضتہً وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۱۴/۱۱)۔ خدا اپنی مشیت کے مطابق، جسے مناسب سمجھتا تھا، اسے احساناً عطا کر دیتا تھا۔ حتیٰ کہ جس ممتاز ہستی کے سپرد یہ ذمہ داری کی جانے والی ہوتی تھی، اسے اس کا علم و ادراک تک نہیں ہوتا تھا کہ اس کے لئے اس کا انتخاب ہونے والا ہے۔ نہ ہی وہ اس سے پہلے وحی اور نبوت کی کنہ و ماہیت سے واقف ہوتا تھا۔ قرآنِ کریم میں خود رسول اللہ کے متعلق یہی کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۴۲/۵۲)[1]۔

---

[1] نبوت خالصتہً وہبی ہے اور کسی کو اس کے کسب و ہنر کی بدولت نہیں ملتی۔ جو لوگ یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ انسان، اپنی ریاضت اور اطاعت سے منزل بہ منزل درجۂ نبوت تک پہنچ سکتا ہے، وہ نبوت کی کنہ و حقیقت سے بے خبر ہیں۔ تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں تک حضرات انبیائے کرامؑ کا خدا سے ہدایت پانے کا تعلق ہے، اس کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح اور مبنی برحقیقت ہے کہ خدا جسے چاہتا اسے ہدایت دے دیتا اور جسے خدا کی طرف سے یہ ہدایت نہ ملتی اس کے لئے قطعاً ممکن نہ تھا کہ وہ کہیں اور سے اسے حاصل کر لیتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک نبی اس کا اعلان کرتا تھا۔ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (۶/۷۸؛ ۶/۸۱)۔ اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں بھی انہی میں سے ہوتا جو غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ اور جب نبی بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا تو دوسرے انسان ایسا کیوں نہیں کہیں گے۔ انہیں بھی یونہی کہنا پڑے گا کہ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ۔ اگر خدا ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی سیدھی راہ اختیار نہ کر سکتے۔ اس نے یہ ہدایت کیسے دی ہے، اس کی وضاحت اگلے چار لفظوں نے یوں کر دی کہ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (۷/۴۳)۔ خدا کے رسول (پیغامبر) حق کو لے کر ہمارے پاس آ گئے اور یوں

اس طرح خدا کی طرف سے انسانوں کو ھدایت ملتی ہے

خدا کی ہدایت ہم تک پہنچ گئی۔ یعنی اگر خدا کی وحی انسانوں تک نہ پہنچتی تو وہ تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے اور انہیں معلوم ہی نہ ہو سکتا کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا سیدھا راستہ کونسا ہے۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ (۷/۱۷۸)۔ سیدھے راستے پر چلنے والا وہی ہے جو خدا کی عطا کردہ راہ نمائی کے اتباع میں سفرِ حیات طے کرتا ہے۔ یعنی اس کتاب کی پیروی کرتا ہے۔ دیکھئے سورۂ زمر میں اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا کہ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا......... اللہ نے ایک کتاب نازل کی جس میں ایسی باتیں ہیں جن سے اچھی باتیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ اس کے بعد ہے۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ یہ ہے خدا کی وہ ہدایت، جس سے وہ، ہر اس شخص کو جو ایسا کرنا چاہے، سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (۳۹/۲۳)۔ جو شخص اپنے آپ کو اس راہ نمائی سے محروم کر لے، اُسے دنیا میں کوئی بھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا۔ وحی کا بدل کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے صحیح مفہوم یہ کہنے کا کہ جسے خدا کی طرف سے راہ نمائی مل جائے وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ اور جو اس ہدایت کے

بجائے کوئی اور راستے اختیار کرلے تو وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ خدا کی یہ راہ نمائی اس کی کتاب میں درج ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب سے یہ راہ نمائی ملتی کیسے ہے اور اس سے محروم کون رہتے ہیں۔ ان امور کو اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے۔

ہدایت کون لوگ حاصل کر سکتے ہیں

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ان کے اختیار ہی میں نہیں کہ جس راہ پر چلنے کی ہدایت انہیں دی گئی ہے، وہ اسے چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں لیکن انسان کو اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ہدایتِ خداوندی کے مطابق سفرِ زندگی طے کرے اور چاہے اس سے انحراف کر کے اپنے لئے دوسری راہیں تلاش کرلے۔ اُسے خدا کی طرف سے ضابطۂ ہدایت دے دیا گیا اور اس سے کہہ دیا کہ وہ عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے، اس پر غور کرے۔ اگر اس کا قلب و دماغ مطمئن ہو کہ وہ ہدایت، حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے، تو اسے اپنے لئے بطور ضابطۂ حیات منتخب کرلے۔ اسے ایمان کہتے ہیں۔ لہٰذا، خدا کی کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے، اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان اس کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لائے۔ جو شخص اس ضابطہ کو سچا ہی نہیں مانتا وہ اس سے مستفید کیسے ہو سکتا ہے۔

اس ضابطۂ حیات کو بطور قندیلِ راہ اپنے سامنے رکھنے کے بعد، انسان سفرِ حیات شروع کرے۔ اب یہ شمعِ ہدایت اسے، زندگی کے ہر دوراہے پر بتاتی جائے گی کہ اسے کس طرف مڑنا چاہیئے۔ یہ اس کے سامنے کشادگی کی راہیں کھولتی جائے گی۔ یہ مطلب ہوگا، ایمان کے بعد، کتاب اللہ سے ہدایت (راہ نمائی) حاصل کرنے کا۔ اسی لئے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کرنے والوں کے متعلق کہا ہے کہ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ (۱۰/۹)۔ ان کا ربّ، ان کے ایمان کی وجہ سے، ان کے سامنے زندگی کی راہیں کشادہ کئے چلا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعلان، سورۂ فاتحہ کے بعد، قرآنِ کریم کی ابتدا میں ان الفاظ میں کر دیا گیا کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (۲/۲)۔

ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ پر ایک اعتراض

یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و اضطراب نہیں۔ یہ متقین کے لئے راہ نمائی کا کام دیتی ہے۔ یہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جو لوگ پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو پہلے ہی ہدایت پر ہیں۔ اسی لئے وہ متقی ہیں۔ یہ اعتراض متقی کا قرآنی مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

مُتَّقِی کے معنی

جو شخص دنیا میں آیا ہے، اسے سفرِ حیات بہرحال طے کرنا ہے۔ بعض لوگ اس سفر کو یوں طے کرتے ہیں کہ نہ کوئی متعین منزل سامنے ہے نہ مقصود پیشِ نظر۔ انفرادی مفاد کی کشمکش انہیں آگے سے کھینچ رہی ہوتی ہے اور پست جذبات کی قوتِ محرکہ پیچھے سے دھکیل رہی۔ اس طرح وہ آنکھیں بند کئے یوں چلے جاتے ہیں کہ نہ انہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ راستہ ہموار ہے یا ناہموار۔ نہ اس کی فکر کہ آگے گڑھا ہے یا کنواں۔ دوسرے لوگ اسی سفر کو یوں طے کرتے ہیں کہ ایک متعین منزل سامنے ہے اور ان کا ہر قدم اس کی طرف اٹھتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے بچ کر چلیں۔ جو اس طرح راستہ طے کرنے کے آرزومند ہوں انہیں مُتَّقِیۡنَ کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ راہ نمائی کی ضرورت انہی لوگوں کو ہوگی، نہ کہ اول الذکر کو۔ لہٰذا، ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ کے معنی یہ ہیں کہ یہ ضابطۂ ہدایت ان لوگوں کی راہ نمائی کرتا ہے جو راستے کی خطرناک گھاٹیوں اور پُرخار وادیوں سے بچ کر چلنا چاہیں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ جو لوگ، ضابطۂ خداوندی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لائیں اور زندگی کے پُراز خطرات راستے کو محفوظ طریق پر طے کرنا چاہیں اس کتاب سے انہیں راہ نمائی ملتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں دہرایا گیا ہے، کیونکہ یہ راہ نمائی حاصل کرنے کی بنیادی شرائط ہیں۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ ملوث نہ ہونے دیں، تو انہیں راہ نمائی مل جاتی ہے (۶/۸۳)۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ کسی قوم میں پیدا ہو کر، اس کے ہاں کی مروجہ رسوم کو تقلیداً ادا کئے جانے سے (جنھیں وہ قوم "نیک کام" شمار کرتی ہو)، ہدایت نہیں مل جاتی۔ ہدایت اسے مل سکتی ہے جو خود ایمان لائے اور پھر ایسے کام کرے جنھیں یہ ضابطۂ ہدایت "نیک" قرار دے۔ (۱۹-۲۰/۹)۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ خدا کی کتاب سے

ہدایت اس طرح ملتی ہے کہ جہاں کوئی اختلافی امور سامنے آئیں وہاں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں صحیح بات کون سی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑی بات ہے (۲/۲۱۳)۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر کہا ہے کہ زندگی کے راستے میں جہاں تاریکی آجائے یہ کتاب وہاں قندیلِ راہ بن کر، چلنے والوں کو محفوظ و مصئون آگے لے جاتی ہے (۲/۲۵۷)۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ مشکلات کا مقابلہ نہایت ثبات واستقامت سے کرتے ہیں، انہیں آگے بڑھنے کے لئے راہ نمائی ملتی ہے۔ (۲/۱۵۶)۔ استقامت کے معنی یہ ہیں کہ راستے کی صعوبات خواہ کتنی ہی صبر آزما اور ہمت طلب کیوں نہ ہوں، انسان صحیح راہ کو کبھی نہ چھوڑے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "اِعْتِصَامِ بِحَبْلِ اللّٰہ" (خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا) کہتے ہیں (۳/۱۰۱؛ ۳/۱۰۲؛ ۴/۱۷۵)۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ حالات خواہ کتنے ہی ناساعد کیوں نہ ہوں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اعراض نہ برتا جائے۔ اس طرح انسان کے سامنے کشاد کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی (۴/۶۸-۶۶)۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ہدایت، انسان کی اپنی جدوجہد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو سورۂ عنکبوت میں چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے جب کہا کہ

وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹)۔

جو لوگ ہمارے باب میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کے سامنے زندگی کی راہیں کشادہ کئے جاتے ہیں۔

اور

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى (۱۹/۷۶)

جو صحیح راستے پر چلتے ہیں، ان کے لئے راستے اور کشادہ ہوتے جاتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد، اس ضمن میں کچھ اور کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

---

(۲) کون لوگ ہدایت حاصل نہیں کر سکتے

خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کے لئے منزل کا تعین کر دیا اور اس تک پہنچنے کے راستے کی

نشاندہی کردی۔ اس راستے پر جہاں جہاں دوراہہ آیا، وہاں سائن پوسٹ لگادیا کہ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ کونسی سمت کو۔ اگر کوئی شخص ان سائن پوسٹس کی طرف دیکھے ہی نہیں اور اگر انہیں پڑھے بھی تو ان سے بے رُخی برت کر، جدھر جی چاہے چل پڑے، تو ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ (مثلاً)۔

(۱) سورۂ یونس میں ہے۔ اَفَاَنۡتَ تَهۡدِی الۡعُمۡیَ وَ لَوۡ کَانُوۡا لَا یُبۡصِرُوۡنَ (۱۰/۴۳)۔ اے رسولؐ! کیا تو ایسے شخص کی راہ نمائی کر سکتا ہے جو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر کے اندھا بن جائے؟

جو آنکھیں بند کر کے چلیں

دوسری جگہ ہے کہ "اے رسولؐ! تو نہ مردے کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی ایسے بہرے کو جسے تو بلائے اور وہ پیٹھ پھیر کر چل دے۔ نہ ہی تو اندھے کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ تُو تو اسے ہی سُنا سکتا ہے، جو تیری دعوت کو سچا سمجھے اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار ہو۔ (۸۰-۸۱/۲۷)؛ (۵۲-۵۳/۳۰)۔ دوسرے مقام پر ہے کہ جو لوگ اپنے کانوں میں ڈاٹ لگا کر بہرے بن جائیں، انہیں کس طرح بات سنائی جا سکتی ہے (۳۱/۷)۔ سورۂ فاطر میں ہے۔ نہ اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی تاریکی اور روشنی، نہ سایہ اور دھوپ ایک جیسے ہو سکتے ہیں اور نہ ہی زندہ اور مُردہ۔ اے رسولؐ! تو مُردوں کو قبر میں کچھ نہیں سنا سکتا۔ سنایا تو اسے ہی جا سکتا ہے جو سننا چاہے" (۱۹-۲۲/۳۵)۔

(۲) سورۂ نحل میں ہے۔ اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ یُّضِلُّ (۱۶/۳۷)۔ اے رسولؐ! تیری لاکھ خواہش ہو، لیکن یہ لوگ صحیح راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ جو شخص خود ہی غلط راستے پر چلنا چاہے، اسے خدا کس طرح صحیح راستے پر لے آئے؟ دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ اس ضابطۂ خداوندی کو سچا ہی نہ سمجھیں، انہیں خدا کس طرح سیدھا راستہ دکھا دے۔ (۱۶/۱۰۴)۔ جو خود بھی اس ضابطہ کی صداقت سے انکار کریں اور دوسروں کو بھی اس طرف آنے سے روکیں۔ (۴/۱۶۷)۔

(۳) جیسا کہ پہلے تفصیل سے بتایا جا چکا ہے، خدا نے انسان کو جس قدر قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی ہیں، اس میں جس قدر جذبات پیدا کئے ہیں یہ نہ فی ذاتہٖ شر ہیں نہ خیر۔ یہ تو محض قوتیں ہیں۔

ان کا استعمال انہیں شر یا خیر بنا دیتا ہے۔ اگر قوت، مظلوم کا گلا گھونٹنے کے لئے استعمال کی جائے تو وہ شر ہے۔ اگر اسے ظالم کی کلائی مروڑنے کے لئے صرف میں لایا جائے تو وہ خیر ہے۔ اگر انسانی

جو اپنے جذبات کو معبود بنا لیں

جذبات کو، مستقل اقدار کی حدود کے اندر رکھا جائے تو اس کا نتیجہ تعمیری ہوتا ہے۔ اگر انہیں سرکش و بے باک چھوڑ دیا جائے، وہ تباہی پیدا کرتے ہیں۔ سورۂ قصص میں ہے کہ "اے رسولؐ! اگر یہ لوگ تیری دعوت پر لبیک نہیں کہتے تو یہ اس لئے ہے کہ یہ اپنے پست جذبات کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں۔ تم سوچو کہ اس شخص سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے، جو خدائی راہنمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا جائے۔ ظالمین، خدا کی راہنمائی سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں۔ (۲۸/۵۰)؛ (۳۰/۲۹)

(۴) یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے جذبات کا اتباع کئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگوں (بلکہ نوعِ

اندھی تقلید کرنے والے

انسان کی اکثریت) کا یہ عالم ہے کہ وہ بلا سوچے سمجھے، آنکھیں بند کئے، دوسروں کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اب سوچو کہ اگر اگلا آدمی غلط راستے پر چل رہا ہو تو اس کے مقلد (پیچھے چلنے والے) کس طرح سیدھے راستے پر چل سکیں گے۔ یہ بدترین قسم کی گمراہی ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ اگر تم اس قسم کے انبوہ کا اتباع کرو گے تو وہ تمہیں خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ یہ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں (۶/۱۱۷؛ ۶/۱۲۰؛ ۵/۷۷)۔ جب تک یہ لوگ، اس اندھی تقلید کی روش کو چھوڑ کر، عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے، غلط اور صحیح راستے میں تمیز نہیں کر سکیں گے۔

(۵) جن لوگوں کی روش یہ ہو کہ کبھی خدا کے تجویز کردہ راستے پر چل پڑیں اور کبھی کسی اور کے بتلائے

شرک

ہوئے راستے پر، وہ منزلِ مقصود تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ اس روش کو قرآن کی اصطلاح میں شرک کہتے ہیں اور اس کا نتیجہ ضَلٰلًا بَعِیۡدًا (۴/۱۱۶) یعنی ایسا شخص اپنی منزلِ مقصود سے بہت دُور چلا جاتا ہے۔

ایمان کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات کے فیصلے، خدا کی کتاب کے مطابق کرے یا کرائے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ زبان سے ایمان کا اقرار کیا جائے اور اپنے معاملات کے فیصلے غیر خداوندی (طاغوتی) ضوابط کی رُو سے کئے جائیں تو اس سے بھی انسان صحیح منزل تک نہیں پہنچ

سکتا۔ (۴/۶۰)۔

مُنافق

(۶) کسی راستے کے متعلق یہ یقینِ کامل کہ وہ اسے منزلِ مقصود تک ضرور پہنچا دیگا **ایمان** کہلاتا ہے لیکن ایک شخص جسے راستے کی صحت پر یقین تو نہ ہو لیکن کسی خاص مصلحت کے تابع وہ ان لوگوں کے ساتھ ہولے جو صحیح راستے پر چل رہے ہوں، اور ہر قدم پر کوشش یہ کرے کہ جونہی موقعہ ملے وہ کسی دوسری سمت کی طرف نکل جائے، تو ایسا شخص منزلِ مقصود تک خاک پہنچے گا؛ قرآن کی اصطلاح میں اُسے **منافق** کہتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔ (۱۴۲- ۴/۱۴۳)۔

فاسق

(۷) ہر پھل کے اوپر ایک چھلکا ہوتا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے وہ نشو و نما پاتا اور پختگی تک پہنچتا ہے۔ اسے اس کا (PATTERN) کہہ لیجئے۔ جو پھل اپنے اس چھلکے سے باہر نکل جاتا ہے وہ پختگی تک نہیں پہنچ سکتا، گل سڑ جاتا ہے۔ پھل کا اس طرح اپنے قالب سے باہر نکل جانا **فسق** کہلاتا ہے، اور ایسا کرنے والا **فاسق**۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ خدائی راہ نمائی انہیں کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۵/۱۰۸)۔ اسے قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ (مثلاً ۲/۲۶؛ ۹/۲۴)۔ سورۂ صف میں ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ جب یہ لوگ صحیح قالب کو چھوڑ کر ایک طرف کو نکل جاتے ہیں، تو خدا کا قانونِ مکافات ان کے دلوں کا رُخ بھی اُسی طرف کو کر دیتا ہے اور اس کے بعد ہے وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۶۱/۵)۔

ظالمین

(۸) کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ہر شے کو اس کے مقام پر رکھا جائے۔ اگر کسی شے کو اس مقام پر نہ رکھا جائے جس پر اسے ہونا چاہیئے، تو اُسے **ظُلم** کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس پروگرام میں یہ کیفیت ہو جائے وہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس لئے خدا نے واضح کر دیا ہے کہ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (۲/۲۵۸)۔ ظالمین کے سامنے کشاد کی راہیں واہ نہیں ہوتیں۔ اس حقیقت کا اعادہ قرآنِ کریم کے بے شمار مقامات میں کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کو سامنے لاتے ہیں جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے

کہ خدا کسے ہدایت نہیں دیتا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ (۳/۸۵)۔

(بھلا سوچو کہ) خدا اس قوم کو کس طرح ہدایت دے دے گا جو ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی روش اختیار کر لے، درآنحالیکہ اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ اس کا رسولؐ حق پر ہے اور ان کی طرف خدا کی کھلی کھلی تعلیم آ گئی تھی۔ یاد رکھو! خدا اس قسم کی ظالم قوم کی راہ نمائی صحیح منزل کی طرف کبھی نہیں کیا کرتا۔

اس ضمن میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ ـــــ ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ جب خدا یہ کہتا ہے کہ ایسی قوم کو کس طرح ہدایت مل سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ قوم ابدی طور پر (ہمیشہ کے لئے) راندۂ درگاہ ہو گئی ہے۔ اب وہ کبھی راہِ راست پر آ نہیں سکتی۔ نہیں، اس سے یہ مطلب نہیں ہوتا۔ اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ قوم اپنی موجودہ روش پر چلتی رہے گی اور اس روش کو صحیح سمجھتی رہے گی، اس وقت تک وہ راہِ راست پر نہیں آ سکے گی۔ جس وقت بھی اس نے سوچنا شروع کر دیا کہ جس راستے پر وہ چل رہی ہے، وہ اسے تباہیوں کے غار میں دھکیل دے گا، اس میں صحیح راستے کی طرف مڑنے کا امکان روشن ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے جو رسول اللہ سے کہا گیا کہ اگرچہ دنیاوی مفاد کی چمک نے ان لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور وہ غلط راستے پر اندھا دھند چلے جا رہے ہیں، لیکن ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ق‌ (۶/۷۰)۔ تو، قرآن کے ذریعے، انہیں اس امر کی یاد دہانی کرائے جا کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہیوں کی طرف لے جائے گا، تاکہ کوئی شخص، اپنی غلط روش کی بنا پر اس لئے تباہ نہ ہو جائے کہ اسے صحیح راستہ کی طرف دعوت دینے والا کوئی نہ تھا۔ ہدایت اور ضلالت کے سلسلہ میں یہ آیت بڑی واضح ہے۔

اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور ایک اور اہم عنوان کی طرف آتے ہیں۔

(۳) خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوبِہِم
(خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگادی)

یہ، اور اسی قسم کی دیگر آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے، حسبِ ذیل امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ہدایت حاصل کرنے (خدائی رہنمائی سے مستفید ہونے) کے لئے ضروری ہے کہ انسان، پیشِ نظر معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ حقائق کو عقل و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرے۔ موافق اور مخالف دلائل کے وزن کا صحیح صحیح اندازہ کرے۔ آنکھوں پر سے پٹی اتار کر دیکھے کہ جس راستے پر وہ چلا جارہا ہے، وہ اسے کس منزل کی طرف لے جارہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے تو اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ وہ غلط راستہ چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کرلے۔ لیکن جو شخص عقل و فکر سے کام ہی نہ لینا چاہے، آنکھیں بند کئے، اپنے راستے پر اندھا دھند چلا جائے، جو شخص اس سے کہے کہ یہ راہ غلط ہے، یا تو اس کی بات ہی نہ سُنے، سنی کو ان سُنی کردے۔ یا اسے نخوت و تکبّر سے جھٹک دے۔

دل کی آمادگی شرطِ اولیں ہے

تو ایسے شخص کو نہ تو خدا کی ہدایت کچھ فائدہ دے سکتی ہے اور نہ ہی اس ہدایت کی طرف دعوت دینے والے کی آواز اس کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ صحیح مشورہ سے مستفید ہونے کے لئے دل کی آمادگی (RECEPTIVE MIND) بنیادی شرط ہے۔

(۲) "جو شخص اپنی آنکھیں بند کرلے، اس کے سامنے تاریکی چھا جاتی ہے۔" قرآنِ کریم اس حقیقت کو بیان کرنے کے لئے مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔ کبھی وہ کہتا ہے کہ جو اس طرح آنکھیں بند کرلے، وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ جو یوں آنکھیں بند کرلے، خدا اسے اندھا کر دیتا ہے۔ اور کبھی یوں کہ جسے خدا اس طرح اندھا کردے اسے کون روشنی دے سکتا ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ اس کے اظہار کے مختلف انداز ہیں۔ (تفصیل اس اجمال کی پہلے بھی گذر چکی ہے)۔ یعنی ہر نتیجہ ہوتا تو ہے انسان کے اپنے اعمال کا، لیکن چونکہ ہر عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوتا ہے اس لئے خدا اسے اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ جو شخص

آگ میں انگلی ڈال دے، اس کی انگلی جل جاتی ہے۔ کبھی یوں کہ آگ اس کی انگلی جلا دیتی ہے۔ کبھی یوں کہ ایسا شخص اپنی انگلی آپ جلا لیتا ہے اور کبھی یوں کہ خدا اس کی انگلی جلا دیتا ہے۔ جہاں اس (آخری) انداز کے مطابق بات کی گئی ہو، وہاں اس کا مفہوم یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا (کا قانونِ مکافات) ایسا کر دیتا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی اور کوئی الجھن باقی نہیں رہے گی۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد وہ آیات لیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (خدا ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے)، یا اس جیسی دیگر آیات۔

کافروں کے دلوں پر مُہریں ہیں!

(۱) سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ ـــ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ـــ جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے برابر ہے خواہ تو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس لئے کہ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ٥ (۲/۶-۷)۔ خدا نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہریں لگا دی ہیں۔ اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہیں اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

اس ترجمہ سے ذہنوں میں جو شکوک ابھرتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ لیکن یہ اُسی قسم کے شکوک ہیں جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے غلط مفہوم سے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کی وضاحت سابقہ عنوان میں کی جا چکی ہے۔ وہاں، یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جو پہلے ہی متقی ہیں انہیں ہدایت کی کیا ضرورت ہے، اور اگر یہ کتاب صرف متقیوں کو راہ نمائی دیتی ہے تو غیر متقی کہاں سے ہدایت حاصل کریں؟ اور زیر نظر آیت سے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر غیر مسلموں کے لئے برابر ہے خواہ انہیں تبلیغ کی جائے یا نہ کی جائے، تو پھر تبلیغ فائدہ کن لوگوں کو دے گی؟ اور غیر مسلم، اس لئے ہدایت نہیں حاصل کر سکیں گے کہ خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہریں لگا دی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔ یعنی خدا نے ان کی دیکھنے بھالنے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی ہیں ـــ اور جب حقیقت یہ ہے تو پھر ان کا کیا قصور ہے جو وہ راہِ راست پر نہیں آتے ـــ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ انہیں سخت عذاب

دیا جائے گا۔ یہ عذاب کس جرم کی پاداش میں دیا جائے گا؟ پہلے ان پر ہدایت کی راہیں بند کر دیں اور پھر انہیں اس جرم کی پاداش میں عذابِ عظیم میں مبتلا کر دیا کہ تم صحیح راستے پر کیوں نہیں چلے تھے! آپ نے غور فرمایا کہ ان آیات کے غلط مفہوم سے بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے آپ کو ہدایت نامہ (GUIDE BOOK) کہا ہے اور اس کے شروع ہی میں یہ بتا دیا ہے کہ اس سے کون لوگ ہدایت (راہنمائی) حاصل کر سکیں گے۔

(ا) وہ لوگ جو راستے کی پُرخطر گھاٹیوں سے محفوظ رہ کر منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہیں۔ یہ لوگ، عقل و فکر سے کام لے کر اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ اس کتابِ ہدایت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ صداقت پر مبنی ہے۔ اس "ایمان" کے بعد، وہ اس کتاب کی راہ نمائی میں سفرِ حیات پر گامزن ہوتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّہِمْ وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲/۵-۲)۔

(ب) لیکن جو لوگ شروع ہی سے یہ طے کر لیں کہ ہم نے چلنا اپنے ہی راستے پر ہے۔ کوئی لاکھ کچھ کہے، ہم نے نہ اس کی سُننی ہے، نہ ماننی۔ اسے یہ کتاب کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔ جو شخص آنکھیں بند کر کے چلے، اس کے لئے یکساں ہے چاہے سڑک پر بجلی کے قمقمے روشن ہوں یا گھپ اندھیرا ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو "صحیح راستہ بتلانے والی کتاب کو بیچ کر، غلط راستے بتانے والی کتابیں خرید لیتے ہیں" (۲/۱۶)۔ اور اس کے بعد، صُمٌّۢ بُکْمٌ عُمْیٌ (۲/۱۸)۔ بہرے، گونگے اندھے بن کر غلط راہوں پر چلے جاتے ہیں۔ اور کوئی مشفق راہ نما انہیں لاکھ آوازیں دے (کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو) یہ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے تک نہیں۔ فَھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۵ (۲/۱۸)۔ ایسے لوگوں کی مثال، بھیڑوں کی سی ہے کہ جس طرف اگلی بھیڑ جا رہی ہے پچھلی بھیڑیں آنکھیں بند کئے اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں ہیں، بغیر یہ پوچھے یا سمجھے کہ وہ کدھر جا رہی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے کیوں چل رہے ہیں۔ "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتابِ ہدایت کو دیکھو، سمجھو، سوچو اور پھر راستے کا انتخاب کرو، تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں سوچنے سمجھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا۔ "جس راستے پر ہمارے اسلاف (باپ، دادا) چلتے رہے ہیں ہم اُسی راہ پر چلتے جائیں گے کہ یہی سلامتی کی راہ ہے۔" قرآن کہتا ہے کہ یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے خواہ ان کے اسلاف، عقل و فکر سے عاری اور غلط راستے پر گامزن ہی کیوں نہ

رہے ہوں (۲/۱۷۰)۔ "ان کی مثال بھیڑوں کے گلّے کی سی ہے کہ چرواہا جو آوازیں دیئے جائے گا، یہ اوندھی ڈالے اس پر چلتے جائیں گے۔" صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ (۲/۱۷۱)۔ اندھے، بہرے، گونگے، عقل وفکر سے کام نہ لینے والے۔

یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں اور جن کے لئے برابر ہے چاہے انہیں راستے کے خطرات سے آگاہ کرو یا نہ کرو۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَی الْهُدٰی لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَ هُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۝ (۷/۱۹۸)۔ تم انہیں لاکھ آوازیں دو، یہ ایک نہیں سنیں گے۔ اور اگر تمہارا ان سے کہیں آمنا سامنا ہو جائے، تو انکی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ تک تو رہے ہوں گے تمہاری طرف، لیکن دھیان ان کا ہوگا کہیں اور۔ سوچو، کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے، دعوت وتبلیغ سے کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ۝ (۷/۱۹۳)۔

(۲) ان کی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ جب منہ سے نہ نکل گئی، تو پھر لاکھ سر پٹخو، یہ کبھی ہاں نہیں کریں گے۔ اپنی ضد پر اڑے رہیں گے۔ فَمَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ (۱۰/۷۴)۔ اور اس کے بعد کہا۔ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِیْنَ ۝ (۱۰/۷۴)۔ اسی طرح ہم اس قسم کے حدود فراموش لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ۔ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوتے ہیں۔ تمہاری باتوں کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ (۴/۱۵۵)۔ ان کے دل غلافوں میں نہیں بلکہ انکی اس ذہنیت کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں پر مہریں لگا دی ہیں، اس لئے، جب تک یہ اس روش کو نہیں چھوڑتے ان کے صحیح راستے کی طرف آنے کا کوئی امکان نہیں۔

(۳) بعض لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے کوئی بات کرو تو وہ کسی دلیل اور برہان کی بنا پر اس کی مخالفت نہیں کرتے، بس، بلا دلیل وحجت، یونہی مخالفت کئے چلے جاتے ہیں اور دوسرے کی ایک نہیں سنتے۔ (الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ) اس کے بعد ہے كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ (۴۰/۳۵) یہ وہ نخوت وتکبر کے پتلے ہیں، جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ تکبر کا یہ عالم کہ محفل میں بیٹھے

ہیں داعی الی الخیر (صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والا) بات سمجھا رہا ہے لیکن یہ بیٹھے کچھ اور ہی سوچ رہے ہیں۔ جب محفل برخواست ہوتی ہے اور لوگ باہر نکلتے ہیں، تو یہ دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ یہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر خدا مہریں لگا دیتا ہے۔ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ (۴۷/۱۶)۔ اس لیئے کہ یہ اپنے جذبات کے نشے میں بدمست، آنکھیں بند کئے چلتے رہتے ہیں۔ اور نخوت کا یہ عالم، کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ان کی اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا، اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِنۡ ھٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ۔ یہ وہی پرانے قصے کہانیاں ہیں جسے یہ بیٹھا دہراتا رہتا ہے۔ کہاں کا عذاب اور کیسی تباہی! یہ ہیں وہ جن کے متعلق کہا کہ وَ جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ اَکِنَّۃً اَنۡ یَّفۡقَہُوۡہُ وَ فِیۡۤ اٰذَانِہِمۡ وَقۡرًا ؕ (۶/۲۵)۔ ان کے دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں کہ یہ کچھ سمجھ سوچ ہی نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جس سے صحیح بات ان کے کانوں کے اندر جا ہی نہیں سکتی۔ ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ان سے، ان کی خیرخواہی کی بات کرو تو یہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں اور بڑی رعونت سے کہتے ہیں کہ ہم سے یہ باتیں کرنے کا کچھ نتیجہ نہیں۔ قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَ فِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ وَّ مِنۡۢ بَیۡنِنَا وَ بَیۡنِکَ حِجَابٌ۔ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگے ہوئے ہیں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان ایسا دبیز پردہ ہے جس کے آر پار کوئی بات نہیں جا سکتی۔ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ۝ (۴۱/۵)۔ تم اپنا کام کئے جاؤ۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔ تم خواہ مخواہ ہماری ہمدردی میں کیوں گھلے جا رہے ہو۔ جب تباہی آئے گی تو ہم خود بھگت لیں گے! کہا کہ جو شخص خیرخواہی کی باتوں سے یوں اعراض برت لے، بے رُخی اختیار کر لے اور اس کی قطعاً پروا نہ کرے کہ اس کے غلط اعمال کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہوگا، وہ راہِ راست پر کیسے آسکتا ہے، اس کے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور اس کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ (۱۸/۵۷)۔ یہ لوگ، حق کی دعوت کی طرف سے اعراض ہی نہیں برتتے بلکہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں۔ ان کے فریب نہ آجانا۔ کَذٰلِکَ یَطۡبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۝ (۳۰/۵۸-۵۹)۔ یوں ان لوگوں کے دلوں پر، جو علم و عقل سے کام نہیں لیتے، خدا مہریں لگا دیتا ہے۔ اس طرح،

ان لوگوں کے اور قرآن کے درمیان ایک غیر مرئی، غیر محسوس پردہ حائل ہو جاتا ہے ـــــــ (۴۵ – ۴۶/۱۷)۔

(۴) یہ تو ان لوگوں کی حالت کا بیان تھا جو سرے سے صداقت کا اقرار ہی نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ، وہ لوگ بھی ہیں جو زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن جب اس کے مطابق کام کرنیکا وقت آتا ہے تو گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ (انہیں قرآن کی اصطلاح میں منافقین کہا جاتا ہے۔)

منافقین کے دلوں پر مُہریں

سورۂ توبہ میں ہے کہ جب ان لوگوں کو میدانِ جنگ (قتال فی سبیل اللہ) کے لئے کہا جاتا ہے تو یہ عجیب بہانوں سے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا کہ وَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۹/۹۳؛ ۸۶ – ۹/۸۷؛ ۲۰ – ۴۷/۲۳)۔

یاد رہے کہ یہ صرف اسلام کے صدرِ اوّل ہی کی بات نہیں کہ اُس وقت منافقین کا کوئی خاص گروہ تھا جس کی بابت یہ آیات نازل ہوئی تھیں۔ یہ ایک ابدی حقیقت کا بیان ہے۔ اور وہ یہ کہ جس دعوے کی صداقت کا ثبوت، انسان کی سیرت و کردار سے نہیں ملتا، وہ دعوائے ایمان نہیں کہلا سکتا۔ زبان سے اس کا اقرار کرنے والے اور عمل سے اس کی تکذیب کرنے والے، منافق ہیں، خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہدایتِ خداوندی کا اتباع کرنے کے بجائے، اپنے جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر صرف اس دنیاوی زندگی کے مفاد ہوتے ہیں۔ آخرت پر ان کا ایمان ہوتا ہی نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خود اپنے جذبات (پست خواہشات) ہی کو اپنا خدا بنا لیا۔ وَ اَضَلَّهُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم و عقل رکھنے کے باوجود تباہ ہو جاتے ہیں۔ وَ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ـــ جذبات کے نشے میں مدہوش ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل پر اور کانوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰہِ (۴۵/۲۳)۔ کہو کہ جو شخص ہدایتِ خداوندی سے اس طرح منہ موڑ کر غلط راستوں پر چل نکلے، اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے! یہ لوگ دنیاوی زندگی کے مفادات ہی کو اپنا مطلوب و منتہٰی قرار دے لیتے ہیں اور مستقبل کی

طرف سے یکسر آنکھیں بند کر لیتے ہیں دنیاوی زندگی کے جھوٹے نگوں کی صناعی ان کی نگاہوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دیتی ہے کہ یہ پھر کچھ دیکھ سکنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ یوں ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ (۱۰۶-۱۰۸/۱۶)۔

(۵) سورۂ یٰسٓ میں ہے۔ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ .... لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (۱-۷/۳۶)۔
ان آیات کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

> ان میں سے بہتوں پر خدا کی بات پوری ہو گئی، یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال رکھے ہیں اور وہ ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں جن سے ان کے سر اوپر کے اوپر اُٹھے رہ جاتے ہیں۔ اور ہم نے ان کے سامنے بھی روک بنا دی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ اور ان کے اوپر پردہ ڈال دیا ہے۔ سو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لہذا، ان کے لئے برابر ہے چاہے تو ڈرائے ان کو یا نہ ڈرائے ان کو یہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

ان آیات میں سے باقی حصہ کی وضاحت تو پہلے ہو چکی ہے، اس لئے ان کا صحیح مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ لیکن پہلی آیت (لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ) کے متعلق یہ کہہ کر بہت بڑا شبہ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ دیکھئے! یہاں کہا گیا ہے کہ ان کی بات

خدا کی بات پوری ہو گئی

خدا کی بات پوری ہو گئی کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے ان کے متعلق (ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی) یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لہذا، وہ بات پوری ہو گئی۔ یہ ایمان نہیں لاتے، نہ ہی یہ ایمان لائیں گے۔ "ایمان لانا ان کے مقدر میں ہی نہیں۔"

یہ اُسی عقیدۂ جبر کا پیدا کردہ تصور ہے جس سے اس قسم کے شکوک ابھرتے ہیں، ورنہ بات بالکل واضح ہے۔ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیں گے، ان پر حقیقت مشتبہ رہے گی فلہذا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ وَ يَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ٥ (۱۰۰/۱۰)۔ "جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ التباس (CONFUSION) میں رہتے ہیں۔" یہ لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لے رہے، اس لئے خدا کی راہ نمائی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ ان کی حالت، خدا کے اس قانون کی صداقت کی زندہ شہادت ہے

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ۔ یوں خدا کی بات (اس کا قانون) سچا ثابت ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو تذکیر و تنذیر کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ...... (۳۶/۱۱)۔ تذکیر و تنذیر تو اسے فائدہ دے سکتی ہے جو خدا کی نصیحت (ہدایت) کی پیروی کرتا ہے اور انسانی اعمال کے ان نادیدہ نتائج سے ڈرتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتّب ہوتے ہیں۔

یہی اندازِ بیان سورۂ اعراف کی آیت (۷/۱۷۹) میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس آیت کا پہلا حصّہ یہ ہے۔

جہنم کے لئے پیدا کیا ہے

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا۔ یقیناً ہم نے بہت سے جنّ و انس[1] کو جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس ترجمہ سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے انہیں پیدا ہی جہنّم کے لئے کیا ہے تو یہ اپنے مقدر کو بدل کر نیک کیسے بن سکتے ہیں؟ لیکن جب ہم آیت کے باقی حصّہ کو دیکھتے ہیں تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ یہ اپنے مقام اور مقصدِ حیات سے غافل رہتے ہیں۔ مطلب واضح ہے کہ جو لوگ دیکھنے، سننے، سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود، اندھے بہرے، گونگے بنے رہتے اور بلا سوچے سمجھے غلط راہوں پر چلتے رہتے ہیں ان کی یہ روش زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ لوگ سیدھے جہنّم میں جائیں گے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ ہیں ہی جہنمی۔ اسی مفہوم کو قرآن نے دوسرے مقام پر یوں واضح کیا ہے کہ جب اس قسم کے لوگ جہنّم میں داخل ہونگے

---

[1] جن و انس سے مراد شہری آبادیاں اور خانہ بدوشوں کی صحرائی آبادیاں ہیں۔ تفصیل کے لئے میری کتاب "ابلیس و آدم" یا "لغات القرآن" دیکھئے۔

تو وہاں کا داروغہ ان سے پوچھے گا کہ تم نے کیا کیا تھا جو تم جہنم میں داخل کئے جا رہے ہو؟ تمہارا جرم کیا تھا؛ وہ کہیں گے کہ زیادہ تفصیل میں کیا جائیں۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷/۱۰)۔ جو لوگ ہمیں غلط روش پر چلنے کے عواقب سے متنبہ کرتے تھے اگر ہم ان کی بات سنتے یا عقل و فکر سے کام لیتے، تو کبھی اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔ لہذا، جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ جہنم کے کندے ہیں۔ یہی ہیں جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں۔ سورۂ محمد میں ہے۔ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (۴۷/۲۴)۔ کیا یہ قرآن میں غور و تدبر نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؛ ضمناً اس آیت میں اَقْفَالُهَا کی ھا بڑی معنی خیز ہے جس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے دلوں پر کہیں خارج سے

ان کے دل اپنے تالے اپنے اوپر ڈال لیتے ہیں

تالے نہیں ڈالے گئے۔ ان کے دلوں نے خود اپنے تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں۔ دل اپنے اوپر خود ہی تالے ڈال لیتا ہے۔ جب صورت یہ ہے تو ان تالوں کو کوئی بیرونی طاقت کیسے کھول سکتی ہے۔ انہیں اسے خود ہی کھولنا ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص اپنے کمرے میں بیٹھا ہے اور اس نے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے۔ خود ہی کنڈی لگا رکھی ہے اور خود ہی روتا ہے کہ میں باہر کیسے نکلوں؛ اس سے کہا جائے گا کہ میاں! تم نے خود ہی اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے۔ اسے تم خود ہی کھول سکتے ہو۔ باہر سے تمہاری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ کنڈی کھولو اور باہر نکل آؤ۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱/۵ نیز ۹/۵۱ ؛ ۹/۲۷)۔ جب انہوں نے ٹیڑھی روش اختیار کر لی تو خدا (کے قانونِ مکافات) نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ جب انہوں نے دروازہ بند کر لیا تو باہر نکلنے کا راستہ ان پر مسدود ہو گیا۔

اپنے اعمال ہی زنگ بن جاتے ہیں

اور اس باب میں حرفِ آخر سورۃ التطفیف کی وہ آیت جلیلہ ہے جس نے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ کے نکتے کو واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۸۳/۱۴)۔

نہیں؛ بات یوں نہیں جس طرح یہ لوگ سمجھتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کے اپنے اعمال ہی

ان کے دلوں پر زنگ بن کر جم جاتے ہیں۔

دلوں پر جو مہریں لگتی ہیں وہ انسان کے اپنے ہی غلط اعمال ہوتے ہیں۔

(۴) مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ

جس کا جی چاہے ایمان لائے ــ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے

انسانی اختیار و ارادہ کے متعلق، اس سے پہلے، ایک الگ باب میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ لیکن، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں قرآنِ کریم نے اس ضمن میں جو کچھ کہا ہے اسے خصوصیت سے سامنے لے آئیں تاکہ اس باب میں کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔

(۱) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ج فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ج لَا انْفِصَامَ لَهَا ط..... (۲/۲۵۶)۔

دین کے معاملہ میں کسی قسم کی زبردستی نہیں۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط راستے نکھر اور ابھر کر الگ الگ ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ اب جو شخص غیر خداوندی راہوں سے منہ موڑ کر خدائی راہ نمائی اختیار کر لے گا، وہ ایک ایسا سہارا تھام لے گا جو اسے کبھی دغا نہیں دے گا۔ یہ سر رشتہ ٹوٹنے گا نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب دین کے معاملہ میں جور و اکراہ نہیں، کوئی زبردستی نہیں، اسے انسان کے اختیار و انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے، تو سب سے پہلے ضروری ہے کہ خود خدا کی طرف سے بھی اس باب میں کوئی زبردستی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کی بھی وضاحت کر دی۔ حضورؐ نبی اکرم، ایک مشفق ناصح کی طرح دل و جان سے چاہتے تھے کہ لوگ تباہی سے بچ جائیں اور کسی طرح ایمان لے آئیں۔ اللہ تعالیٰ نے، حضورؐ کو مخاطب کر کے فرمایا، کہ اگر ہماری مشیت ایسی ہوتی کہ لوگ طوعاً و کرہاً ایک ہی راستے پر چلتے، کوئی حق و صداقت سے انکار نہ کرتا، تو ہمارے لئے ایسا کرنا کونسا مشکل تھا۔ ہم انہیں (دیگر اشیائے کائنات

کی طرح) مجبور پیدا کر دیتے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ جب ہم نے ایسا نہیں کیا تو اے رسولؐ! کیا تو چاہتا ہے کہ تو انہیں کسی نہ کسی طرح مجبور کر دے کہ یہ ایمان لے آئیں۔ دین میں اکراہ کا کوئی دخل نہیں۔ وہ ایمان ہی نہیں جو جبراً لایا جائے (۱۰/۹۹)۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارے رب کی طرف سے حق تمہارے پاس آچکا ہے۔ اب تم میں سے جو شخص صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا، جو غلط راستے پر چلے گا، اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا۔ تو ان پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا کہ ان سے زبردستی اعترافِ حقیقت کرالے۔ (۱۰/۱۰۸)۔ یہ وہ حقیقت ہے (یعنی یہ کہ اگر خدا کی مشیّت میں ایسا ہوتا کہ تمام نوعِ انسان مجبوراً ایک ہی راہ پر چلیں، تو وہ انہیں پیدا ہی اس طرح کر دیتا) جس کا علم ہر مومن کو ہونا چاہیئے۔ (۱۱/۱۱۸؛ ۱۳/۳۱؛ ۱۶/۹؛ ۱۶/۹۳؛ ۳۲/۱۳؛ ۴۲/۱۳)۔ حتیٰ کہ حضورؐ سے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے تو بہت ہی عزیز رکھے اور دل سے چاہے کہ وہ ایمان لے آئے، وہ ایمان لے ہی آئے (۲۸/۵۶)۔ ہم نے اس معاملہ میں انسان کو آزادی دی ہے لہٰذا تو بھی ان تک پیغامِ حق پہنچا دے اور پھر کہہ دے کہ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ جس کا جی چاہے ایمان لے آئے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ سورۂ الدھر میں ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اسے سماعت و بصارت عطا کر دی۔ پھر اسے راستہ دکھا دیا۔ اب ان میں سے جو چاہے اسے قبول کرلے۔ جس کا جی چاہے اسے مسترد کر دے۔ (۷۶/۳)۔ سورہ عبس میں ہے کہ قرآن ایک تذکرہ ہے ـــ یعنی اس صداقت اور حقیقت کی یاد دہانی جسے انسان بار بار بھلا دیتا ہے ـــ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ (۸۰/۱۱-۱۲)۔ سو جس کا جی چاہے اس سے، فراموش کردہ صداقتوں کو پھر سے اپنے سامنے لائے۔ سورۂ بلد میں ہے کہ وَ ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ ﴿۹۰/۱۰﴾۔ ہم نے اسے دونوں راستے واضح طور پر دکھا دیئے ہیں۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ﴿۷۳/۱۹﴾۔ سو جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف لے جانے والا راستہ اختیار کرلے۔ (نیز ۲۵/۵۷)۔

خدا نے انسان کو آنکھیں دے دیں۔ باہر روشنی کا انتظام کر دیا۔ غلط اور صحیح دونوں راستے متمیّز طور پر اس کے سامنے رکھ دیئے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا کہ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِہٖ ۚ وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْھَا (۶/۱۰۵)۔ جو کوئی آنکھیں کھول کر چلے گا اس کا فائدہ اس کو ہوگا۔ جو اندھا بن کر چلیگا وہ خود نقصان اٹھائے گا۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۷/۱۵)۔ یہاں کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ تم میں سے جو بھی صحیح راستے پر چلے گا وہ خوف و حزن سے

محفوظ رہے گا۔ (۲/۳۸ و ۲۰/۱۲۳)۔ اور اسے بھی سمجھ لو کہ اگر تم صحیح راستے پر چلو گے تو غلط راستے پر چلنے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ وہ خود اپنا ہی نقصان کریں گے (۵/۱۰۵)۔

مشرکین یہ کہتے تھے کہ ہم اپنے شرک کے لئے موردِ الزام نہیں۔ خدا کی مرضی ہی ایسی تھی کہ ہم شرک کرتے۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو ہم کس طرح شرک کر سکتے تھے۔ اس کے جواب میں کہا کہ یہ غلط کہتے ہیں۔ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ (۶/۱۴۹) ؛ (۳۵۔ ۱۶/۳۶ ؛ ۴۳/۲۰)۔ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ٥ (۶/۱۴۱)۔ یہ خود گمراہ ہوتے ہیں، صحیح راستہ اختیار نہیں کرتے اور الزام دھرتے ہیں خدا پر!

البتہ یہ درست ہے کہ جس طرح خدا کسی کو زبردستی گمراہی کے راستے پر نہیں ڈالتا، انسان خود وہ راستہ اختیار کرتا ہے اسی طرح، جو شخص غلط راستہ اختیار کرتا ہے، خدا زبردستی اُسے صحیح راستے پر بھی نہیں لگاتا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ (۱۶/۳۷)۔ "جو گمراہ رہنا چاہے خدا اسے ہدایت نہیں دیتا۔

خدا تو کسی کو گمراہ نہیں کرتا، البتہ مذہبی پیشوا، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ...... قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا (۵/۷۷)۔ یہ لوگ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ (نیز ۶/۱۴۵)۔ اس طرح، غلط روش پر چلنے

مذہبی پیشوا

والوں کا ایک جتھہ یا قافلہ بن جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے غلط معتقدات کو اور مضبوط اور محکم کرتے چلے جاتے ہیں۔ (۷/۲۰۲)۔ اور یوں، اس غلط رَو قافلہ کا کارواں سالار انہیں اس منڈی میں جا اتارتا ہے جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا یعنی جہنم میں۔ (۲۸۔ ۱۴/۲۹)۔

بہر حال، یہ سب کچھ انسان ہی کرتے ہیں۔ خدا نہ زبردستی کسی کو گمراہ کرتا ہے اور نہ ہی زبردستی کسی کو راہِ راست پر لاتا ہے۔ اس کے ہاں قانون یہ ہے کہ

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ قف فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)

تمہارے ربّ کی طرف سے حق آ گیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

اور اسی " مَنْ شَآءَ " سے ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔

مَنْ یَّشَآءُ

—— جسے چاہے —— یا —— جو چاہے؟ ——

قرآن کریم میں جہاں عمومی طور پر مَنْ یَّشَآءُ آیا ہے، اس کے متعلق اصولی گفتگو اس سے پہلے کی جا چکی ہے. اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں جہاں مَنْ یَّشَآءُ آیا ہے اس سے کیا مراد ہے.

جو کچھ گذشتہ صفحات میں کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) ہدایت اور ضلالت انسان کے اپنے اختیار میں ہے. یعنی جس کا جی چاہے سیدھا راستہ اختیار کر لے اور جس کا جی چاہے غلط راستے پر چلتا جائے.

(۲) سیدھا راستہ خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق اختیار کیا جا سکتا ہے. یعنی اس طرح کہ انسان آنکھیں کھول کر چلے، عقل و بصیرت سے کام لے، سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے. زندگی کے ہر دوراہے پر اچھی طرح دیکھ لے کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اور ٹیڑھا کونسا. آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے نہ چلتا جائے. یہ ہے وہ قانونِ مشیّت جس کے مطابق انسان صحیح راستہ اختیار کر سکتا ہے. ان تصریحات کے بعد متعلقہ قرآنی آیات کو دیکھئے. سورۂ بقرہ میں ہے کہ ابتداءً انسان ایک برادری (امّتِ واحدہ) کی طرح زندگی بسر کرتے تھے. پھر ان میں اختلافات رونما ہوئے جن کے رفع کرنے کے لئے خدا نے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا —— انبیاء بھیجے اور ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں جو لوگ ان کی صداقت پر ایمان لے آئے، اللہ نے انہیں ہدایت دے دی. اس کے بعد ہے. وَ اللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○ (۲/۲۱۳). جو شخص بھی ہدایت لینا چاہے اُسے خدا کے سلسلۂ ہدایت کی رُو سے ہدایت مل جاتی ہے. ان رسولوں کے ذمے پیغاماتِ خداوندی کا پہنچا دینا ہوتا تھا. (۵/۹۹ ؛ ۳/۱۹) انہیں راہِ راست پر لگا دینا نہیں. چنانچہ رسول اللہ سے کہا گیا کہ لَیْسَ عَلَیْكَ ھُدٰھُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط (۲/۲۷۲). تیرے ذمے یہ نہیں کہ تو انہیں صحیح راستے پر چلائے. خدا صحیح راستے پر اسے ہی چلائے گا جو خود اس راستے پر چلنا چاہے. (نیز ۲۸/۵۶). وَ اللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ وَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۰/۲۵) -

خدا سلامتی کے راستے کی طرف آنے کے لئے دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد جو شخص بطیبِ خاطر، صحیح راستہ اختیار کرنا چاہے اسے اس کی طرف راہ نمائی مل جاتی ہے۔ یہ دعوت (من جانب اللہ) رسولوں کی وساطت سے ملتی تھی۔ جو شخص ان کی دعوت پر لبیک کہتا تھا اسے صحیح راستے کی طرف راہ نمائی مل جاتی تھی۔ (۱۴/۴)۔ رسول، یہ دعوت، خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی (آیات) کی بنا پر دیتے تھے۔ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ○ (۲۲/۱۶)۔ اس مقصد کے لئے خدا کی طرف سے واضح قوانین نازل ہوتے تھے۔ یوں خدا ہر اس شخص کو ہدایت دیدیتا ہے جو ہدایت لینے کا ارادہ کرے۔ اسی کو دوسری جگہ نور کہہ کر پکارا ہے (۲۴/۳۵ ؛ ۲۴/۴۰ ؛ ۲۴/). سورۂ زمر میں اُسے کتاب منزل من اللہ کہا گیا ہے۔ (۳۹/۲۳)۔ سورۂ فاطر میں ہے کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی تاریکی اور روشنی یا دھوپ اور سایہ یکساں ہو سکتے ہیں۔ نہ ہی مردہ اور زندہ برابر ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ اے رسول! تو مُردوں کو سنا نہیں سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ (۱۹-۲۲/۳۵)۔ خدا بھی انہی کو سناتا ہے جو سُننا چاہیں۔ "جو سُننا چاہیں" کا مطلب ہے وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳/۲۷)۔ جو اس مقصد کے لئے خدا کی طرف رجوع کرے۔ اس کے برعکس، جو اس طرف توجہ ہی نہ دے، وہ ہدایتِ خداوندی سے کس طرح مستفید ہو سکتا ہے؟

یہ ہے خدا کا قانونِ مشیت جس کے مطابق جس کا جی چاہے ہدایت حاصل کرلے۔ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا اسے ہدایت نہیں مل سکے گی۔ سورۂ انعام میں ہے وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَ مَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (۶/۳۹)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں، وہ بہرے گونگے بن کر اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ انہیں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ راہنمائی اُسے ملتی ہے، جو خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق راہ نمائی لینا چاہے۔

سورۂ ابراہیم میں، غلط اور صحیح نظریۂ زندگی کو شجرِ خبیث اور شجرِ طیب کی مثال سے سمجھایا ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ صحیح نظریۂ زندگی پر ایمان لاتے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں ثبات و استقامت نصیب ہوتی ہے۔ وَ يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ـــ اور ظالمین کو خدا کی راہنمائی نہیں ملتی ـــ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جو لوگ ظلم و استبداد کی روش نہ چھوڑنا چاہیں، ان پر کامیابی کی راہیں کیوں نہیں

کشادہ ہوتیں؟ کہا کہ یَفْعَلُ اللّٰہُ مَا یَشَآءُ (۱۴/۲۷)۔ یہ خدا کا قانونِ مشیّت ہے جسے اس نے اپنے اختیارِ مطلق سے بنایا ہے۔ تم یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ قانون ایسا کیوں ہے؟ یہ قانون ایسا ہے۔ تم اس کے مطابق چلو گے تو نجات و سعادت کی راہیں تم پر کشادہ ہوتی جائیں گی۔ اس کی خلاف ورزی کرو گے تو یہ راستے بند ہو جائیں گے۔

سورۂ فاطر میں ہے کہ جو شخص غلط کام کرے اور وہ اسے سہانے بن کر دکھادیں۔ وہ اس فریب میں مبتلا رہے کہ میں بہت اچھے کام کر رہا ہوں اس لئے اس راستے کو چھوڑنا نہ چاہیے، تو اس پر بھی کامیابی کی راہیں کشادہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ بھی خدا کا قانونِ مشیّت ہے۔ حضورؐ سے کہا گیا کہ جو لوگ اس طرح فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر تباہ ہونا چاہیں۔ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ط تو ان کی حالت پر تاسّف کر کے اپنی جان مت گھلا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ o (۳۵/۸) خدا ان کے اس مصنوعی کاروبار کی حقیقت سے باخبر ہے۔

(جیسا کہ ایک مقام پر پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) ظہورِ اسلام کے وقت، بعض دلوں میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ اگر ان مخالفین کو معجزات دکھا دیئے جائیں تو یہ ایمان لے آئیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ خدا کا قانونِ مشیّت یہ نہیں۔ اس کا قانونِ مشیّت یہی ہے کہ لوگ عقل و فکر اور علم و بصیرت کی رُو سے قلب و دماغ کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ، صداقت کو تسلیم کریں جسے ایمان لانا ہو گا وہ اس قانون کے مطابق ایمان لائے گا۔ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ o (۶/۱۱۲)۔ جہالت کی رُو سے ایمان نہیں لایا جا سکتا۔

اسی طرح، سورۂ مدثر میں کہا کہ خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق کامرانی و شادکامی کی راہیں اس پر کشادہ ہوتی ہیں جو اس کے قانون کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھے۔ جو شکوک و شبہات سے منافقت کی زندگی بسر کرے، اسے صحیح منزل کی طرف راہ نمائی نہیں مل سکتی۔ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (۷۴/۳۱)۔ اس طرح خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق جو چاہے صحیح راستہ اختیار کرلے، جس کا جی چاہے غلط راہوں پر چلتا جائے۔

یہی مفہوم ان آیات کا جن میں کہا گیا ہے کہ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ (۷/۱۵۵)۔ بارِ الٰہا! ہدایت و ضلالت تیرے قانونِ مشیّت کے ساتھ مشروط ہے۔ سورۂ

شوریٰ میں رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ ہم نے تجھے منصبِ نبوت سے سرفراز کیا جو یکسر وہبی ملکہ ہے۔ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اور یقیناً تو اس کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی صراطِ مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ لیکن تیرا کام صرف راستہ بتانا ہے، راستہ پر چلانا نہیں۔ نَهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲/۵۲)۔ اس قرآن کے ذریعے ہم اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق اپنے بندوں کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ اور وہ قانونِ مشیّت یہ ہے کہ ہدایت اسے ملتی ہے جو ہدایت لینے کا خواہاں ہو۔

اور آخر میں ہم سورۂ نحل کی وہ آیت درج کرتے ہیں جو اس باب میں گویا قولِ فیصل ہے۔ فرمایا۔ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر خدا کی مشیّت میں ایسا ہوتا تو وہ تمام انسانوں کو ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وَ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۶/۹۳) ـ اگر آیت کے پہلے حصے (يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ .....) کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، تو اس کے بعد جو کہا کہ (لَتُسْئَلُنَّ.....) "یقیناً تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیسے کام کئے تھے۔" یہ نہ صرف بے معنی ہوگا بلکہ ایک دوسرے سے متضاد بھی۔ اگر حقیقت یہ ہو کہ خدا جسے چاہے ہدایت دے، جسے چاہے گمراہ کر دے، تو پھر لوگوں سے باز پرس کیسی؟ باز پرس تو اسی سے ہو سکتی ہے جو اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ کرے۔

لہٰذا، آیت کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی اگر خدا کی مشیّت میں ایسا ہوتا کہ سب انسان ایک ہی روش پر چلیں، تو وہ انہیں (دیگر مخلوق کی طرح) مجبور پیدا کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار پیدا کیا تاکہ جس کا جی چاہے صحیح راستہ اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے غلط راستے پر چلتا رہے۔ انسان کا یہی اختیار و ارادہ ہے جس سے یہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اسی لئے اس سے باز پرس ہوگی کہ تو نے فلاں کام ایسا کیوں کیا تھا؟ اعمال کی یہی ذمہ داری تھی جس سے بچنے کے لئے ابلیس نے خدا سے کہا تھا کہ میں نے معصیت نہیں کی ــ اَغْوَيْتَنِيْ ــ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے۔ (۷/۱۶؛ ۱۵/۳۹)۔ اپنی ذمہ داری سے یہی گریز اور فرار ہے جس سے ابلیس راندۂ درگاہ ہوگیا۔ جو خود مجبور بنتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار خدا کو قرار دیتا ہے، وہ قرآن کے ارشاد کے مطابق

ابلیسی روش اختیار کرتا ہے۔

نگہ باز گشت

جن الفاظ سے ہم نے زیرِ نظر باب کا آغاز کیا تھا، انہیں ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی مَنْ یَہْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَ مَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ۔ اور ان کا یہ ترجمہ بھی کہ جس شخص کو خدا ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے خدا گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ اس ترجمہ سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ، نہ صرف یہ کہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی اس قسم کا تاثر یا تصور صحیح نہیں۔ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قرآنِ کریم کی کسی ایک آیت کو، دیگر متعلقہ مقامات سے الگ کر کے، اس کے لفظی ترجمہ سے، نہ صرف یہ کہ بات واضح نہیں ہوتی بلکہ اس سے الٹی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ موضوع

قرآن فہمی کا صحیح طریقہ

کے متعلق قرآنِ کریم میں جہاں جہاں، جو کچھ آیا ہے، اسے سامنے رکھ کر یہ سمجھا جائے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ اور پھر اس کی اس بنیادی تعلیم کی رُو سے، متعلقہ آیات کا (ترجمہ نہیں بلکہ) مفہوم متعین کیا جائے[1]۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ انسانی زندگی کے سلسلہ میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فاعل قرار دیا ہے۔ (یعنی یہ کہا ہے کہ خدا ایسا کرتا ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور جب قرآنِ کریم سے یہ بھی متعین کر لیا جائے کہ اس باب میں خدا کا قانونِ مشیت کیا ہے، تو پھر بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں چند ایک آیات پر پھر غور کیجئے۔ مثلاً

(۱) سورۂ بنی اسرائیل میں ہے۔ وَ مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ۔ وَ مَنْ یُّضْلِلْ

---

[1] میں نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن کو اسی اصول کے مطابق مرتب کیا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُوْنِہٖ...... (۱۷/۹۷)۔ عام ترجمہ اس کا یہ ہے۔ "جسے خدا ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہوگا اور جسے وہ گمراہ کردے، تو خدا کے سوا اس کا کوئی کارساز نہیں ہوسکتا۔ قیامت کے دن ہم اسے اوندھے منہ، اندھا، بہرہ، گونگا بنا کر اٹھائیں گے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنّم ہوگا..... آپ دیکھیں گے کہ اس آیت کو، دیگر متعلقہ مقامات سے، الگ کرکے دیکھنے سے کتنی بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے لیکن اس سے اگلی ہی آیت میں ہے۔ ذٰلِکَ جَزَآؤُھُمْ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا ..... (۱۷/۹۸)۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہمارے قوانین سے انکار کیا اور ان سے سرکشی برتی تھی۔

اس سے بات صاف ہوگئی کہ جو شخص قوانینِ خداوندی سے انکار کرتا ہے وہ گمراہ ہوجاتا ہے۔ یہ خدا کا قانونِ مشیّت ہے۔ لہٰذا، مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لے آئے، اسے خدا کی رہنمائی حاصل ہوجاتی ہے۔ جو ان سے انکار کردے، اس کے سامنے صحیح راستہ نہیں آسکتا۔

(اس سلسلہ میں آیات (۷/۱۷۸؛ ۱۷/۱۸؛ ۳۹/۳۷) بھی ملاحظہ فرمائیے)۔

قرآنِ کریم میں خدا کے لئے اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی آتا ہے۔ یعنی خدا کے حسین ترین بہترین نام۔ اس سے مراد وہ صفاتِ خداوندی ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اس جہت سے آپ نے اکثر جگہ خدا کے ننانوے نام لکھے دیکھے ہوں گے۔ بعض جگہ ان میں اَلْمُضِلُّ (یعنی گمراہ کرنے والا) بھی درج ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم

خدا کا ایک نام۔ اَلْمُضِلُّ

میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام تو نہیں آیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسے ان آیات سے مستنبط کیا گیا ہے جن میں مَنْ یُّضْلِلْ قسم کے الفاظ آئے ہیں۔ ان الفاظ، یا جن آیات میں اس قسم کے الفاظ آئے ہیں، ان کا صحیح مفہوم آپ کے سامنے آچکا ہے اس مفہوم کے پیشِ نظر، ہم سمجھتے ہیں کہ خدا کو اَلْمُضِلُّ (گمراہ کرنے والا) ہرگز نہیں کہنا چاہیئے۔ وہ تو اَلْھَادِیْ (ہدایت دینے والا) ہے۔ اور جو الھادی ہو وہ المضل کیسے ہوسکتا ہے۔ قرآنِ کریم

ایسا نہیں کہنا چاہیے

میں مُضِلٌّ (گمراہ کرنے والا) شیطان کو کہا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے قبطی کو مکّہ مار کر ڈھیر کردیا تو اس کے بعد کہا کہ ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ ٥ (۲۸/۱۵)۔ یہ تو شیطان کا کام ہے۔ بے شک وہ (انسان کا) دشمن اور کھلا ہوا مُضِلٌّ "گمراہ کرنے والا" ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴/۶۰)۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ

لوگوں کو دُور کی گمراہی میں پھینک دے۔ ظاہر ہے کہ جس کام (گمراہ کرنے) کو قرآن، شیطان کا عمل قرار دے، اسے (معاذ اللہ) خدا کی طرف کیسے منسوب کیا جا سکتا ہے؟ لہذا اس قسم کی آیات کا ایسا ترجمہ بھی نہیں کرنا چاہیئے جس سے خدا "گمراہ کرنے والا" قرار پائے۔

اسی طرح ان ننانوے ناموں میں، اَلْمُعِزُّ (عزت دینے والا) کے ساتھ اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا)۔ یا اَلنَّافِعُ کے ساتھ الضَّآرُّ (نقصان پہنچانے والا) بھی شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ جن آیات سے اس قسم کے ناموں کو مستنبط کیا جاتا ہے، ان کا صحیح مفہوم سامنے آنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خدا نہ کسی کو یونہی ذلیل کرتا ہے اور نہ نقصان پہنچاتا ہے۔ ذلت اور ضرر انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اس لئے انسب ہے کہ اس قسم کے ناموں کو اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کی فہرست میں شامل نہ کیا جائے۔

(سورۂ انعام میں ہے۔ مَنْ یَّشَاِ اللّٰہُ یُضْلِلْہُ وَ مَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۶/۳۹)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے ــــ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ یہ ترجمہ بہت بڑی غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی، خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ملتی ہے۔ اس کے مطابق جو شخص چاہے صحیح راستہ اختیار کر لے، جو چاہے غلط راستے پر گامزن رہے۔ وہ قانونِ مشیّت کیا ہے؟ اس کی وضاحت اس آیت کے ابتدائی الفاظ میں یوں کر دی کہ وَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُکْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ (۶/۳۹)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی تکذیب کرتے ہیں، وہ بہرے اور گونگے بنکر تاریکیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

(۳) سورۂ الرّوم میں ہے۔ فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ــــ جسے خدا گمراہ کر دے اُسے کون ہدایت دے سکتا ہے ــــ لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں۔ اس کا مفہوم آیت کے ابتدائی الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے جن میں کہا گیا ہے۔ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ (۳۰/۲۹)۔ یہ ظالم، بغیر علم و بصیرت، اندھا دھند اپنے حیوانی جذبات کا اتباع کئے چلے جاتے ہیں۔ اب سوچو کہ جو شخص قانونِ خداوندی کی رُو سے اس طرح غلط راستوں پر چلتا جائے، اسے کون راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

(۴) سورۂ توبہ میں ہے کہ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ ھَدٰىھُمْ حَتّٰی

يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ۝ (۹/۱۱۵)۔ یہ خدا کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ لوگوں کی طرف اپنی راہ نمائی (کتاب) بھیجدے اور اس طرح یہ واضح کر دے کہ انہیں کن امور سے بچنا چاہیئے اور اس کے بعد انہیں یونہی گمراہ کر دے۔ اس نے اگر لوگوں کو گمراہ کرنا ہوتا تو ان کی طرف ہدایت کے ضابطے کیوں بھیجتا۔

(۵) سورۂ انعام میں ہے۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ...... فِي السَّمَآءِ (۶/۱۲۶)۔ اس کا لفظی ترجمہ یوں کیا جاتا ہے ــ خدا جس شخص کو ہدایت دینے کا ارادہ کرے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ کرے اس کا سینہ یوں تنگ کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان کی بلندیوں کی طرف چڑھ رہا ہے۔ اس سے پہلے آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے سامنے جب قوانینِ خداوندی پیش کئے جاتے ہیں تو وہ کٹ حجتیاں کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ مجرم جنہیں ذلّت آمیز سزا ملتی ہے ــ اسی تسلسل میں مندرجہ بالا الفاظ آئے ہیں اور ان الفاظ کے بعد کہا ہے۔ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (۶/۱۲۶) ــ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان نہیں لاتے ان پر حقیقت مشتبہ رہ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانی قلب کا خدائی راہ نمائی کے لئے کشادہ ہو جانا، ایمان کا ثمرِ طیب ہے۔ اور اس کا بھنچ جانا، انکار و جحود کا لازمی نتیجہ۔ چونکہ یہ کچھ، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے ہوتا ہے، اس لئے خدا نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ قلب کی بست و کشاد انسان کے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے ــ جو شخص ایمان لانے کے بعد، پھر کفر کی طرف پلٹ جائے؟ اس پر عذابِ عظیم وارد ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ اس شخص کے متعلق نہیں کہا گیا جس کا قلب، ایمان پر مطمئن ہو لیکن اس سے کفر کا کوئی کام زبردستی کرا دیا جائے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا گیا ہے۔ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا (۱۶/۱۰۶)۔ جو کفر کے لئے اپنا سینہ کھول دے۔ دیکھئے! یہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ انسان، کفر (اور ایمان) کے لئے اپنا سینہ خود ہی کھولتا اور بند کرتا ہے۔ خدا، اپنی کتاب کے ذریعے راہِ ہدایت نمایاں کر دیتا ہے۔ جو اپنے سینے کی کشادگی سے، اسے اپنے قلب میں سمو لیتا ہے، اس پر کامیابیوں کی راہیں واہ ہو جاتی ہیں۔ جو اپنے دل کے دروازے بند کر لیتا ہے، وہ ان سعادتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ (۳۹/۲۳-۲۲)۔ اس طرح خدا

ہر اس شخص کے سامنے کامیابیوں کے راستے کشادہ کر دیتا ہے جو کامیابیاں حاصل کرنا چاہے جو ایسا نہ چاہے، اس پر یہ دروازے بند رہتے ہیں۔ اور جس پر یہ دروازے، خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق بند رہیں، اُسے کوئی بھی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا۔ جو شخص خود ہی اپنی آنکھیں بند کر لے اسے کون بینائی عطا کر سکتا ہے!

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ (۱۶/۳۷)۔

جو خود ہی گمراہ رہنا چاہے اسے خدا (زبردستی) ہدایت نہیں دیتا۔

دوسری طرف۔

وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (۲۹/۶۹)۔

جو لوگ ہمارے بارے میں سعی و کاوش اور جد و جہد کرتے ہیں، ہم ان کی راہنمائی اپنے راستوں کی طرف کرتے جاتے ہیں۔

وَ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ

بارھواں باب

رِزق خُدا کے ہاتھ میں ہے؟

اب ہم اپنے سفر کی اس منزل میں داخل ہو رہے ہیں جہاں جبر کا عقیدہ سب سے زیادہ تباہ کن نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ "رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے غریب کر دے۔ انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لہذا امیروں کی دولت کی طرف دیکھ کر کبھی دل میں کڑھنا نہیں چاہیئے، نہ ہی یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ان کی دولت ہمیں مل جائے۔ ایسا خیال کرنا، خدا کے خلاف شکایت کرنا ہے۔ اس کے فیصلے کے خلاف چیلنج ہے۔ یہ کفر ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے۔ وہ جس حال میں رکھے، انسان کو مطمئن رہنا چاہیئے۔ راضی برضا رہنا ہی خدا کے بندوں کا شعار ہے۔ قناعت بڑی دولت ہے۔ توکّل کا بڑا درجہ ہے۔ غریبی خدا کو پسند ہے۔ یہ دنیا مُردار ہے اور اس کا چاہنے والا کُتا ہے۔" اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گذرنا، ممکن ہے لیکن دولتمندوں کا آسمان کی بادشاہت میں داخلہ محال ہے۔ انبیائے عظامؑ، اولیائے کرام، مقربین بارگاہِ الٰہی، خدا کے برگزیدہ بندے، سب غریب تھے۔ انہوں نے غریبی کو اپنے لئے پسند کیا تھا۔ الفقر فخری خود شاہنشاہِ کونین سرورِ کائناتؐ کا ارشاد ہے جس کی رُو سے آپؐ نے فرمایا ہے غریبی میرے لئے باعثِ فخر ہے ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اسلام شروع میں بھی غریبوں میں آیا اور آخر میں بھی غریبوں میں فروغ پائے گا۔ حضرت بابا فرید گنج شکر (رحمۃ اللہ علیہ) سے ان کے ایک مرید نے غریبی کی

مفلسی کی شان میں قصیدے

شکایت کی تو آپ اسے ایک دن ایک تالاب کی طرف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ جو بھیڑیں پانی پی کر سیر ہو چکی تھیں، وہ آرام سے لیٹی خرّاٹے لے رہی تھیں اور پیاسی بھیڑیں دوڑ دوڑ کر پانی کی طرف آ رہی تھیں۔ آپ نے اپنے اُس مرید سے کہا کہ بیٹا! تم نے امیری اور غریبی کا فرق دیکھ لیا۔ جو سیر ہو جاتا ہے وہ خدا کی طرف سے مُنہ موڑ کر غافل ہو جاتا ہے۔ جسے محتاجی رہتی ہے وہ دوڑ دوڑ کر خدا کی طرف جاتا ہے۔ اس قسم کے قصّے کہانیاں ہر مجلسِ وعظ اور ہر محفلِ ارشاد میں عوام کو سنائی جاتی ہیں اور غریبوں کو تھپک تھپک کر سلایا جاتا ہے کہ ان کی نگاہ کہیں اس طرف کو نہ اٹھنے پائے کہ ان امراء کے محلات کی فلک بوس عمارتیں انہی (غریبوں اور مفلسوں) کی ہڈیوں کے چونے سے استوار ہوتی ہیں اور ان کے عشرت کدوں کی رنگینیاں انہی کے خون کی رہینِ منت ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قسم کے معتقدات کس دَور کی پیداوار ہیں اور کن دماغوں کی تخلیق۔ اور ستم بالائے ستم کہ، ہر باطل عقیدے کی طرح، ان عقائد کی تائید میں بھی قرآنی آیات پیش کر دی جاتی ہیں۔ اے وائے!

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
"تن بہ تقدیر" ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو، ناخوب، بتدریج وہی، خوب ہُوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

آئیے دیکھیں کہ جس قرآن نے، مومن کو مہ و پروین کا امیر بنایا تھا، اس کی اس باب میں تعلیم کیا ہے؟

رزق کے معنی سامانِ زیست کے ہیں۔ یعنی ہر وہ شے جس پر انسان کی زندگی کا دار و مدار ہے، قرآنِ کریم میں اس کے لئے، رزق کے علاوہ، فضل اور معاش کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

رزق کی کیفیت ہدایت کی سی ہے جس کے متعلق ہم تفصیلی طور پر سابقہ باب میں دیکھ آئے ہیں یعنی خدا نے انسان کو پیدا کیا تو ساتھ ہی کہہ دیا کہ دنیا میں غلط اور صحیح راستے کو نمایاں طور پر الگ الگ کر کے دکھا دینا ہمارے ذمے ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنی طرف سے ضوابطِ ہدایت نازل کئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ دونوں راستوں کو متمیّز کر کے تمہارے سامنے رکھ دینا ہمارے ذمّہ تھا۔ اب یہ تمہارے اختیار میں ہے، کہ تم کونسا راستہ اپنے لئے منتخب کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے اس انتخاب میں ہم دخل نہیں دیں گے۔ تم میں سے جو غلط راستے پر چلنا چاہے، اس راستے کو اختیار کر لے۔

جو صحیح راستے پر چلنا چاہے' اسے منتخب کرلے۔

اسی طرح، خدا نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے تمہیں دنیا میں بھیجا ہے تو جس متاع و سامان پر تمہاری زیست کا دارومدار ہے' اسے ہم نے' پہلے ہی صفحۂ ارض پر مہیا کر دیا ہے۔ حرارت' روشنی' ہوا' پانی اور خوراک پر زندگی کا دارومدار ہے۔ ان سب کو تمھاری پیدائش سے بھی پہلے پیدا کر دیا۔ یہ مطلب ہے

سامانِ رزق خدا نے مہیا کر رکھا ہے

ہمارے اس کہنے کا کہ ـــــ تمہیں رزق ہم دیتے ہیں ـــــ لیکن جس طرح، ہماری ہدایت سے مستفید ہونے کے لئے تمہیں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے' اسی طرح ہمارے مہیا کردہ سامانِ نشوونما سے متمتع ہونے کے لئے بھی تمہیں خود سعی و کاوش کرنی ہوگی۔ اس کے لئے ہم نے کچھ قواعد و ضوابط مقرر کر دیئے ہیں۔ جو لوگ ان کے مطابق' کوشش کریں گے' انہیں سامانِ زیست میسر آجائے گا۔ جو ایسا نہیں کریں گے وہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی ماں کی چھاتیوں سے دودھ کے چشمے پھوٹ بہتے ہیں لیکن جو ماں بچے کو تنہا چھوڑ کر چلی جائے' وہ بلک بلک کر بھوک سے مر جاتا ہے۔ اس کے حلق میں ہم دودھ کا قطرہ تک نہیں ٹپکاتے۔ پھر ہمارے اس انتظام کی کیفیت یہ ہے کہ شروع شروع میں بچے کا ہاضمہ نازک اور کمزور ہوتا ہے تو' ماں کے دودھ میں دہنیت (FAT) کی مقدار کم ہوتی ہے اور مایئت (پانی) کی زیادہ ـــــ یعنی دودھ پتلا ہوتا ہے۔ جوں جوں بچے کی عمر کے ساتھ اس کا ہاضمہ توانا ہوتا جاتا ہے' اس کی ماں کا دودھ' اسی نسبت سے' گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے' حتیٰ کہ جب بچے کے دانت نکل آتے ہیں اور اس کا نظامِ ہضم' دوسری قسم کی غذا ہضم اور جذب کرنے کے قابل ہو جاتا ہے' تو دودھ کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ اب بچے کی خوراک کے لئے' اس کے والدین کو خود کوشش کرنی پڑتی ہے۔ یہ تو "خدا کے دیئے ہوئے رزق" سے متمتع ہونے کی انفرادی مثال ہے۔ اجتماعی طور پر دیکھئے تو رزق کے خزانے زمین میں مدفون دستور ہیں۔ انہیں وہاں سے' خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق نکالنا اور حاصل کرنا ہوتا ہے (انہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے) اس سلسلہ میں پہلا مرحلہ' اپنی سعی و کاوش سے رزق پیدا یا حاصل کرنے کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ انسان کی تمدنی زندگی کا ہے جس میں' پیدا یا حاصل کردہ رزق کی تقسیم کا سوال سامنے آتا ہے ـــــ اور یہی وہ مقام ہے

رزق کی تقسیم کا مسئلہ

جہاں اس مسئلہ میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے حل کرنے کے لئے خدائی راہ نمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر رزق کی تقسیم، ہدایتِ خداوندی کے مطابق کی جائے (جسے نظامِ ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے) تو ہر انسان کو اطمینان اور عزت کے ساتھ سامانِ رزق بیسر آتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ تقسیم، انسانوں کے خودساختہ قوانین ونظام کے تحت رہے تو پھر یہ دنیا جہنم بن جاتی ہے۔ (جیسا کہ آجکل ہو رہا ہے)۔ آیئے ہم دیکھیں کہ ان تینوں گوشوں کے متعلق قرآنِ کریم کیا تعلیم دیتا ہے۔

---

(۱) وَاللّٰہُ یَرْزُقُکُمْ

اللہ تمھیں رزق دیتا ہے۔

رزق دینے کی ذمہ داری

رزق کی ذمہ داری کے متعلق فرمایا۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا........ (۱۱/۶)۔ صفحۂ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ دوسرے مقام پر انسان اور دیگر مخلوق کی الگ الگ تصریح کر دی۔ (۲۹/۶۰)۔ سورۂ روم میں ہے۔ اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ (۳۰/۴۰)۔ اللہ وہ ہے جو تمہیں پیدا کرتا ہے اور رزق دیتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ (۶/۱۵۲؛ ۱۷/۳۱)۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ یہاں اس امر کی ایک بار پھر تصریح کر دی جائے کہ خدا کی اس ذمہ داری سے مراد یہ نہیں کہ وہ انسان اور دآبّۃ کو براہِ راست رزق دیتا ہے۔ اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا کہ (دیگر مخلوق کو تو چھوڑیئے) ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جاتے ہیں۔ ویسے بھی آجکل حالت یہ ہے کہ دنیا میں آدھی آبادی کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اس سے (معترض کہے گا کہ) خدا اپنی اس ذمہ داری کو عجیب انداز سے پورا کرتا ہے کہ دنیا بھوکی مر رہی ہے اور وہ کچھ نہیں کرتا۔[1] جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، خدا کے رزق دینے سے

---

[1] خدا کی یہ ذمہ داری کس طرح انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے، اسکا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

مراد یہ ہے کہ اس نے سامانِ رزق پیدا کر دیا ہے۔ وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۱۰/۷؛ ۱۵/۲۰)۔ ہم نے تمہارا ٹھکانہ زمین میں بنایا اور اس میں تمہارے لئے سامانِ زندگی رکھ دیا۔

پیدائشِ رزق کا فطری نظام

زمین میں خوراک پیدا کرنے کی صلاحیت رکھ دی اور آسمان سے بارش برسائی اس طرح تمہارے لئے زیست کا سامان مہیا کر دیا۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۱۴/۳۲)۔ خدا نے ارض و سموٰت کو پیدا کیا۔ پھر وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے تمہارے لئے زمین کی فصلوں سے رزق مہیا کرتا ہے۔ کہیں کہا کہ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ (۳۵/۳)۔ وہ تمہیں زمین اور آسمان سے رزق دیتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ (مثلاً ۲/۲۲؛ ۱۰/۳۱؛ ۲۷/۶۴؛ ۳۴/۲۴؛ ۴۰/۱۳؛ ۴۵/۵؛ ۵۰/۱۱؛ ۵۱/۲۲؛ ۲۵–۳۲/۸۰)۔

کہیں کہا کہ اگر خدا رزق کے ان سرچشموں کو خشک کر دے تو بتاؤ تمہیں کون رزق دے سکتا ہے؟ (۶۷/۲۱؛ ۶۷/۳۰؛ ۶۳–۷۳/۵۶)۔ خدا کے سوا کسی اور میں اس کی قدرت ہی نہیں کہ وہ ذرائع رزق پیدا کر دے۔ (۱۶/۷۳؛ ۲۹/۱۷)۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا۔ نَحْنُ نَرْزُقُكَ (۲۰/۱۳۲) ہم تمہیں رزق دیتے ہیں۔ تم سے رزق مانگتے نہیں۔ (نیز ۵۱/۵۷)۔

زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت تو لامحدود ہے لیکن اس سے بیک وقت ایک خاص مقدار کے مطابق رزق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (۱۵/۲۱)۔ ہمارے ہاں ہر شے کے خزانے موجود ہیں۔ لیکن ان میں سے ہم ایک "قدرِ معلوم" کے مطابق ہی نیچے اتارتے (باہر لاتے) ہیں۔ "قدرِ معلوم" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ یعنی ایسے اندازے اور پیمانے جن کا علم دیا گیا ہے جنہیں انسان اپنی تحقیق و تدقیق سے دریافت کر سکتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے کہ یہ انتظام ہم نے اپنے قانونِ مشیّت (مَا يَشَآءُ) کی رُو سے کیا ہے۔ اور مصلحت اس میں یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور زمین سے رزق بغیر اندازے اور پیمانے کے نکلتا چلا جاتا، تو جو لوگ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جاتے وہ دنیا میں اودھم

مچادیتے۔ (۶۲/۲۷)۔

"قدرِ معلوم" سے یہ اشارہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ زمین میں رزق پیدا کرنے کی صلاحیت تو بے اندازہ ہے لیکن حصولِ رزق، انسان کے علم، صلاحیت اور محنت کے مطابق ہوگا۔ یہاں سے ہم ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔

(۲) رزق ملنے کی شرائط

خدا کے عطا کردہ رزق کے سرچشموں اور ان سے رزق حاصل کرنے کے لئے انسانی محنت اور کاوش میں باہمی تعلق کیا ہے، اسے سورۂ واقعہ میں بڑے بلیغ اور دلکش انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانونِ فطرت کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال لیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے۔ کیا یہ تم کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رُو سے ایسا ہوتا ہے؟

پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد اس کی حفاظت کون کرتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکار میں گئے۔

پھر تم اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دار و مدار بھی ہے۔ کیا اسے بادلوں سے تم برساتے ہو یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے؟ یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے۔ ذرا سوچو کہ اگر بارش کا پانی بھی ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟ حیرت ہے تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجہ تک کیوں نہیں

پہنچتے اور خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے، اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا، تمہاری کاریگری ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے۔

ہمیں نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے۔ (تمہاری اس میں صرف محنت ہوتی ہے)۔ ہم نے ان حقائق کو اس لئے بیان کیا ہے تاکہ یہ فراموش کردہ حقیقت تمہیں یاد آجائے کہ ہم نے یہ تمام انتظام، بھوکوں کو رزق دینے کے لئے کیا ہے۔　　　(مفہوم القرآن ۶۳-۷۳/۵۶)۔

انسانی زندگی کے ابتدائی ایام میں، خوراک مشتمل ہوتی تھی زمین کی عام پیداوار، یا شکار کے گوشت پر۔ اس کے بعد مصنوعات کا دور شروع ہوا۔ لیکن مصنوعات کی بنیاد بھی وہ خام مسالہ ہوتا ہے جو زمین سے پیدا ہوتا یا نکلتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی رزق کا اوّلین سرچشمہ زمین ہی قرار پاتی ہے۔

انسان کی تمدنی زندگی کے آغاز میں، تبادلہ اشیاء کا نظام (BARTER SYSTEM) تھا جس کی رُو سے، ضروریات کی چیزوں کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد انسان نے سکہ ایجاد کیا جس کی رُو سے، رزق (ضروریاتِ زندگی) چاندی سونے کے عوض خریدا جانے لگا۔ اس سے مال و دولت، حصولِ رزق کا ذریعہ بن گئے اور اسی سے وہ ساری پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ جنہیں جس قدر حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، وہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ (یہ ایک الگ موضوع ہے۔ ہم اس وقت کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اب) رزق کی اصطلاح میں، مال و دولت بھی شامل ہو گئے اور اکتسابِ رزق کے معنی زمین سے فصل پیدا کرنا ہی نہ رہے، بلکہ اس کے معنی دولت کمانا بھی ہو گئے۔

رزق کے مفہوم میں دولت بھی شامل ہو گئی

— حتیٰ کہ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ زمین سے رزق حاصل کرنے کا تصور پسِ پشت جا پڑا ہے اور مال و دولت کمانے کے تصور نے اوّلین اور بلند ترین جگہ لے لی ہے۔ اب امارت اور غربت کا پیمانہ روپیہ پیسہ قرار پا گیا ہے اور یہی، محنت کا معاوضہ مقرر کرنے کا معیار بن گیا ہے۔ چنانچہ، اب اکتسابِ رزق کی صلاحیت سے مفہوم ہوتا ہے روپیہ کمانے کی صلاحیت اور استعداد۔ اس "صلاحیت" میں انسان کی عقل و فکر، علم اور تجربہ، اقتصادی مہرہ بازیوں کی مہارت، اور سب سے

آخر، محنت سب شامل ہوتے ہیں ـــــ بلکہ بسا اوقات، محنت کا اس میں دخل ہی نہیں ہوتا ـــــ سرمایہ، اور اس کے استعمال کی شاطرانہ چالیں، دولت کمانے کا اوّلین ذریعہ قرار پاجاتی ہیں۔ اس موضوع کے متعلق ذرا آگے چل کر گفتگو کی جائے گی۔ اس وقت اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اب اکتسابِ رزق کا اوّلین مفہوم دولت کمانا ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ حصولِ رزق کے لئے، اس کی طلب و جستجو بنیادی شرط ہے۔ اُسے،

رزق کی طلب و تلاش

قرآن کی اصطلاح میں " ابتغاء فضل اللہ" کہا گیا ہے ـــــ یعنی خدا کی طرف سے عطا کردہ رزق کی تلاش۔ اس نے کہا ہے کہ دن اور رات کی گردش آیاتِ خداوندی میں سے ہے اور ان کو روشن اور تاباں اس لئے بنایا گیا ہے۔ لِتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۱۲/۱۷)۔ تاکہ تم اپنے رب کے فضل (رزق) کی تلاش کرسکو۔ (واضح رہے کہ ابتغاء صرف تلاش کو نہیں کہتے۔ اس میں ارادہ، تلاش اور حصول، سب شامل ہوتے ہیں)۔ رزق کی اس طلب و جستجو کے لئے کشتیوں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے، جو اس زمانے میں سامانِ رزق کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا بہترین ذریعہ تھیں۔ آج بھی ان کی افادیت کچھ کم نہیں۔ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ (۱۶/۱۴)۔ تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں کشتیاں کس تیزی سے تیرتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اللہ کے فضل (رزق) کی تلاش کرسکو۔ (نیز ۳۰/۴۶ ؛ ۳۵/۱۲ ؛ ۴۵/۱۲)۔ رزق کی اس طرح طلب اور تلاش، مومن اور کافر ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (۴۸/۲۹)۔ وہ اللہ کے فضل (رزق) کی طلب و جستجو کرتے ہیں۔ (رضوان کے متعلق بعد میں بتایا جائے گا)۔ یہی (۷۳/۲۰) میں کہا گیا ہے۔ بلکہ دوسری جگہ مومنین کو اس کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ جمعہ میں ہے کہ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (۶۲/۱۰)۔ جب تم صلوٰۃ سے فارغ ہوجاؤ تو پھر زمین میں منتشر ہوجاؤ اور خدا کے رزق کی تلاش کرو۔

اس طلب و جستجو کے نتیجہ میں، رزق، خدا کے مقرر کردہ قوانینِ فطرت کے مطابق ملے گا اور (جیسا کہ پہلے بھی کہا جاچکا ہے) قوانینِ فطرت میں مومن اور کافر کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں ہوتی۔ جو

شخص، قوانینِ زراعت کے مطابق زمین تیار کر کے کھیتی کرے گا، اس کی فصل اچھی ہوگی۔ خواہ وہ ہرنام سنگھ ہو یا عبدالرحمٰن ـــ یہ نہیں ہوگا کہ ہرنام سنگھ، طلب و جستجو کرے تو اس کے راستے میں بند لگا دیئے جائیں کہ تم اس سے آگے نہیں جا سکتے اور عبدالرحمٰن کے لئے راستے

اس میں کافر و مومن کی کوئی تخصیص نہیں

کھلے چھوڑ دیئے جائیں ـــ ایسا قطعاً نہیں ہوگا۔ دیکھئے، قرآن کریم اس حقیقت کو کس وضاحت سے بیان کرتا ہے جہاں کہتا ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ .... جو شخص دنیاوی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے، ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق جسے ہم نے اپنے اختیار و ارادہ سے بنایا ہے، اسے دنیاوی مفاد دے دیتے ہیں۔ (اس کے بعد ہے کہ آخرت میں اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس کی بابت بعد میں لکھا جائے گا)۔ وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ ـــ اور جو شخص (دنیاوی مفاد بھی لینا چاہتا ہے اور) اُخروی مفاد بھی اور اس کے لئے خدا کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھنے کے بعد، ان کے مطابق پوری پوری کوشش کرتا ہے، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَ هٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ ـــ رزق کا جو سامان ہم نے نوعِ انسانی کے لئے بطور عطیہ عام کیا ہے، اس کے حصول کے لئے، مومن اور کافر سب کو ہم، ان کی سعی و کاوش کے مطابق آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ○ (۱۷/۲۰-۱۸)۔ ان عطایائے خداوندی کے راستے میں پھاٹک نہیں لگا دیئے جاتے کہ کافر اس حد تک جا سکتا ہے، اس سے آگے نہیں۔ اور مومن کھلے بندوں جہاں تک جی چاہے جا سکتا ہے۔ نہیں! خدا ربّ العالمین ہے۔ اس لئے سامانِ رزق تمام نوعِ انسان کے لئے کھلا رکھا ہے۔ اسے جو بھی اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرنا چاہے، حاصل کر لے۔ اسی حقیقت کو سورۂ شوریٰ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ "جو کوئی مستقبل کے مفاد چاہتا ہے ہم اس کی سعی و کاوش کے مطابق اس کے لئے اس کی کھیتی کی فصل بڑھاتے رہتے ہیں۔ اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم، اس کی محنت و کاوش کے مطابق، اسے دنیا کی فصل دیتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا" (۴۲/۲۰)۔

یہ ہے خدا کا وہ قانونِ مشیت جس کے مطابق رزق کی بست و کشاد ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

قوانینِ خداوندی کے اعراض سے رزق کی تنگی

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ؕ (۲۰/۱۲۴)۔
جو شخص (یا قوم) ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔

(اس کے بعد ہے وَ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى. جس کی یہاں روزی تنگ ہو گی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ اس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں)۔

اس سے واضح ہے کہ رزق کی تنگی، قانونِ خداوندی سے اعراض کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور قانونِ خداوندی کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے کہ جو شخص، قانونِ فطرت کے مطابق، جس قدر کوشش کرے گا اسے اسی قدر رزقِ فراواں ملتا جائے گا۔ یہی قانون، ہر رسول کی وساطت سے اس کی امت کی طرف بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے متعلق کہا کہ اگر یہ لوگ تورات و انجیل اور جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس پر قائم رہتے تو، انہیں اوپر اور نیچے سے بافراط رزق ملتا (۵/۶۶؛ ۷/۹۶)۔ رزق کی اس طرح فراوانی کو خدا نے اپنی نعمت اور احسان قرار دیا ہے۔ چنانچہ قریش کے متعلق فرمایا کہ انہیں چاہیئے کہ اُس ربِّ کعبہ کی عبودیت اختیار کریں جس نے اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ؕ (۱۰۶/۴)۔ انہیں بھوک مٹانے کے لئے روٹی دی اور خوف سے مامون کر دیا۔

بھوک خدا کا عذاب ہے

اس کے برعکس، خوف اور بھوک کو خدا کا عذاب بتایا گیا ہے۔ سورۂ نحل میں ہے۔

> خدا ایک بستی کی مثال سے بات کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ امن و اطمینان میں رہتی تھی۔ چاروں طرف سے رزق بافراط اس کے ہاں کھنچے چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں سے کفران برتا تو فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ خدا نے انہیں بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا اور یہ سب ان کی اپنی کارستانیوں کا نتیجہ تھا۔ (۱۶/۱۱۲)

اسی طرح اس نے اہلِ سبا کے متعلق کہا ہے کہ انہیں بڑی خوش حالی حاصل تھی. لیکن انہوں نے فصلوں اور باغوں کی طرف سے بے اعتنائی برتی تو وہ سب تباہ و برباد ہو گئے۔ (۱۵۔ ۳۴/۱۶)۔

ان تصریحات کے بعد، قرآن نے کہا ہے کہ لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب ان پر رزق کی تنگی آتی ہے تو وہ خدا پر الزام دھرتے ہیں کہ اس نے ہمیں یونہی تباہ و برباد اور ذلیل کر دیا. فرمایا کہ ان سے کہو کہ خدا یونہی کسی کو ذلیل و خوار نہیں کیا کرتا. یہ سب انسان کے اپنے غلط اعمال اور باطل نظام کا نتیجہ ہوتا ہے. تم معاشرہ میں تمہارہ جاننے والوں کی عزت نہیں کیا کرتے تھے، اس لئے تم ذلیل و خوار ہو گئے. تم محتاجوں کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے تھے اور چاروں طرف سے مال اور دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرتے چلے جایا کرتے تھے، اس لئے تباہ حال ہو گئے۔ (۱۶۔ ۸۹/۲۰)۔

عزت کی روٹی

ہم نے دیکھ لیا کہ ذلت اور بھوک خدا کا عذاب ہے. اس لئے قرآنِ کریم نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ انہیں "عزت کی روٹی" ملتی ہے۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيمٌ (۸/۷۴)۔ انہیں ہر خطرہ سے حفاظت اور عزت کی روٹی میسر ہوتی ہے. اسے متعدد مقامات میں دہرایا گیا ہے۔ (مثلاً ۸/۴؛ ۲۲/۵۰؛ ۲۴/۲۶؛ ۳۳/۳۱؛ ۳۴/۴)۔

اور یہی وہ رزقِ کریم (عزت کی روٹی) ہے جس کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ تک، خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ چنانچہ معمارِ حرم، حضرت ابراہیمؑ نے تعمیرِ کعبہ کے بعد سب سے پہلی دعا یہ کہا تھا کہ

> اے العالمین! میں نے اپنی اولاد کو اس بے برگ و گیاہ زمین میں بسا دیا ہے کہ وہ تیرے گھر کی نگہبانی کریں. تو ایسا انتظام کر کہ ان کی طرف سامانِ رزق کھنچا چلا آئے۔ یہ بھوکے نہ رہیں۔ (۱۴/۳۷؛ ۲۸/۵۷؛ ۲/۱۲۶)۔

اور یہی "مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" (خدائی دستر خوان) تھا جس کے لئے حضرت عیسٰیؑ نے اپنے متبعین کے لئے التجا کی تھی۔ (۵/۱۱۴)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ حصولِ رزق، انسانی سعی و کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص جان مار کر محنت کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود مفلس اور نادار رہتا ہے۔ وہ اور اس کے بچے بھوکوں مر جاتے ہیں. اس کے برعکس، دوسرا شخص کچھ محنت نہیں کرتا اور

عیش اڑاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟
اس کے لئے ہم اپنے سفر کی اگلی منزل میں داخل ہوتے ہیں۔

(۳) تقسیمِ رزق کا نظام ۔ (معاشی نظام)

جو سوال ہم نے ابھی ابھی اٹھایا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ غریبوں اور مزدوروں کا طبقہ بڑی جانفشانی سے محنت کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ ان کی حالت یہ ہے کہ نہ انہیں اور ان کی اولاد کو پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہے نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ نہ ان کے پاس سر چھپانے کو جھونپڑہ ہوتا ہے نہ مصیبت کے وقت کام آنے کے لئے کچھ پس ماندہ۔ اگر وہ چار دن کے لئے بیمار پڑ جائیں تو علاج کے لئے پیسہ نہیں ہوتا اور، دوسری طرف، چونکہ وہ کام پر جانے سے معذور ہو جاتے ہیں اس لئے آمدنی بھی بند ہو جاتی ہے — اور اس کے بعد اگر وہ مر جائیں تو گھر میں کفن دفن کے لئے بھی کچھ نہیں ہوتا اور ان کے بعد بوڑھی ماں نادار بیوی، چھوٹے چھوٹے بچے لاوارث رہ جاتے ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں جو ساری عمر تنکا تک توڑ کر دوہرا نہیں کرتے اور ان کے کتوں تک کو وہ کچھ ملتا ہے، جو غریب کے بچوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ کیوں ہے؟

امارت و غربت

برہمن نے اس کیوں کا جواب یہ دیا کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل ہے۔ جنہوں نے اُس جنم میں اچھے کام کئے تھے، وہ عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں جنہوں نے بُرے کام کئے تھے وہ مصیبتیں بھگتتے ہیں اور چونکہ یہ سب، ایشور پرماتما کے حکم سے ہوتا ہے اس لئے اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔

واعظ نے کہہ دیا کہ ہر ایک کا رزق خدا نے لکھ دیا ہے۔ غریبی امیری سب تقدیر کے کھیل ہیں جسے لاکھ کوشش کے باوجود تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔

اور قرآن نے کہا کہ یہ نہ کسی پچھلے جنم کے کرموں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی قسمت کا لکھا۔ یہ سب بما کسبت ایدیکم — انسانوں کے اپنے ہاتھوں کا کیا ہوا ہے۔ بات واضح ہے۔

قرآن نے کہا

ایک غریب آدمی، اپنی عمر بھر کی کمائی (بلکہ قرض اٹھا کر) اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان خرید کر لاتا ہے اور راستے میں ڈاکو اس کا سب کچھ چھین لیتے ہیں اور وہ روتا دھوتا گھر آجاتا ہے۔

ایک مزدور، دن بھر کی محنت مشقت کے بعد چار روپے جیب میں ڈال کر بازار کی طرف جاتا ہے کہ بال بچوں کے لئے دال، آٹا خرید کر لے جائے۔ راستے میں گرہ کٹ اس کی جیب کاٹ کر چاروں کے چاروں روپے لے اڑتا ہے اور وہ بیچارہ خالی ہاتھ گھر لوٹ جاتا ہے۔

اس قسم کے چور، ڈاکو، گرہ کٹ تو ہمیں نظر آجاتے ہیں لیکن معاشرہ میں ذرا آگے بڑھ جائیں تو وہاں

غلط معاشی نظام

کیفیت یہ ہوتی ہے کہ چوری، قزاقی، گرہ کٹی تو اس سے کہیں بڑے پیمانے پر ہوتی ہے لیکن انہیں نہ کوئی چور کہتا ہے نہ ڈاکو، نہ گرہ کٹ نہ قزاق۔ انہیں، بلکہ معاشرہ کے معزز ترین افراد سمجھا جاتا ہے۔ یہ کون ہیں؟

گاؤں کا زمیندار، ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن بیٹھتا ہے۔ کاشت کار سال بھر جان مار کر محنت کرتے ہیں اور وہ فصل کا بہترین حصہ اٹھوا کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔ نہ اسے اس سے کوئی واسطہ ہوتا ہے، نہ کسی اور کو کہ جو کچھ کاشت کار بے چارے کے پاس بچا ہے اس سے اس کے اور اس کے بال بچوں کا سال بھر گزارہ بھی ہو سکے گا؟

کارخانہ کا مالک گھر بیٹھے لاکھوں روپے ماہوار سمیٹتا چلا جاتا ہے اور جن کی محنت سے یہ روپیہ حاصل ہوتا ہے، انہیں تین چار روپے روزانہ سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ جب اس سے کہئے کہ یہ محنت کشوں پر ظلم ہے تو وہ بڑے دھڑلے سے کہتا ہے کہ یہ ظلم نہیں، عین انصاف ہے میں انہیں ان کی مقررہ اُجرت ٹھیک ٹھیک اور عین وقت پر ادا کر دیتا ہوں۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ ان کی یہ اُجرت، جس میں انہیں دو وقت کے لئے کھانے تک کو بھی نہیں ملتا، مقرر کس نے کی ہے اور کس اصول اور قاعدے کے مطابق کی ہے؟

جب مزدور، چار روپے لے کر بازار جاتا ہے تاکہ وہاں سے دال آٹا خرید کر گھر لے جائے تو وہ دوکاندار سے پوچھتا ہے کہ بھائی! کل تو دال دو روپے سیر دی تھی، آج اڑھائی روپے کیوں مانگ رہے ہو، تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ آج اس کا بھاؤ چڑھ گیا ہے۔ لینی ہے تو لو، ورنہ آگے جاؤ — اور یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ بھاؤ خود بخود کیسے اوپر چڑھ جاتا ہے اور اگر خود بخود نہیں چڑھتا تو اسے کون اوپر

چڑھاتا اور نیچے اتارتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے دیگر سوالات کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ایسا کچھ اس معاشی نظام کی رُو سے ہوتا ہے جسے انسان خود متشکل کرتے ہیں۔ اس میں نہ تقدیر کا کوئی ہاتھ ہوتا ہے، نہ انسانوں کے پچھلے جنم کے کرموں کا کوئی واسطہ۔ خدا نے رزق پیدا کیا لیکن اس کی تقسیم اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ (تقسیمِ رزق کے نظام کو معاشی نظام کہا جاتا ہے)۔ اس کے لئے اس نے اصول و قوانین بذریعہ وحی عطا کر دیئے اور کہہ دیا کہ اگر رزق کی تقسیم ان اصولوں کے مطابق کی جائے گی تو دنیا میں کوئی انسان اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔ لیکن اگر اس کی تقسیم، انسانوں نے اپنے وضع کردہ نظام کی رُو سے کی، تو معاشرہ میں ایسی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی جن سے انسانوں کی دنیا درندوں کا بھٹ بن کر رہ جائے گی۔

قرآنِ کریم نے اس معاشی نظام کے جو اصول و حدود متعین کئے ہیں، اس کے متعلق تفصیلی گفتگو کا یہ مقام نہیں۔ وہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر میں تفصیلی طور پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں[1]۔ اس وقت صرف چند بنیادی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام

(۱) رزق کا بنیادی سرچشمہ زمین ہے، جسے تمام انسانوں کے لئے سامانِ زیست مہیا کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے زمین کو خاص طور پر اَرْضِ اللّٰہِ (۱۱/۶۴) یعنی خدا کی زمین، کہا ہے اور اس کی تصریح کر دی ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲/۲۹)۔ یعنی زمین پر کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ اس میں جو کچھ (سامانِ زیست) ہے اسے خدا نے تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ (۱۵/۲۰؛ ۷/۱۰)۔ اس میں تم سب کے لئے سامانِ معیشت ہے۔ یہ رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے۔ (۵۰/۱۱)۔ یعنی خدا کے بندوں کے

---

[1] اس سلسلہ میں نظامِ ربوبیت، خدا اور سرمایہ دار، مستقل تصانیف کے علاوہ معاشی مسئلہ کے متعلق میرے متفرق مضامین کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان کی تفصیل ادارۂ طلوعِ اسلام، گلبرگ، لاہور سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

لئے رزق کا ذریعہ ... ... لہٰذا اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰)۔ یہ جو زمین کے مالک کہلاتے ہیں، ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ کسی زمانے کے غلط نظام میں، کسی نے زمین کے رقبوں پر لکیریں کھینچ کر کہہ دیا کہ یہ میری ملکیت ہیں۔ اس کے بعد اس کی وہ "ملکیت" یا وراثتاً آگے منتقل ہوتی چلی آئی اور یا اس نے اسے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کی ملکیت ابتداءً ہی باطل تھی، وہ وراثت یا بیع و شریٰ سے کس طرح حق (جائز) قرار پا جائے گی۔ قرآنی نظام میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہتی۔ وہ معاشرہ کی تحویل میں رہتی ہے اور (نظامِ مملکت) ایسا انتظام کرتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور اسے لوگوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

(۲) انسان نے سکّہ کی ایجاد اس لئے کی تھی کہ اس سے سامانِ زیست کی نقل و حرکت یا خرید و فروخت میں آسانی رہے ___ بجائے اس کے کہ ایک شخص گیہوں، ایک گاڑی میں لاد کر، اسے پچاس میل کے فاصلہ پر لے جائے اور وہاں سے، اس کے تبادلہ میں، کپڑے کا تھان لائے، یہ آسان تھا کہ وہ گیہوں کو اپنے مقام پر فروخت کر کے، دوسری جگہ سے کپڑا خرید لائے ___ سکّہ کی ایجاد تو اس مقصد کے لئے ہوئی تھی لیکن لوگوں نے اسے جمع کر کے رکھنا شروع کر دیا اور اس کے زور پر محنت کشوں کی کمائی ہتھیانے لگ گئے۔ اقتصادی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اب معاوضہ محنت کا نہ رہا، بلکہ سرمایہ کا بن گیا۔ اسے نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں۔ یعنی وہ نظام جس میں سرمایہ خود بخود اپنے آپ کو بڑھاتا چلا جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں اسے ربٰو کہتے ہیں جو قرآنی نظامِ معیشت کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ (۲۷۵-۲۷۹/۲)۔

قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ دولت کا جمع کرنا، اس جہنّم کا ایندھن فراہم کرنا ہے جس میں انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتی ہے۔ (۳۴-۹/۳۵)؛ (۱۵-۷۰/۱۸)۔ اسے معاشرہ میں گردش کرتے رہنا چاہیئے اور وہ بھی اس طرح کہ یہ صرف اوپر کے طبقہ ہی میں صرف گردش نہ رہے، دوران خون کی طرح سارے جسم میں گردش کرے۔ (۵۹/۷)۔ لہٰذا، قرآنی معاشرہ میں، زائد از ضرورت روپیہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ (۲/۲۱۹)۔

(۳) رزق پیدا کرنے (یعنی کام کرنے) کی صلاحیتیں، مختلف افراد میں مختلف ہوتی ہیں۔ صلاحیتوں کا

یہ اختلاف صرف اس مقصد کے لئے ہونا چاہیئے کہ معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہیں. اسے تقسیم عمل کہتے ہیں. (۴۳/۳۲). مختلف صلاحیتوں کے افراد، اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق کام کریں. اور اس کا ماحصل (اسامانِ رزق) ہر ایک کی ضروریات کے مطابق تقسیم کر دیا جائے. (۱۶/۷۱)؛ (۱۶/۵۳). یہ قارونیت (سرمایہ داری کا خدافراموش نظام) ہے جس میں ذہنیت یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ میں نے کمایا ہے، وہ میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے. اسے میں دوسروں کو کیوں دے دوں (۲۸/۷۸). قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت، سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنیکا موجب ہے. (۳۹/۴۹).

(۴) اس قسم کا معاشی نظام وہ حکومت قائم کرتی ہے جو قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے. (اسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے). خدا نے، جو کہا تھا کہ تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق مہیا کرنے کے ذمہ دار ہم ہیں، تو اس کی یہ ذمہ داری اس حکومت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے. اس مملکت میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے اور نہ ہی کسی کے پاس اس کی ضروریات سے زائد دولت رہتی ہے.

(۵) یہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو خدا کے ساتھ یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ "ہم اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں" اور اس کے عوض میں، خدا انہیں جنت عطا کرنے کا وعدہ دیتا ہے (۹/۱۱۱). دنیاوی زندگی میں یہ "جنت" اسلامی مملکت کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے اور آخرت کی جنت، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق.

یہ ہے وہ نظام جس میں کسی فرد کو تقدیر کا رونا نہیں رونا پڑتا کیونکہ اس میں کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہتی. اس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوتا ہے نہ محکوم، اس لئے اس میں ہر ایک کو "رزقِ کریم" عزت کی روٹی ملتی ہے. رزق تو باطل نظام میں بھی ملتا ہے لیکن اس میں، بالادست، مستبد طبقہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ انہیں بلا محنت و مشقت، رزق کی فراوانیاں، قوت کے نشہ میں بدمست کر دیتی ہیں اور اس طرح وہ معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے (۲۸/۵۸). اور نچلے طبقہ میں وہ تمام برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو غربت و افلاس کا فطری نتیجہ ہیں اور جن کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ "جس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے وہ قیامت میں بھی اندھا رہتا ہے. (۲۰/۱۲۴؛ ۱۷/۷۲). اس کے برعکس، جو رزق،

قوانینِ خداوندی کے مطابق تقسیم کی رُو سے ملتا ہے، وہ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ہوتا ہے (۲۰/۱۳۱) یعنی بہتر اور خوشگوار بھی اور محکم اور دیرپا بھی۔ اس میں، افراد کو ان کی محنت کے مطابق ہی نہیں ملتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ ــــ یعنی اس قدر جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ یہ معاشرہ اس لئے قائم کیا جاتا ہے۔ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا۔ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ خدا انہیں ان کے کاموں (محنت) کا معاوضہ بطریقِ احسن دیتا ہے۔ بلکہ اپنے فضل سے انہیں ان کی محنت سے بھی زیادہ دیتا ہے۔ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۴/۳۸)۔ یوں اللہ انہیں اتنا دیتا ہے کہ محنت کا معاوضہ (اُجرت) مقرر کرنے والے دنیاوی معیار، دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اس "معاوضہ" کے متعین کرنے کا معیار، ان کے حساب کتاب سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہی وہ معیارِ خداوندی ہے

خدا خَيْرُ الرّٰزِقِيْن ہے

جس کے پیشِ نظر خدا نے اپنے آپ کو خَيْرُ الرّٰزِقِيْن کہا ہے (۲۳/۷۲؛ ۶۲/۱۱)۔ یعنی رزق دینے والوں میں بہترین رزق دینے والا۔ رزق تو غیر خداوندی نظام میں بھی ملتا ہے لیکن جو رزق نظامِ خداوندی میں ملتا ہے اس کی نوعیت اور کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

آں خدا نانے دہد، جانے دہد
ایں خدا جانے بُرد نانے دہد

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس قسم کی حکومت ملتی کس قوم کو ہے اور کس طرح ملتی ہے۔ اس کے لئے اگلا باب ملاحظہ فرمائیے۔

---

(۴) يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ

(۱) خدا نے انسان کو پیدا کیا تو رزق کے سامان اور وسائل بھی ساتھ ہی مہیا کر دیئے۔

(۲) لیکن ان ذرائع و اسباب سے رزق، محنت اور کاوش سے حاصل کیا جا سکتا ہے. یعنی قوانینِ فطرت کی رُو سے۔

(۳) حاصل شدہ رزق کی تقسیم کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اسے نہ قوانینِ فطرت کی رُو سے حل کیا جا سکتا ہے، نہ تنہا انسانی عقل و فکر کی رُو سے. اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

(۴) قوانینِ فطرت اور قوانینِ وحی، دونوں کے لئے، قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح، مشیت خداوندی ہے ــــ یعنی وہ قوانین جنہیں خدا نے اپنے اختیار و ارادہ، اپنی مرضی اور مشیت کے مطابق مقرر کیا ہے۔

(۵) رزق کے معاملہ میں، قرآنِ کریم میں جہاں مَنۡ یَّشَآءُ آئے گا، وہاں اگر فاعل خدا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اپنے قوانینِ مشیت کے مطابق، رزق کی بست و کشاد کرتا ہے۔ اور جہاں اس کا فاعل انسان ہوگا وہاں مراد یہ ہوگی کہ جو لوگ قوانینِ مشیت کا اتباع کریں گے انہیں رزق فراواں اور باعزت حاصل ہوگا۔ جو ان قوانین سے اعراض برتیں گے، وہ بھوک اور افلاس کے ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں عنوان ۲ پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے جس میں بتایا گیا ہے کہ رزق ملنے کی شرائط کیا ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں مَنۡ یَّشَآءُ کا مفہوم واضح طور پر سمجھ میں آجائے گا۔

سورۂ زمر میں قارونی ذہنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انسان کی کیفیت بھی عجیب ہے۔ جب اس پر مصیبت آتی ہے تو خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اور جب خوشحالی اور رزق کی فراوانی میسر آتی ہے تو اکڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مجھے اپنی ہنرمندی کی بدولت حاصل ہوا ہے اس لئے اس میں کسی اور کا حصہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہی ذہنیت تمام فتنوں کی جڑ ہے اور انسانی معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کا بنیادی سبب۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں۔ یہ ذہنیت نہ کسی ایک فرد تک محدود ہے نہ کسی ایک زمانے کے انسانوں تک۔ ہر زمانے کے سرمایہ دار ایسا ہی کہتے چلے آئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ، تاریخ اس کی بھی شہادت دے گی کہ اس ذہنیت کا نتیجہ تباہی

مَنۡ یَّشَآءُ کا صحیح مفہوم

بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ ان کے سامنے آجاتا تھا۔ وَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔ اور ہمارا یہ قانون (کہ غلط معاشی ذہنیت اور نظام کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے) نہ کسی خاص زمانے سے متعلق تھا نہ کسی خاص قوم تک محدود۔ اے رسولؐ! تیری مخاطب قوم میں سے بھی جو لوگ اس قسم کے ظلم و استبداد اور سلب و نہب کی روش اختیار کریں گے ان کا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے قانونِ مکافات کو شکست نہیں دے سکیں گے۔

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس قسم کی تباہیاں، انسانوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ اس کے بعد ہے اَوَ لَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۠ (۵۱ - ۳۹/۵۲)۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا لِمَنْ يَّشَآءُ رزقِ فراواں دیتا ہے اور لِمَنْ يَّشَآءُ ناپ تول کر دیتا ہے۔ اس میں ہر اس قوم کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھتی ہے۔ مروجہ تراجم کی رو سے اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ خدا جس کے لئے چاہتا ہے رزق کی کشاد کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہے تنگ کر دیتا ہے۔" لیکن پیچھے سے یہ بیان ہوتا چلا آرہا ہے کہ ہمارا ایک اٹل قانون ہے جس کے مطابق رزق کی بست و کشاد ہوتی ہے، اسی قانون کے مطابق اب بھی ہوگا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ ہمارے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں۔ ہم جس کی روزی چاہیں تنگ کر دیتے ہیں، جسے چاہیں رزقِ فراواں دے دیتے ہیں، نہ صرف بے ربط ہوگا بلکہ ایک دوسرے سے متضاد اور متخالف ہوگا ــــ اور جب صورت یہ ہو کہ رزق کی بست و کشاد کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں، یہ خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے بافراط رزق عطا کر دے، جس کی چاہے روزی تنگ کر دے، تو اس کے بعد یہ کہنا بھی بے معنی ہو جاتا ہے کہ اس بات میں مومنین کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ یہ تو اسی صورت میں کہا جائے گا جب یہ بتانا مقصود ہو کہ یہ سب کچھ خاص اصولوں اور قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اور اقوامِ سابقہ کے تاریخی نوشتے اس کی شہادت دیتے ہیں۔ لہٰذا، اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ (یہ ہے رزق کی بست و کشاد کے لئے ہمارا قانون) جو قوم بھی اس قانون کے مطابق روش اختیار کرے گی اسے بافراط رزق مل جائے گا۔

جو اس کی خلاف ورزی کرے گی اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے گا (اس قانون کے مطابق) جو شخص رزقِ فراواں حاصل کرنا چاہے اسے رزقِ فراواں مل جائے گا۔ جو تنگی روزی لینا چاہے، اسے ویسی روزی مل جائے گی۔

اور اگر اس آیت میں اللہ کو فاعل قرار دیا جائے تو اس کا ترجمہ یوں ہو گا کہ خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق فراواں رزق دیتا ہے اور اپنے قانون ہی کے مطابق رزق تنگ کر دیتا ہے۔

سورۂ قصص میں اس حقیقت کو قارون کا نام لے کر بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ قارون

قارون کی مثال

کا انجام دیکھنے کے بعد، وہ لوگ، جو اس کی خوشحالی کے زمانے میں اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے، بے ساختہ پکار اٹھے کہ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ (۲۸/۸۲)۔ بے شک رزق کی بست و کشاد، انسان کے اپنے تصورات کے مطابق نہیں بلکہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔

اسی طرح سورۂ روم میں ہے کہ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا۔ جب ہم انسان کو رزقِ فراواں عطا کرتے ہیں تو وہ بہت اتراتا ہے۔ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ۝۔ اور جب ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان پر تنگی آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہے اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (۳۰/۳۶-۳۷)۔ یہاں لِمَنْ يَّشَآءُ کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی جو شخص رزقِ فراواں لینا چاہے، وہ اس قانون کے مطابق چلے، جو تنگی میں رہنا چاہے، وہ اس کی خلاف ورزی کرے۔ تنگیٔ رزق کی مصیبتیں انسانوں کے اپنے ہاتھوں (ان کے غلط نظام) کی آوردہ ہوتی ہیں۔

سورۂ رعد میں ہے، کہ جو لوگ خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد (معاہدہ) کو توڑ ڈالتے ہیں اور نوعِ انسان کو ایک برادری سمجھنے اور بنانے کے بجائے انہیں طبقات میں تقسیم کر دیتے ہیں، ان کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (۱۳/۲۶)۔ رزق کی بست و کشاد خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتی ہے۔ اس قانون کے مطابق جو شخص یا قوم،

جس انداز اور پیمانے کا رزق لینا چاہے، لے لے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں، معاشرہ میں اخلاقِ حسنہ کی تفاصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ط (۱۷/۲۳-۳۰)۔ بات واضح ہے کہ جس قسم کا معاشرہ تم متشکل کرو گے، اسی کے مطابق رزق کی بست وکشاد ہوگی۔ جس معاشرہ میں اپنے متعلقین اور گرد و پیش کے انسانوں سے حسنِ سلوک اور خوش معاملگی کا برتاؤ ہوگا اس میں رزق کی کشاد ہوگی۔ جس میں نفسانفسی کا عالم ہوگا، اقتصادی ناہمواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

جو معاشرہ، قرآنی اقدار کے مطابق متشکل ہوتا ہے اس میں معاشیات کی بنیاد "انفاق" پر ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ اصطلاح بڑی معنی خیز ہے۔ اس کا مادہ (ن۔ ف۔ ق) ہے۔ پہلے زمانے میں، روپیہ پیسہ ایک

انفاق سے کیا مُراد ہے

میانی (یا تھیلی) میں رکھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ میانی یا تھیلی کا اوپر کا حصہ (مُنہ) تو کُھلا ہوتا ہے تاکہ اس میں روپیہ ڈالا جا سکے لیکن نچلا حصہ بند ہوتا ہے تاکہ اس میں سے روپیہ نکل نہ جائے۔ اس کے برعکس، نَـفَقُ اس میانی کو کہتے تھے جس کے دونوں سرے کُھلے ہوں۔ یعنی جس میں ایک طرف سے روپیہ ڈالتے جائیں اور دوسری طرف سے وہ نکلتا جائے۔ اس سے 'انفاق' کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔ یعنی ایسا معاشی نظام جس میں رزق کسی ایک جگہ بند ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ ضرورت مندوں کی ضروریات کے لئے کُھلا رہے۔ اور کھلا بھی "فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ"۔ یعنی کسی معاوضہ کے خیال کے بغیر، اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کُھلا رکھنا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کے لئے کُھلا رکھیں۔ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ یہ ہے وہ نظام جس کے متعلق کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے عمدہ کھیتی میں بیج کے ایک دانے سے، سینکڑوں دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیات (۲۶۱۔ ۲۶۷) میں دیکھئے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی برکات کا ذکر کس طرح جھوم جھوم کر کیا گیا ہے۔ دیگر مقامات میں اسے "اللہ کو قرض دینے" سے تعبیر کیا گیا ہے جو کئی گنا ہو کر واپس ملتا ہے۔ (۲/۲۴۵)۔

اسی سلسلہ میں سورۂ سبا میں کہا کہ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ

مِنْ عِبَادِہٖ وَ یَقْدِرُ لَہٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُہٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○ (۳۴/۳۹)۔ ان سے کہہ دو کہ رزق کی بست وکشاد خدا کے قانونِ مشیّت کی رُو سے ہوتی ہے۔ (اور وہ قانون یہ ہے کہ) تم جسقدر رزق کھُلا رکھو گے وہ کئی گنا ہو کر واپس ملے گا۔ یاد رکھو! خدا بہترین رزق دینے والا ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رزق کے بست وکشاد کی دو شکلیں ہیں۔ پہلے یہ کہ خدا کے قوانینِ طبیعی (قوانینِ فطرت) کے مطابق، علم وعقل اور محنت وکاوش سے رزق پیدا اور حاصل کرنا۔ اور دوسرے یہ کہ رزق کی تقسیم، خدا کی متعیّن کردہ مستقل اقدار کے مطابق کرنا۔ یعنی معاشرہ کا معاشی نظام، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل کرنا۔ اس سے رزق "بغیرِ حساب" ملتا ہے۔ "بغیرِ حساب" کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے لئے خدا کے ہاں بھی کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں۔ وہاں تو ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر رزق کا حصول اور تقسیم قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو، تو اس سے رزق کی فراوانی اس قدر ہوتی ہے جو تمہارے سان گمان میں بھی نہ ہو۔ وہ تمہارے حساب کتاب، تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے — اس کا تجربہ ہم خود اپنے ہاں کر چکے ہیں۔

رزق بغیر حساب

ہمارے ہاں زراعت، قدیم طریقوں کے مطابق ہوتی چلی آتی تھی جس سے ایک ایکڑ اراضی میں زیادہ سے زیادہ بیس پچیس من گیہوں پیدا ہوتا تھا۔ ہم نے زراعت کے جدید طریقے اختیار کئے۔ کھیتی کے لئے مشینیں منگائیں، "میکسی پاک" گیہوں کا بیج منگایا۔ سائنٹفک طریق سے تیار کردہ مصنوعی کھاد ڈالی، قاعدے اور قانون کے مطابق آبپاشی کی۔ نتیجہ یہ کہ اسی زمین سے (جس سے کبھی بیس پچیس من فی ایکڑ سے زیادہ فصل پیدا نہیں ہوتی تھی) ڈیڑھ ڈیڑھ سو من فی ایکڑ کے حساب سے گیہوں پیدا ہو گیا۔ اس نے زمینداروں (بلکہ ہمارے محکمہ زراعت کے دانشوروں تک) کے تمام حساب وقیاس کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

ہمارا اپنا تجربہ

لیکن اس کے بعد، سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے اپنی کارستانیاں شروع کر دیں۔ منڈیوں میں گیہوں کے بھاؤ گر گئے اور دیگر اشیائے صرف کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ گیہوں کی خریداری کی رفتار سست ہو گئی۔ غلّہ، چور دروازوں سے سمگل ہو کر باہر جانے لگ گیا۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں خوشحالی کے بجائے

غربت اور افلاس پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے۔ ہم نے جس طرح قوانینِ فطرت کی ہم آہنگی سے غلہ اس قدر افراط میں پیدا کیا گیا تھا، اگر اس کا صرف بھی مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق (لمرضات اللہ) ہوتا تو ملک میں "دودھ اور شہد کی نہریں" بہنے لگ جاتیں۔ پھر فی الواقعی ہیں رزق بغیرِ حساب ملتا۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ جب معاشرہ کا نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جنہیں کاروبار (بیع و تجارت) کی انفرادی مفاد پرستیاں، قوانینِ خداوندی سے غافل نہ ہونے دیں اور وہ ایتائے زکوٰۃ (نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا) اپنی ذمہ داری قرار دے لیں، اور غلط معاشی نظام کے ہاتھوں جو تباہ کن انقلاب آیا کرتا ہے اس سے خائف رہیں، تو اس معاشرہ میں لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا۔ خدا ان کی محنت کا بدلہ بطریقِ احسن دیتا ہے (ان کے کھیت سو سو من فی ایکڑ کے حساب سے فصل پیدا کرتے ہیں) وَ یَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ اور رزق کی صحیح تقسیم کی وجہ سے، اس میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (۲۴/۳۸)۔ اس طرح، خدا رزق کی اتنی فراوانی کر دیتا ہے جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی ــــ اور یہ افراطِ رزق اور خوشحالی ہر اس قوم کو مل سکتی ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے (مَنْ یَّشَآءُ)۔

صدرِ اوّل کے مومنین

اسلام کے صدرِ اوّل میں، جماعتِ مومنین کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس پر ان کے مخالفین (سردارانِ قریش) ان کا مذاق اڑاتے تھے کہ ان کی حالت یہ ہے کہ نہ کھانے کو روٹی ہے، نہ پہننے کو کپڑا اور خواب یہ دیکھ رہے ہیں قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کے۔

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

کہا کہ انہیں علم نہیں کہ یہ قوم، خدا کے قوانینِ مشیّت کے مطابق کام کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اس پروگرام کے ابتدائی ایام میں، بے حد مصائب و مشکلات کا سامنا ہوتا ہے ــــ بھوک، افلاس، اتلافِ جان و مال، فصلوں اور کھیتوں کی خرابی، یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ (۲/۱۵۵)۔ لیکن آخر الامر وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (۲/۲۱۲)۔ خدا ان لوگوں کو جو اس کے قوانینِ مشیّت کے مطابق کام کرتے ہیں، بلاحساب رزق دیتا ہے ــــ چنانچہ اُسی مفلس اور نادار قوم

کو اس طرح بے حساب رزق ملا کہ مکہ کے قریش ہی نہیں، دنیا بھر کے حساب دان، ششدر و حیران رہ گئے ــــ اور آج تک ششدر و حیران ہیں۔ یہی وہ قوم تھی کہ جب اسے رزق کی یہ فراوانیاں حاصل ہوئیں تو ان کی زبان پر بے ساختہ آ گیا کہ بارالہا! اس میں کوئی کلام نہیں کہ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ (۳/۲۶)۔ جو تیرے قانونِ مشیّت سے ہم آہنگ رہتا ہے تو اسے بغیر حساب رزق دیتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تصریحات سے، مَنْ یَّشَآءُ اور مَنْ تَشَآءُ کا قرآنی مفہوم نکھر کر سامنے آ گیا ہوگا لیکن آخر میں ہم دو اور آیات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ آئینہ اور بھی مصفا ہو جائے گا۔ سورۂ شوریٰ میں پہلے یہ کہا کہ اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ۔ خدا کے لطف و کرم بے پایاں ہیں۔ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ۔ وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق رزق دیتا ہے، وہ اس طرح کہ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ جو شخص مستقبل کے مفادات چاہتا ہے ہم اس کی کھیتی میں اس کے مطابق اضافہ کر دیتے ہیں۔ وَ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ۝ (۱۹-۲۰/۴۲)۔ اور جو شخص محض طبیعی قوانین کے مطابق دنیاوی مفاد ہی چاہتا ہے، ہم اسے بھی اس کی محنت کا ماحصل دیدیتے ہیں، لیکن چونکہ وہ رزق کی تقسیم میں مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتا اس لئے مستقبل کی خوشحالیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

یہاں دیکھئے مَنْ یُّرِیْدُ کہا گیا ہے۔ یعنی جو شخص یوں چاہے، ہم اس کے لئے یوں کر دیتے ہیں۔ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ۔ جو جیسا چاہتا ہے اس کے مطابق اسے رزق مل جاتا ہے۔

اور آخر میں، سورۂ یٰسٓ کی وہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۔ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ۔ جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے عطا کردہ رزق کو نوعِ انسان کی ربوبیّتِ عامہ کے لئے کھلا رکھو، تو یہ لوگ، جماعتِ مومنین سے کہتے ہیں کہ واہ! تم بھی کمال کرتے ہو، رزق کا بست و کشاد خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے فراواں رزق دے۔ جسے چاہے غریب اور تنگ حال رکھے۔ یہ مفلس اور غریب اس لئے تنگ حال ہیں کہ خدا انہیں کشادہ رزق دینا نہیں چاہتا۔ تو تم جو ہم سے کہتے ہو کہ ہم انہیں کھانے کو دیں، تو یہ خدا کی مرضی اور مشیّت کے خلاف

ہوگا۔ اگر وہ انہیں بھوکا نہ رکھنا چاہے تو انہیں خود ہی رزق دیدے۔ اس کے جواب میں کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ (۳۶/۴۷)۔ ان سے کہہ دو کہ تم کس قدر راہ گم کردہ ہو جو یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ کا یہ مفہوم لیتے ہو۔ خدا نہ کسی کو یونہی فراواں رزق دیتا ہے، نہ کسی کو بھوکا مارتا ہے۔ رزق اس کے قانونِ مشیت کے مطابق ملتا ہے۔ کشادہ بھی اور نپا تلا بھی۔ جو جیسا رزق لینا چاہے، اس کے مطابق کام کرے اور ویسا نظام قائم کرے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ (۱۶/۷۱)

(اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے)

قبل اس کے کہ ہم اس منزل سے اگلی منزل کی طرف قدم اٹھائیں، ان دو آیات کا سامنے لانا ضروری ہے جن کا صحیح مفہوم پیشِ نظر نہ ہونے سے، رزق کے معاملہ میں "قسمت یا تقدیر" کے مروجہ عقیدہ کو تقویت ملتی ہے۔ ان میں سے ایک آیت (۱۶/۷۱) ہے جس کا پہلا حصہ اوپر درج کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں پر رزق میں برتری حاصل ہے تو (خدا کا خود ارشاد ہے کہ) یہ اسی کی عطا کردہ ہے۔ اس لئے امارت اور غربت خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق کے معاملہ میں ایک دوسرے پر برتری کا تعلق اقوام سے بھی ہے اور افراد سے بھی۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں بعض قومیں بڑی خوشحال ہیں اور ان کے مقابلہ میں دوسری قومیں بڑی پس ماندہ۔ اسی طرح مختلف افراد میں بھی اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں اور استعداد میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اگر یہ فرق خدا ہی کا پیدا کردہ ہے تو (عقیدۂ جبر کے مؤیدین کا کہنا ہے کہ) یہ سمجھنا کیوں غلط ہے کہ رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اس میں انسان کا کوئی اختیار نہیں۔؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے، اَللّٰهُ فَضَّلَ کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم

فَضَّلَ کا صحیح مفہوم

پہلے بیان کر چکے ہیں، قرآنی مطالب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لئے اس کے اندازِ بیان کا پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً

جب وہ کہتا ہے کہ (عالمِ خلق میں) خدا یہ کرتا ہے تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ بلا کسی قاعدے اور قانون کے ایسا کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق ایسا کرتا ہے۔ (مثلاً) سابقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خدا نے کہا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ــــ اللہ ان کے دلوں پر مہریں لگا دیتا ہے۔ اور اس کے بعد قرآنِ کریم نے بتایا کہ انسانوں کے اپنے غلط اعمال زنگ بن کر ان کے دلوں پر لگ جاتے ہیں جس سے ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت معطّل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی دیگر متعدد مثالیں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ یہی کیفیت وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ کی ہے۔ ایک دوسرے پر رزق کی برتری یونہی "قسمت یا تقدیر" سے نہیں ہوتی۔ یہ خود انسانوں کی سعی و عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم قرآنِ کریم کی متعدد آیات سابقہ صفحات میں درج کر چکے ہیں۔ ان میں سے دو ایک کا اعادہ ضروری ہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۱۷/۱۸-۲۱ کو دیکھئے جن میں کہا گیا ہے کہ جو شخص دنیا کے مفاداتِ عاجلہ لینا چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اسے ہم مفاداتِ عاجلہ دے دیتے ہیں جو ان کے ساتھ اُخروی زندگی کی خوشگواریاں بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے کوشش کرتا ہے اسے دنیا اور آخرت دونوں کی خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہم ان دونوں کو، ان کی سعی و عمل کی نسبت سے آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے راستے میں کہیں بند نہیں لگا دیئے کہ ایک گروہ کو روک دیا جائے اور دوسرے گروہ کو آگے بڑھ جانے دیا جائے اور اس کے بعد ہے۔

یہ انسان کی اپنی سعی و عمل کا نتیجہ ہوتا ہے

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (۱۷/۲۱)

دیکھو! ہم کس طرح ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر برتری دیتے ہیں۔

یہاں زور (EMPHASIS) كَيْفَ (کس طرح) پر ہے۔ یعنی مختلف گروہوں میں تفاوت رزق تو ہے لیکن تمہیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ تفاوت کس طرح سے پیدا ہوا ہے؟ اس کی تفصیل پہلی آیات میں دے دی گئی ہے۔ یعنی ان گروہوں کی سعی و عمل کی نسبت سے ایسا ہوا ہے۔ خدا نے ایسا نہیں کیا کہ ایک گروہ کو روک دیا ہو اور دوسرے کو آگے بڑھ جانے کی چھٹی دے دی ہو۔ آپ

نے غور فرمایا کہ وہی آیت جس کے غلط مفہوم سے "قسمت اور تقدیر" کا عقیدہ وضع کیا جاتا ہے کس طرح اس عقیدہ کی تردید کر رہی ہے! اب اس سلسلہ کی دوسری آیت لیجئے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

نَحْنُ قَسَمْنَا کا مفہوم

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۴۳/۳۲)۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہوگا کہ "دنیاوی زندگی میں لوگوں میں معیشت کی تقسیم ہم کرتے ہیں اور ایک کو دوسرے پر بلندئ مدارج عطا کرتے ہیں"۔ اس آیت میں لفظ قَسَمْنَا سے "قسمت" کا تصور پیدا کر لیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ دیکھئے! رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اسی کو انسان کی قسمت کہا جاتا ہے۔

اصولی طور پر جو کچھ ہم نے (اللّٰهُ فَضَّلَ) یا (فَضَّلْنَا) کے سلسلہ میں کہا ہے، اس کی روشنی میں (قَسَمْنَا) کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔ ہم نے اس باب کے شروع میں لکھا ہے کہ خدا نے سامانِ رزق پیدا کر دیا لیکن اس کی انفرادی تقسیم اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ یہ تقسیم، انسانوں کے معاشی نظام کے مطابق ہوتی ہے۔ غلط (غیر قرآنی) نظام میں اس تقسیم سے ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ صحیح (قرآنی) نظام میں ناہمواریاں مٹ جاتی ہیں۔ یہاں (قَسَمْنَا) کے بعد جو کہا کہ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ ۔ (ہم نے ایک کو دوسرے پر بلندئ مدارج عطا کی ہے) تو اس سے خود تقسیمِ رزق کا اصول واضح ہو جاتا ہے۔ تعیینِ مدارج کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶/۱۳۲)۔ ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ اور اس کی تشریح متعدد مقامات پر کر دی کہ تعیینِ مدارج کس طرح اعمال کی نسبت سے ہوتا ہے۔ سورۃ النساء میں اصولاً بتا دیا کہ مجاہدین (جد و جہد کرنیوالوں) کے مدارج، قاعدین (بیٹھے رہنے والوں۔ یا تساہل انگیز لوگوں) سے بلند ہوتے ہیں (۴/۹۵) دوسری جگہ کہا کہ "حاجیوں کے لئے سبیلیں لگا دینے والوں یا مسجد الحرام کی تزئین و آرائش کرنے والوں کے مقابلہ میں، مجاہدین اور مہاجرین کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ (۹/۱۹)۔ اسی طرح کی اور آیات بھی ہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اکتسابِ رزق کے معاملہ میں، دو باتیں بنیادی ہیں،۔

اکتسابِ رزق کے دو بنیادی عوامل

(۱) وہ وسائل و اسباب جو خدا کی طرف سے مفت اور بلا معاوضہ ملتے ہیں. مثلاً زمین اور ما فیہا (جو کچھ اس کے اندر ہے) روشنی، حرارت، ہوا، پانی وغیرہ۔ انہیں خدا نے نعمتیں کہہ کر پکارا ہے۔ اور

(۲) انسان کی سعی و کاوش.

جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے، وہ کرۂ ارض پر ہر جگہ یکساں نہیں ___ قطبین کے برف پوش میدان اور یخ بستہ سمندر، پہاڑی علاقے، جنگلی خطے، صحرا، اور دوسری طرف سرسبز و شاداب، زرخیز و زرفشاں قطعاتِ ارض، ان میں، زمین کی پیداواری صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے اور آب و ہوا میں بھی تفاوت۔ اس کا اثر ان علاقوں میں بسنے والی اقوام پر بھی پڑتا ہے۔ یہ وہ "تقسیم" ہے جس پر بنیادی طور پر انسان کو اختیار نہیں، اگرچہ محنت اور کاوش سے، اس تفاوت کے نتائج کو کم کیا، اور رفتہ رفتہ، مٹایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک دوسرے حصے (سعی و عمل) کا تعلق ہے، اس کا انحصار انسان کے اپنے اختیار و ارادہ پر ہے۔ اقوام میں "تقسیم رزق" ان دونوں عناصر کے امتزاج سے ہوتی ہے۔

افراد میں صلاحیتوں کا فرق

اب آیئے افراد کی طرف۔ یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض لوگوں میں صلاحیتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور بعض میں کم۔ اور انہی کے مطابق ان کی کمائی میں فرق ہوتا ہے۔ صلاحیتوں کے اس اختلاف و تفاوت کے وجوہ و اسباب، مختصراً حسبِ ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) بعض ذہنی نقائص جو بچے میں وراثتاً منتقل ہو کر آتے ہیں۔

(۲) بعض اسقام جو جنین میں پیدائش سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ اسقام و نقائص طبیعی ہوتے ہیں اور انسانی جسم کی مشینری کے متعلق، جوں جوں سائنس آگے بڑھتی جا رہی ہے، ان کی مدافعت یا ازالہ کی شکلیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ہم سردست نہیں کہہ سکتے کہ رفتہ رفتہ ایسا وقت آ جائے گا کہ تمام بچے، یکساں صلاحیتیں لے کر پیدا ہوں، لیکن یہ تو واقعہ ہے کہ یہ اختلافات رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا، ان کا تعلق کسی "غیر متبدل تقدیر" سے نہیں۔

(۳) بچے کی ابتدائی تربیت و تعلیم اور وہ ماحول جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔

(۴) بچوں کی صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع، درسگاہیں اور ان کا نصابِ تعلیم، نیز ان کی صحت کی دیکھ بھال، ان کی نفسیات کا مطالعہ وغیرہ۔

(۵) ان صلاحیتوں کے استعمال کے مواقع۔ طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کے مسائل وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان امور کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ یعنی ان میں افراد، پورے پورے اختیارات کے مالک نہیں ہوتے۔ نظامِ معاشرہ کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ لیکن "خدا کی مقرر کردہ قسمت یا تقدیر" کا سوال یہاں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ صحیح معاشرہ کے قیام کو بھی قرآن، خدا کی نعمتوں میں شمار کرتا ہے، اس لئے افراد کو جو مفادات یا (ADVANTAGEOUS POSITION) حُسنِ معاشرہ کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں، انہیں بھی قرآن، نعمۃ اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ بنابریں اکتسابِ رزق میں یہ دو بنیادی عوامل کارفرما ہوتے ہیں:۔

(۱) انسانی سعی و عمل۔ اور

(۲) نعمائے خداوندی ـــــ خواہ وہ بنیادی اسباب و وسائلِ رزق ہوں اور خواہ افراد کو، معاشرہ کے حُسنِ نظم کی رُو سے حاصل ہونے والے مفادات۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "نعمائے خداوندی" کی کمی سے جو نقصانات ایک قوم یا افراد کو پہنچتے ہیں، ان کے تو وہ خود ذمہ دار نہیں ہوتے۔ وہ قومیں، دوسری قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ وہ افراد، دیگر افراد کے مقابلہ میں پست سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس کا ذمہ دار کون ہوتا ہے!

اس کا ذمہ دار معاشرہ ہے

قرآن کہتا ہے کہ اس کا ذمہ دار معاشرہ (یا دنیا) کا نظام ہے۔ اگر یہ نظام، مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہو تو پھر اس تفاوت سے، اقوام یا افراد کے حالات اور مدارج میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جہاں تک اقوام کا تعلق ہے، قرآن ایک عالمگیر برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جس میں انسانیت مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نہ ہو۔ جب انسانیت، اقوام میں بٹ جاتی ہے تو ہر قوم کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جائز یا ناجائز طریقوں سے دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے ـــــ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (۱۶/۹۲)۔ لیکن جب وہ ایک عالمگیر برادری کی شکل اختیار کر لے تو اس

وقت اگر کسی خاص خطۂ زمین کے باشندوں کو "خدا کی نعمتوں" سے وافر حصہ ملتا ہے تو وہ اس کے بل بوتے پر اقوام کو لوٹنے کھسوٹنے نہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ۔ خدا نے تمہیں زمین میں تمکّن و تسلّط عطا کیا وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر مدارج کی بلندی ملی۔ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ (۶/۱۶۶)۔ تاکہ یہ دیکھا جائے کہ جو کچھ تمہیں خدا کی طرف سے ملا ہے، اس سے تم کیا کرتے ہو؟ صحیح نظام میں، اس سے، نوعِ انسان کی عالمگیر منفعت کا کام لیا جاتا ہے کیونکہ مستقل قدر یہ ہے کہ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)۔ ثبات و دوام صرف اس چیز کے لئے ہے جو (کسی خاص گروہ، طبقہ، قوم کی نہیں بلکہ) عالمگیر انسانیت کی منفعت کا موجب ہو۔

اب رہا مختلف صلاحیتوں کے حامل افراد کا معاملہ، سو اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایسی اصولی تعلیم دی ہے جس کی رُو سے ان اختلافات کا افراد پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا پہلا فرق معاشی ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا کہ یہ فرق صرف تقسیم کار کے لئے ہوگا — معاشرہ میں مختلف قسم کے کام ہوں گے جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہوں گی۔ اس اختلاف کا دائرہ یہیں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے — لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳/۳۲)۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیا جا سکے۔

جہاں تک معاشی تفاوت کا تعلق ہے اسے مٹانے کے لئے قرآنِ کریم نے ایسا نظام پیش کیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آ جاتی ہے۔ اور یہ نظام پیش کیا ہے اسی آیت میں جو زیرِ نظر موضوع کے عنوان کے طور پر لکھی گئی ہے۔ پوری آیت یوں ہے:

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ (۱۶/۷۱)۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ اکتسابِ رزق کی صلاحیتوں میں لوگوں میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن غلط ذہنیت کے حامل انسان (غلط معاشرہ کے نظام کی رُو سے) اس تفاوت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وہ اپنی برتر صلاحیتوں کی بنا پر جو زیادہ کمائی کرتے ہیں تو اسے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے کر، اس کے مالک بن بیٹھتے ہیں اور اسے ان ماتحتوں کی طرف نہیں لوٹا دیتے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتی۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ ایسا کرنے سے تو ہم سب برابر ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان سے پوچھو کہ ان کی زائد کمائی میں کتنے ایسے عوامل شامل ہیں جو نہ ان کے زرخرید ہیں اور نہ خود پیدا کردہ ——— ان میں سے بنیادی وسائل و اسباب خدا کے عطا فرمودہ ہیں اور صلاحیتوں کی برتری کے اسباب، معاشرہ کے مہیّا کردہ۔ پھر اس میں، ان کے ان ماتحتوں کا تعاون بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ جب حقیقت یہ ہے کہ اس زائد کمائی کے اسباب میں بیشتر وہ ہیں جو انہیں بطور "نعمائے خداوندی" حاصل ہوئے ہیں ——— یعنی جو ان کی ذاتی محنت و کاوش کا نتیجہ نہیں ——— تو ان کا یہ کہنا کہ اس زائد کمائی کے ہم واحد مالک ہیں، اس حقیقت کا انکار ہے کہ اس (زائد کمائی) کا بیشتر حصّہ نعمائے خداوندی کا رہینِ منت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وَ مَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (۱۶/۵۳)۔ جو چیزیں تمہیں بطور "نعمائے خداوندی" ملتی ہیں، وہ تمہاری اپنی نہیں ہوتیں۔ وہ خدا کی طرف سے ملتی ہیں، لہذا، ان کے ثمرات کے بھی تم مالک نہیں ہو سکتے۔ انہیں خدا ہی کے احکام کے مطابق صرف کرنا چاہیئے۔ یہ ان لوگوں کا حق ہے جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے، کافی نہیں ہوتی۔ [فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ (۲۵-۲۴/۷۰)]۔ اس آیت میں لفظ حق بڑا غور طلب ہے۔ یعنی انہیں یہ چیز خیرات کے طور پر نہیں ملتی۔ وہ اسے اپنے حق کے طور پر لیتے ہیں اور طلب کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآنی نظامِ معاشرہ میں اصول یہ کارفرما ہوگا کہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں اور استعداد کے مطابق کام کرے اور نظامِ مملکت ان کی ضروریات کا کفیل ہو۔ آپ نے غور فرمایا کہ صحیح قرآنی معاشرہ میں، صلاحیتوں کے تفاوت کا، افراد کی حالت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

باقی رہا سوسائٹی میں عزت کا معاملہ سو قرآنِ کریم کی رُو سے، دولت وجہِ تکریم ہی نہیں۔ اس کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کی رُو سے۔

معیارِ تکریم

(۱) ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں تکریم کا مستحق ہے۔ (۱۷/۷۰)۔

(۲) سوسائٹی میں مدارج کا تعیّن ہر فرد کے اعمال ——— حُسنِ سیرت و کردار کی بنا پر ہوتا ہے۔ (۶/۱۳۳)۔ اور

(۳) سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (۴۹/۱۳)۔

لہذا، جب صلاحیتوں کے تفاوت سے، افراد کے احوال وکوائف پر کوئی اثر نہیں پڑتا، تو یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ تفاوت کیوں ہے! یہ سوال تو غلط معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے جس میں یہ تفاوت، افراد کی ساری زندگی بلکہ زندگی کے بعد تک بھی، ہر گوشے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں، افراد کو پہلے ان وسائل واسباب سے محروم رکھا جاتا ہے جن سے ان صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے اور پھر انہیں یہ کہہ کر دھتکارا جاتا ہے کہ ان میں کوئی صلاحیت ہی نہیں ــــ انہیں قدم قدم پر دھتکارا جاتا ہے اور، اس خیال سے کہ اس سے کہیں ان کی نگاہ اس طرف نہ اٹھ جائے کہ ہماری صلاحیتوں کے اس فقدان کے ذمہ دار خود یہ لوگ ہیں جو ہمیں اس طرح دھتکار رہے ہیں، انہیں یہ وعظ پلائے جاتے ہیں کہ یہ تفاوت خدا کی طرف سے ہے اور اس کی تائید میں اس قسم کے فریب آمیز دلائل کہ خدا نے پاؤں اس لئے پیدا کئے ہیں کہ وہ سارے جسم کا بوجھ اٹھائیں اور زمین کی غلاظت میں آلودہ رہیں۔ سر کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ تاجِ شاہانہ پہنے۔ تم پاؤں کو سر کا مقام نہیں دے سکتے۔

یہ ہیں وہ لاطائل اور فرسودہ دلائل جن پر عقیدۂ جبر کی عمارت قائم کی جاتی ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ خدا نے تاجِ شاہانہ کی سرفرازیوں کے لئے کیا قانون مقرر کیا ہے۔

تیرھواں باب

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت ہے:۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۳/۲۵)

اس کا مروّجہ ترجمہ یہ ہے۔

تو کہ ۔ یا اللہ ۔ مالک سلطنت کے۔ تو سلطنت دے دے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لے جس سے چاہے۔ اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے۔ تیرے ہاتھ ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

حکومت اور سلطنت کا تصوّر تو عوام کی ذہنی سطح سے اونچا ہوتا ہے، اس لئے اس کے متعلّق عام طور پر باتیں نہیں کی جاتیں، لیکن عزت اور ذلت کی باتیں تو ہر گلی محلّہ میں ہوتی رہتی ہیں۔ آجکل دولت؛ معیارِ عزت قرار پا گیا ہے۔ اس لئے جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ابھی کل تک جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا اور آج لاکھوں کا مالک ہو گیا ہے (خواہ وہ دولت، سٹّہ، چور بازاری، سمگلنگ، رشوت وغیرہ کے ذریعے ہی کیوں نہ حاصل ہوئی ہو)۔ اور دوسری طرف، نوابوں کے خاندان کا لڑکا جو کل تک چوا پسہ گاڑی میں ہوا خوری کو نکلا کرتا تھا، بھیک مانگتا دکھائی دیتا ہے (خواہ اس نے اپنی جائداد، قمار بازی اور شراب خوری میں کیوں نہ اڑا دی ہو) تو وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! یہ سب خدا کی شان ہے۔ وہ

جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلیل کر دے۔ وہاں دم مارنے کی جا نہیں۔

قبل اس کے ہم اس (اور ان جیسی دیگر آیات) کے صحیح مفہوم کو سامنے لائیں، دو ایک باتیں تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ اس آیت (اور قرآن کریم کے دیگر مقامات میں) عزت اور ذلت کے جو الفاظ آئے ہیں، ان کا وہ مفہوم نہیں جس مفہوم میں یہ ہمارے ہاں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں عزت کے معنی قوت، شدت، غلبہ ہوتے ہیں اور ذلت کے معنی مغلوبیت، قوت کا ٹوٹ جانا، کمزور ہو جانا۔ جن معنی میں ہم عزت کا لفظ استعمال کرتے ہیں، عربی زبان (اور قرآن کریم) میں اس کے لئے تکریم کا لفظ آیا ہے اور (ہمارے مفہوم کے اعتبار سے) ذلت کے لئے توہین کا لفظ، جس کا مادہ (و۔ ھ۔ ن) ہے۔

عزت اور ذلت کے معنی

دوسرے یہ کہ دنیا پر مادی نظریۂ حیات اس درجہ چھا گیا ہے کہ اب عزت کا معیار دولت قرار پا گئی ہے۔ امیر آدمی، خواہ اس کا کیرکٹر کیسا ہی کیوں نہ ہو، معاشرہ میں بڑا معزز سمجھا جاتا ہے اور غریب کو سب حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، حالانکہ، ابھی کچھ عرصہ پہلے تک، ہمارے ہاں عزت کا معیار، شرافت ہوتی تھی، نہ کہ دولت۔

تیسرے یہ کہ اس آیت سے جو یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ خدا کے ہاں حکومت وسطوت اور عزت وتکریم کے لئے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں، وہ جسے چاہے (یونہی) حکومت اور اقتدار عطا کر دیتا ہے اور جس سے چاہے (یونہی) اسے چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے (یونہی) عزت دیدیتا ہے جسے چاہے (یونہی) ذلیل کر دیتا ہے، تو اس مفہوم کی تردید خود اس آیت کے یہ الفاظ کر دیتے ہیں کہ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ یعنی خدا، خیر اور خوبی کا سرچشمہ ہے۔ حکومت کا چھن جانا اور عزت کا مٹ جانا، خیر اور خوبی نہیں۔ اس لئے یہ بات خدا سے (کہ جو خیر وخوبی کا سرچشمہ ہے) بعید ہے کہ وہ یونہی کسی کو ذلیل وخوار کر دے۔

اس کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ پہلے حکومت اور سلطنت، اختیار واقتدار کو لیجئے۔ چھٹے باب میں ہم "قوموں کی تقدیر" سے متعلق تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ قوموں کے عروج وزوال کے ابدی قوانین کیا ہیں۔ ان تفاصیل کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہو گا کہ قرآن کریم کی رُو سے حکومت اور اقتدار حاصل ہونے کی شرائط کیا ہیں۔ انہی کو قوانینِ مشیت کہا جائے گا۔

حکومت ملنے کی شرائط

سورۂ انبیاء میں ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝

(۲۱/۱۰۵ — ۱۰۶)

ہم نے زبور (یا ہر کتاب وحی) میں، ضروری احکام و ہدایات دینے کے بعد، اس بات کو بطورِ اساسی قانون لکھ دیا تھا کہ ارض (حکومت و سلطنت) کے وارث وہی لوگ ہو سکیں گے جن میں اس کی صلاحیت ہوگی۔ یہ اساسی قانون ہر اس قوم کے لئے ایک دور رس حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے جو ہمارے قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔

یعنی وراثتِ ارض کا قانونِ اساسی یہ ہے کہ یہ "صالحین" کو حاصل ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں "صالحین" (اور اسی جہت سے "اعمالِ صالح") کا ایک خاص مفہوم مروج ہو چکا ہے جس کی تشریح میں جانے کی ضرورت نہیں۔ دین کو جب "مذہب" میں تبدیل کر دیا جاتا ہے تو اس کی اصطلاحات کا یہی حشر ہو جاتا

صالحین سے کیا مراد ہے

ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے "صالحین" سے مراد ہوتے ہیں وہ لوگ جن میں اس کام کی صلاحیت ہو جس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اور اعمالِ صالح سے مراد ہوتے ہیں ایسے کام جو انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما کر دیں۔ حکومت و سلطنت کے سلسلہ میں جب کہا کہ یہ "صالحین" کو مل سکے گی تو اس سے مراد ہوں گے وہ لوگ جن میں سلطنت حاصل کرنے اور حکومت قائم کرنے کی صلاحیت ہوگی۔ اس "صلاحیت" میں دو باتیں شامل ہوں گی۔ ایک تو طبیعی صلاحیت، یعنی وہ تمام طبیعی خواص و اسباب جن کی بنا پر سلطنت حاصل کی جاتی ہے اور دوسرے وہ انسانی صلاحیتیں جن کی بنا پر حکومت، انسانوں کی تمدنی زندگی کو جنتِ ارضی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کو صرف طبیعی قوتیں حاصل ہیں اور وہ انسانی صلاحیتوں سے عاری ہے، اس کی حکومت، فرعون، ہلاکو، چنگیز، یا عصرِ حاضر کی خدا فراموش اقوام کی حکومت ہوگی۔ اس کے برعکس جس قوم میں حکومت و سلطنت کے لئے طبیعی صلاحیتیں نہیں ہوں گی، انہیں یہ اقتدار حاصل ہی نہیں ہو سکے گا لیکن جس قوم کو طبیعی صلاحیتیں بھی حاصل ہوں گی اور اس کے ساتھ، مستقل اقدارِ خداوندی پر ان کا ایمان بھی ہوگا، ان کی حکومت، خدا کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے گی۔ یہ وہ حکومت ہے

جس کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ..... (۲۴/۵۵)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھیں گے اور اس کے بعد ایسے کام کریں گے جو ان کی صلاحیتوں کو بیدار کر دیں، تو ہم انہیں حکومت و مملکت عطا کر دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ (اٹل قانون) ہے۔ اس قسم کی حکومت کا نتیجہ دینِ خداوندی کا تمکّن ہوگا۔ اس میں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔ اس میں خالص قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کی جائے گی، کسی انسان کی نہیں۔ (۲۴/۵۵)۔ ان لوگوں سے یہ بھی تاکید

طبیعی اسبابِ حفاظت کی اہمیّت

کہہ دیا کہ حکومت حاصل ہو جانے کے بعد، ایسا نہ ہو کہ اس کے استحکام کے لئے جن طبیعی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، تم ان کی طرف سے غافل ہو جاؤ۔ بالکل نہیں۔ وَ اَعِدُّوۡا لَہُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ وَّ مِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡہِبُوۡنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ عَدُوَّکُمۡ (۸/۶۰)۔ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے جس قدر سامانِ حرب و ضرب اور گھوڑوں کے رسالوں کی ضرورت ہو، انہیں ہر وقت تیار رکھو تاکہ اس سے تمہارے اور دینِ خداوندی کے دشمنوں کے دل میں تمہاری دھاک بیٹھی رہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ، حکومت و مملکت کے لئے صلاحیت شرط ہے، قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل کی داستان کو بڑی شرح و بسط سے بیان

داستانِ بنی اسرائیل

کیا ہے۔ اس داستان کی مختلف کڑیوں کو مختلف مقامات پر بیان کرنے کے بعد، سورۂ قصص میں کہا کہ وَ نُرِیۡدُ اَنۡ ..... وَ نُمَکِّنَ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ..... (۲۸/۵-۶)۔ بالآخر، ہم نے ارادہ کر لیا کہ جس قوم کو غلامی اور محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر بے حد کمزور کر دیا گیا تھا، اس پر احسان کریں، اسے ان کی ہم عصر اقوام کی لیڈر شپ عطا کر دیں اور انہیں ملک میں تمکّن عطا کر کے، حکومت و سلطنت کا وارث بنا دیں ___ یہاں کہا گیا ہے کہ "خدا نے اس کا ارادہ کر لیا تھا ___" خدا کا ایک ارادہ تو عالمِ امر میں ہوتا ہے کہ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ﴿۳۶/۸۲﴾۔ اُدھر اس نے ارادہ کیا اور اِدھر وہ شے ظہور میں آ گئی۔ لیکن اس کا دوسرا ارادہ عالمِ خلق میں ہوتا ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے مختلف کڑیاں درکار ہوتی ہیں اور وہ انسانوں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق خدا کے اس ارادہ کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے

حضرت موسیٰ کو ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا جس کی بنیادی شق، بنی اسرائیل جیسی محکومیت زدہ قوم کی صحیح تعلیم و تربیت تھی۔ اس کے لئے حضرت موسیٰ نے انتہائی کوشش کی لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ وہ کسی ایک بات پر جم کر بیٹھتے ہی نہیں تھے۔ ان کی اس تلوّن مزاجی کی بنا پر حضرت موسیٰ ان سے بار بار کہتے تھے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۷/۱۲۸)۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تمہیں حکومت و سلطنت مل جائے گی لیکن یہ یونہی نہیں ملا کرتی۔ یہ ملا کرتی ہے خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق جس کی رُو سے اوّلین شرط یہ ہے کہ تم اپنے اندر اس کی صلاحیت پیدا کرو اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اس پروگرام پر استقامت اور استقلال سے عمل پیرا رہو اور اس حقیقت پر ایمان رکھو کہ راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آئیں، انجام کار وہ لوگ ضرور کامیاب ہونگے جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کریں گے۔ لیکن اس قوم نے اپنی روش کو نہ بدلا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ.... (۵/۲۶)۔ وہی سرزمین جسے ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، چالیس سال تک ان پر حرام کر دی گئی اور حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ انہیں صحرائے سینا میں سرگرداں پھرنے دو اور اپنی توجہات ان کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دو۔ چنانچہ اس طرح یہ، غلامی کی فضاؤں کے پروردہ "سہل انگار" بڑے بوڑھے "ختم ہو گئے اور جب ان کی نئی نسل پروان چڑھی تو انہوں نے ایک ہی جست میں اس سرزمین پر قبضہ کر لیا اور تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔ بِمَا صَبَرُوْا (۷/۱۳۷)۔ اور اس طرح، خدا کی وہ بات جو اس نے بنی اسرائیل کے لئے کہی تھی، پوری ہو گئی ـــــ وہ اس لئے پوری ہو گئی کہ وہ ہمت اور استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہے تھے۔ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ (۲۶/۵۹)۔ یوں ہم نے بنی اسرائیل کو اس مملکت کا وارث بنا دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ وراثتِ ارض کا قانون کس طرح صلاحیت سے مشروط ہے۔

قصۂ حضرت طالوت

قصۂ حضرت طالوت میں مَنْ يَّشَآءُ کا مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ قوم بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم جنگ کے لئے تیار ہیں لیکن پہلے کسی کو کمانڈر مقرر کر دیجئے۔ اس نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طالوت کو تمہارا کمانڈر مقرر کیا ہے۔ انہوں

نے کہا کہ طالوت کو کیسے کمانڈر مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰـہُ عَلَیْکُمْ وَ زَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ فوج کی کمان کے لئے مال و دولت شرط نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے جسمانی قوتیں بھی بافراط حاصل ہوں اور وہ فنونِ حرب و ضرب سے بھی واقف ہو۔ طالوت میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہیں اس لئے اسے اس منصب کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کس وضاحت سے بتا دیا کہ طالوت کو یہ اقتدار کیوں سونپا گیا اور اس کے بعد ہے وَ اللّٰہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ (۲/۲۴۷) اقتدار و اختیار، خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق ملتا ہے۔ یاد رکھو! علمِ خداوندی، تمہارے علم کے مقابلہ میں بہت وسیع ہے۔ تم اتنا ہی جانتے تھے کہ دولت، معیارِ انتخاب ہونا چاہیئے اور ہم یہ جانتے تھے کہ فوج کی کمان کے لئے کس کس قسم کی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہے ہمارا قانونِ مشیّت جس کے مطابق طالوت کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَآءُ کے کیا معنی ہیں؟ یہ نہیں کہ وہ جسے چاہتا ہے، یونہی اقتدار و حکومت عطا کر دیتا ہے۔

اس کے بعد ہے کہ طالوت اپنے لشکر کو لے کر جالوت کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ اس کے دل کی یہ آرزوئیں بار بار دعا بن کر اس کے لبوں تک آتی تھیں کہ رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۲/۲۵۰)۔ اسے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم پر استقلال و استقامت کے جام انڈیل دے۔ میدانِ جنگ میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔ اس میدان میں (حضرت) داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا وَ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ ..... (۲/۲۵۱)۔ اور یوں خدا نے اسے حکومت عطا کر دی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی حکمت بیان کی کہ اس قسم کے جنگ و قتال کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے۔ فرمایا۔ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَہُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○ (۲/۲۵۱)۔ اگر ایسا نہ ہو کہ خدا، مستبد اور ظالم قوموں کی مدافعت، انسانوں کی دوسری جماعتوں کے ذریعے کرائے، تو مستبد قوتیں دنیا میں تباہی مچا دیں۔ لیکن چونکہ خدا انسانوں کی تباہی نہیں چاہتا اس لئے اس نے ایسا انتظام کر رکھا ہے۔

یہاں دیکھئے کس وضاحت سے کہا گیا ہے کہ انسانوں کے ایک گروہ کی مدافعت، انسانوں ہی کے دوسرے گروہ کے ہاتھوں کرائی جاتی ہے۔ خدا براہِ راست ایسا نہیں کرتا۔ یہ پہلا گروہ وہ ہوتا ہے جو محض طبیعی قوتوں کے زور پر اقتدار حاصل کر لیتا ہے اور اپنے محکوموں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے۔ ان کے

خدائی پروگرام کے ہاتھوں انسانوں کی تکمیل

خلاف دوسرا گروہ وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جو طبیعی قوتوں کے ساتھ شرفِ انسانیت کی صلاحیتوں سے بھی مرصع ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے سورۂ حج کی ان درخشندہ آیات کو سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ جماعتِ مومنین کو جنگ کی اجازت کیوں دی گئی تھی۔ (۳۹-۴۱/۲۲)۔ اس کے بعد جب انہیں حکومت ملی، تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (۱۰/۱۴)۔ تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ اگر تم نے بھی وہی ظلم و استبداد کی روش اختیار کر لی، یا تم میں عسکری صلاحیتیں ختم ہوگئیں، تو پھر تمہاری جگہ دوسری قوم لے لیگی۔ ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸)۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر صلاحیتوں کی مالک ہوگی۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَآءُ وَ تَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَآءُ کا صحیح مفہوم کیا ہے (مزید تفصیل چھٹے باب قوموں کی تقدیر میں گذر چکی ہے)۔

اب اس آیت (۳/۲۵) کے دوسرے حصے کی طرف آیئے۔ یعنی عزت و ذلت سے متعلق قانونِ خداوندی ـــ پہلے ہم عزت و ذلت کے الفاظ کو قرآنی معانی میں لیتے ہیں۔ یعنی قوت و غلبہ، رفعت و عظمت اور اس کے برعکس، کمزوری اور مغلوبیت، پستی اور زبوں حالی۔ سورۂ فاطر میں اس

عزت اور ذلت کا قانون

کے لئے ایک جامع اصول بیان کیا گیا ہے۔ کہا کہ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا۔ جو تم میں سے قوت اور غلبہ، رفعت و عظمت (عزت) حاصل کرنا چاہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ صحیح عزت، اللہ کے ہاں سے (یعنی قوانینِ خداوندی کی پابندی سے) حاصل ہو سکتی ہے یہاں دیکھئے کہا یہ گیا ہے کہ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ ـــ تم میں سے جو کوئی عزت حاصل کرنا چاہے۔ اس سے واضح ہے کہ عزت اسے ہی ملتی ہے جو عزت حاصل کرنا چاہے۔ خدا کے ہاں سے از خود نہیں ملتی۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کے لئے قدمِ اوّل یہ ہے کہ تم صحیح نظریۂ حیات (آئیڈیالوجی)

کو اپناؤ (اس کو ایمان کہتے ہیں)۔ قرآنی نظریہ میں بلندیوں کی طرف جانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ (یعنی صحیح نظریۂ حیات جس میں بار آوری۔ پھل لانے۔ کی صلاحیت ہو (طیب اس کو کہتے ہیں) اس میں اُبھرنے، بلندیوں کی طرف جانے کی قوت ہوتی ہے] وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهُ۔ اور اعمالِ صالح اُسے اوپر کی طرف لیجانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لہٰذا، عزت ایمان اور اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس وَالَّذِینَ یَمْكُرُونَ السَّیِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیدٌ ؕ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ یَبُورُ ○ (۳۵/۱۰)۔ جو لوگ ایسی تدابیر کرتے ہیں جن سے ناہمواریاں پیدا ہوں، جن سے سیئات پھیلیں اور وہ اس طرح عزت حاصل کریں، تو اس کا نتیجہ شدید تباہی ہوتا ہے۔ ان کی سب تدبیریں آخر الامر خاک میں رہ جاتی ہیں۔

سورۂ یونس میں ہے کہ جو لوگ اس طرح، ایمان و اعمالِ صالحہ سے، خدائی پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے میں اس کے رفیق بن جاتے ہیں (انہیں قرآن کی اصطلاح میں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے) انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان محکم کے بعد انکی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں۔ ان کے لئے دنیاوی زندگی میں بھی ہر قسم کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی۔ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے۔ اس لئے، اگر اس پروگرام کے ابتدائی ایام میں، مخالفین طرح طرح کی حوصلہ شکن اور طنز آمیز باتیں کریں تو ان سے دل گرفتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ یاد رکھو کہ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیعًا (۱۰/۶۵-۶۲)۔ سورۃ النساء میں کہا کہ منافقین، اس نظامِ خداوندی کے مخالفین کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں۔ اَیَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ۔ کیا ان کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ ان سے کہو کہ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیعًا (۴/۱۳۹)۔ عزت، بہ تمام و کمال، قوانینِ خداوندی کے ساتھ وابستگی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ اجتماعی عمل ہے

لیکن قوانینِ خداوندی کے ساتھ وابستگی انفرادی عمل نہیں۔ اس کے لئے اس اجتماعی نظام میں شریک ہونا ضروری ہے جو ان قوانین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے، خدا کے رسولؐ اور اس کے رفقاء کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِینَ (۶۳/۸)۔ میں اس اجتماعی نظام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

اس کے برعکس اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ ۔ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۔ جو لوگ اس نظام کی مخالفت کریں گے اور میدانِ جنگ تک میں اتر آئیں گے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ذلیل ہوں گے۔ اس لئے کہ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ ۔ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۵۸/۲۰-۲۱) خدا نے یہ لکھ دیا ہے۔ اس کا یہ اٹل قانون ہے۔ کہ خدا اور اس کے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے، اس لئے کہ وہ بڑی ہی قوت کا مالک، صاحبِ غلبہ و اقتدار ہے۔

سورۂ یونس میں ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَۃٌ ___

حسنات سے عزت

جو لوگ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ایسے کام کرتے ہیں جن سے خود ان کی ذات اور عالمِ انسانیت سنور جائے ۔ تو ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی حسین ہوتی چلی جاتی ہے ۔ خود ان کے حسن کارانہ اعمال سے بھی زیادہ حسین ۔ وَ لَا یَرْہَقُ وُجُوْہَہُمْ قَتَرٌ وَّ لَا ذِلَّۃٌ ___ روسیاہی اور ذلت انہیں چھو کر نہیں جائیگی۔ وَالَّذِیْنَ

سیّات سے ذلت

کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِہَا ۔ وَ تَرْہَقُہُمْ ذِلَّۃٌ (۱۰/۲۶-۲۷)۔ ان کے برعکس، جو لوگ ناہمواریاں پیدا کرنے والے (حسنِ کائنات کو بگاڑنے والے) کام کریں گے، تو اسی نسبت سے ان کی اپنی زندگی کا حسن بگڑتا جائیگا یعنی ذلتوں کی سیاہی ان کے چہروں پر چھا جائے گی۔ زندگی کی یہی غلط روش تھی جس کے نتیجہ میں بنی اسرائیل جیسی شوکت و حشمت کی مالک قوم، ذلت و مسکنت کے عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ___ اس کے بعد اس کی وضاحت کردی کہ ایسا یونہی نہیں ہوگیا۔ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ .... (۲/۶۱؛ ۳/۱۱۲)۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے انکار و سرکشی کی راہ اختیار کرلی ___ وہ عدود فراموش ہوگئے۔

عزت بمعنی تکریم

اب آیئے عزت کے اس مفہوم کی طرف جو ہمارے ہاں مروج ہے اور جس کے لئے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قرآنِ کریم میں تکریم کا لفظ آیا ہے اور اس کے برعکس، بے عزتی اور رسوائی کے لئے توھین کا لفظ، جس کا مادہ (ھ۔ و۔ ن) ہے۔

قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عزّت کا معیار، دولت، حسب و نسب یا اسی قسم کی اور اضافی نسبتیں نہیں۔ اس کا معیار، سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی ہے یعنی شرافت اور حسنِ اخلاق۔ کہا کہ ذات پات، حسب نسب درشعوب و قبائل کی نسبتیں محض بغرضِ تعارف ہیں۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰکُمۡ (۴۹/۱۳)۔ خدا کے مقرر کردہ معیار کے مطابق سب سے زیادہ واجب التکریم، صاحبِ عزّت وہ ہے جس کا کردار سب سے بلند ہے۔ اس کی تشریح میں دوسری جگہ کہا کہ خدا کے مخلص بندے جو اپنے اعمال کے بدلے جنّت کے مستحق قرار پاتے ہیں وَ هُمۡ مُّكۡرَمُوۡنَ (۳۷/۴۲)۔ وہی صاحبِ عزّت اور مستحقِ تعظیم و تکریم ہوتے ہیں۔ سورہ یٰسٓ میں، اس مردِ مومن کا ذکر آیا ہے جس نے مخالفتوں کے ہجوم میں نہایت بیباکی سے حق کی آواز بلند کی اور کہا کہ اے کاش! میری قوم کو علم ہوتا کہ خدا نے مجھے اپنی کن رحمتوں سے نوازا ہے۔ وَ جَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُكۡرَمِیۡنَ ﴿۲۶/۲۷﴾ اس نے مجھے انتہائی عزّت و تکریم عطا کی ہے۔

اس کے برعکس، اس نے غلط روش کے نتیجہ کو عَذَابُ الۡهُوۡنِ۔ یا عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ کہا ہے۔ یعنی ذلّت آمیز، رسواکن عذاب۔ یہ ذلّت و رسوائی کس طرح آتی ہے، اس کے متعلق سورہ حج میں ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا وَ كَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ ﴿۲۲/۵۷﴾ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار اور ان کی تکذیب کرتے ہیں، وہ رسواکن عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کا استہزاء کرتے ہیں، وہ عذابِ مہین میں مبتلا ہوتے ہیں (۴۵/۹)۔ سورہ حٰمٓ میں اصولی طور پر بتا دیا کہ رسواکن عذاب تمہارے اپنے ہی اعمال کی بدولت آتا ہے۔ عَذَابِ الۡهُوۡنِ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۴۱/۱۷﴾۔

قرآنِ کریم نے ایک مقام پر، ایک بلیغ حقیقت کو بڑے ہی لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ لوگ، ظلم و استبداد کی بنا پر غلبہ و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں اور پھر قوّت و اقتدار، یا دولت و حشمت کو عزّت کا معیار قرار دے کر، معاشرہ میں صاحبِ عزّت و تکریم بن بیٹھتے ہیں۔ ہر شخص انہیں (ان سے ڈر کر) جھک کر سلام کرتا ہے۔ انہیں اونچی جگہ بٹھاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ ظلم و استبداد کی فرعونیّت سے حاصل کردہ عزّت (غلبہ) اور غلط معیارِ فضیلت کی بنا پر حاصل کردہ اعزاز و تکریم کا آخرالامر نتیجہ ذلّت آمیز تباہی ہوتا

غلط معیارِ تکریم

ہے۔ چنانچہ وہ (اس بسیط حقیقت کو محسوس تشبیہہ سے سمجھانے کی غرض سے) کہتا ہے کہ جہنم میں ایک ایسے ہی شخص کو لایا جائے گا اور اسے انتہائی ذلت و رسوائیوں کا سامانِ خورد نوش دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ

ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ (۴۴/۴۹)

اس ذلت آمیز، رسواکن عذاب کا مزا چکھ۔ تو اپنے آپ کو بڑا مقتدر (با اختیار) اور معزز سمجھا کرتا تھا۔

جھوٹے اقتدار اور مصنوعی عزتوں کے مدعیوں سے اُخروی جہنم میں جو سلوک کیا جائے گا، وہ تو بعد کی بات ہے، اس قسم کے اربابِ حکومت و اقتدار اور اعیانِ عزت و وقار کا جو انجام اس دنیا میں ہوتا ہے، اس کا

عزت بالاثم

عبرت آمیز تماشا ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے غلبہ و اقتدار کو خدا نے عِزَّةٌ بِالْاِثْمِ کہہ کر پکارا ہے (۲/۲۰۶)۔ یعنی وہ غلبہ و اقتدار جس سے بظاہر ایسا معلوم ہو کہ بڑی قوت حاصل ہو رہی ہے، لیکن درحقیقت وہ اضمحلال کی طرف لئے جا رہا ہو ـــ یہ وہ غلبہ و اقتدار ہے جو حق کو ہاتھ سے دے کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ عَذَابَ الْهُوْنِ ہوتا ہے۔ (۴۶/۲۰)۔ غلط معاشرہ میں، اقتدار بھی اسی طریق سے حاصل ہوتا ہے اور عزت (بمعنی تکریم) بھی اسی معیار کے مطابق۔ اس کے برعکس، حق پر مبنی معاشرہ میں، مدارج کا تعین، جوہرِ ذاتی اور حسنِ عمل کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس میں اصول یہ کارفرما ہوتا ہے کہ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ

مدارج کا تعین اعمال کے مطابق

اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (۴۶/۱۹) ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق، ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ۔ کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ـــ ظلم کے معنی ہوتے ہیں ـــ جس چیز کو جس مقام پر ہونا چاہیئے اسے اس مقام پر نہ ہونا ـــ اگر کسی شخص کو معاشرہ میں وہ مقام نہیں ملتا جس کا وہ اپنے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی بنا پر مستحق ہے تو یہ بھی ظلم ہے اور جس شخص کو وہ مقام مل جاتا ہے جس کا وہ مستحق نہیں تو یہ بھی ظلم ہے۔ . . . .

قرآنی معاشرہ میں ظلم نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا مقامِ عزت و تکریم اس کے اعمال کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ وَيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱/۳)۔ اس میں ہر صاحبِ فضیلت کو اس کی

فضیلت کے مطابق مقام مل جاتا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۔ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝ (۵۸/۱۱)۔ ہر صاحبِ علم کو اس کے جوہر کے مطابق مدارج۔ اللہ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہوتا ہے۔ وَ ھُوَ وَلِیُّھُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۸)۔ وہ ان کے اعمال کی بنا پر ان کا ولی (دوست، رفیق، کارساز) بن جاتا ہے ــــ ان کے اعمال کی بنا پر ــــ یہ ہے مشیّت کا اٹل قانون جس کے مطابق حکومت و مملکت بھی ملتی ہے اور عزت و تکریم بھی۔ (رفعتِ درجات کے متعلق سابقہ باب کے اخیر میں بھی لکھا جا چکا ہے)۔

ان تصریحات کی روشنی میں، سورۂ آلِ عمران کی اس آیت کو سامنے لائیے جو اس موضوع کی زیبِ عنوان ہے۔ یعنی۔

آیت کا صحیح مفہوم

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِکَ الْخَیْرُ ط اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۳/۲۵)۔

اور دیکھئے کہ اس کا مفہوم کس قدر واضح ہے کہ

بارِ الٰہا! قوت و اقتدار کا حقیقی مالک تو ہے۔ جو لوگ تیرے قانونِ مشیت کے مطابق چلتے ہیں، تو انہیں اقتدار عطا کر دیتا ہے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان سے اقتدار چھین لیتا ہے۔ عزّت و ذلّت تیرے قانونِ مشیّت کے مطابق ملتی اور چھنتی ہے۔ یہ کچھ یونہی دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ دھاندلی سے ہو کیسے سکتا ہے، اس لئے کہ تُو تو خیر کا سرچشمہ ہے۔ چشمۂ خیر سے شر کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ تو نے ہر بات کے لئے پیمانے، اندازے، قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ اور جو فیصلہ قانونِ حقّہ کے مطابق ہو، اس میں ظلم اور زیادتی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اے اللہ العالمین! خدا ہونا تجھی کو زیب دیتا ہے۔

تائید و نصرت خداوندی

ہم یہ ارشادِ خداوندی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وَ هُوَ وَلِیُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۱۲۸)۔ خدا انسانوں کے اعمال کی بنا پر ان کا رفیق و دمساز ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس رفاقتِ کبریٰ[1] کو، اس کی نصرت اور تائید کہا جاتا ہے۔ (تائیدِ غیبی کے الفاظ ہمارے ہاں عام طور پر بولے جاتے ہیں)۔ سوال یہ ہے کہ خدا کی یہ نصرت کیا ہے اور کیسے ملتی ہے۔ "تائیدِ غیبی" سے تو ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ غیب سے یونہی آ جاتی ہے ــــ اور اس کی تائید میں وَ اللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (۳/۱۳) جیسی آیاتِ قرآنی پیش کر دی جاتی ہیں۔

نصرت کے معنی عربی زبان میں نصرت کے معنی ہوتے ہیں، بارش کا زمین کو سیراب کرنا۔ ندی نالوں کا وادی میں دُور دُور تک چلے جانا تاکہ ان سے آبپاشی کی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ بارش اسی کسان کے لئے منفعت بخش ہو سکتی ہے جو اپنی زمین کو کھیتی کے لئے تیار کرتا ہے۔ طبیعی اسباب و سامان، کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ جو شخص ان کے خواص و فوائد سے واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ انہیں قاعدے اور قانون کے مطابق کس طرح استعمال کیا جاتا ہے ــــ اور پھر انہیں اسی طرح استعمال بھی کرتا ہے ــــ اس کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں۔ جو ان سے 'قاعدے اور قانون کے مطابق فائدہ نہیں اٹھاتا' ناکام رہتا ہے۔ اسی کو بالفاظِ دیگر یوں کہیں گے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق کوشش کرنے سے، خدا کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص ندی کے بہاؤ کی طرف کشتی چلاتا ہے اور دوسرا اس کے چڑھاؤ کی طرف ــ جتنے عرصہ میں بہاؤ کے ساتھ جانے والا دس میل کا سفر طے کرلے گا، چڑھاؤ کی طرف جانے والا شاید ایک میل بھی نہ جا سکے اور اس کے علاوہ اس کی جس قدر طاقت صرف ہوگی وہ بھی ظاہر ہے۔ لہٰذا، جو جماعت، خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے اٹھے اور اس کے متعین کردہ قوانین کے

---

[1] رسول اللہؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں فرمایا تھا بل هو الرفيق الاعلى یعنی میں اس کی طرف جا رہا ہوں جو رفیقِ اعلیٰ ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا باہمی تعلق رفاقت کا ہے۔ اس رفاقتِ باہمی میں خدا رفیقِ اعلیٰ ہے اور انسان رفیقِ ادنیٰ ــــ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے حضورؐ نے دو الفاظ میں بیان فرما دیا!

مطابق کام کرے، اس کی کوششیں بھرپور نتائج مرتب کریں گی۔ دیکھئے، قرآنِ کریم نے اس حقیقت کی وضاحت کیسے بلیغ انداز میں کی ہے۔ فرمایا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷)۔

اے جماعتِ مومنین! اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔

جو خدا کی مدد کرتا ہے، خدا اس کی مدد کرتا ہے

یہاں دیکھئے! مدد کرنے کی سبقت یا پہل، انسانوں کی طرف سے ہوگی یعنی جو جماعت خدا کی مدد کرے گی، خدا اس کی مدد کرے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا تو کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ لہذا، خدا کی مدد کرنے سے مراد ہے کہ اس کے پروگرام کی تکمیل (دین کی اقامت واستحکام) کے لئے کوشش کرنا ہے۔

اس کے بعد دیکھئے کہ خدا کی یہ مدد، کیا کرے گی؟ فرمایا۔

وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (۴۷/۷)۔

وہ تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔

کسی پروگرام کی کامیابی کے لئے استقامت اور استقلال اولیں شرط ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ اس پروگرام کی صداقت پر ایمانِ محکم ہو اور اس امر کا یقینِ کامل کہ جو راستہ ہم اختیار (جو طریقہ ہم استعمال) کر رہے ہیں وہ ہمیں بالضرور کامیابی سے ہمکنار کر دے گا۔ اس سے وہ سکونِ قلب (جمعیتِ خاطر) حاصل ہوتا ہے جس کا عملی نتیجہ ثابت قدمی ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہے وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۸)۔ اور جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے ہیں، ان کے حصے میں ناکامیاں اور نامرادیاں ہیں۔ ان کے اعمال رائگاں جاتے ہیں۔ وہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں کرتے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (۴۷/۹)۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ وحی کی رُو سے عطا شدہ قوانین واقدار کو ناپسند کرتے ہیں، لہذا ان کے اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔۔۔ جو کام بھی قاعدے اور قانون کے خلاف کیا جائے گا بے نتیجہ رہیگا۔

وہ مہاجرین جو، دینِ خداوندی کے قیام کے پروگرام میں شرکت کے لئے، اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ، مدینہ کی طرف آ گئے تھے، ان کے متعلق کہا وَیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الصّٰدِقُوْنَ ۰ (۵۹/۸)۔ یہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ انہی کے متعلق کہا وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ (۲۲/۴۰)۔ یقیناً اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کردی کہ خدا کن لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ فرمایا:۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت دے کر بھیجا، یعنی اس نظامِ زندگی کو دے کر جو یکسر حقیقت پر مبنی ہے تاکہ وہ نظام، دنیا کے تمام باطل نظاموں پر غالب آئے، خواہ یہ بات ان لوگوں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو ایک خدا کے قوانین کی اطاعت کے بجائے مختلف "خداؤں" کے احکام کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں، اے جماعتِ مومنین! آؤ تمہیں زندگی کا ایک اصول بتائیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص ایسا کاروبار کرنا چاہتا ہے جس میں اسے فائدہ ہو۔ لیکن تم یہ بھی دیکھتے ہو کہ انسان کئی سودے، ایسے بھی کر بیٹھتا ہے جن میں اسے فائدے کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اب سوچو کہ اگر تمہیں کسی ایسے کاروبار کا پتہ نشان مل جائے جس میں کبھی نقصان نہ ہو تو یہ کیسی عمدہ تجارت ہوگی؟ آؤ! ہم تمہیں ایسا کاروبار بتائیں جس میں کبھی نقصان کا احتمال نہ ہو اور اس طرح وہ تمہیں الم انگیز عذاب سے بچالے۔

وہ کاروبار یہ ہے کہ تم اس نظامِ خداوندی کی صداقت اور محکمیّت پر پورا پورا یقین رکھو جو اس کے رسولؐ کے ہاتھوں متشکل ہو رہا ہے۔ اس نظام کے قیام کے لئے پوری پوری جدوجہد کرو۔ اس کے لئے اپنا مال و دولت بھی صرف کرو اور ضرورت پڑنے پر اپنی جانیں تک بھی لڑا دو۔ اگر تم علم و بصیرت سے کام لے کر غور کرو گے تو تمہیں نظر آجائے گا کہ اس کاروبار میں کس قدر منافع ہے۔

یہ نظام تمہارے لئے ایسا سامان مہیا کردے گا جس سے تم ان تباہیوں سے بچ جاؤ گے جو تمہارے پیچھے لگی رہتی ہیں، اور تمہیں اس دنیا اور حیاتِ اخروی میں ایسی جنّتی زندگی عطا کردے گا جس کی تر و تازگی میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ (تمثیلاً) سدا بہار باغات میں نہایت خوشگوار رہنے کے مکانات۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے جسے نصیب ہو جائے۔

اس کے بعد ہے۔ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا۔ اور اس کے علاوہ، وہ کچھ بھی جو تمہیں بہت عزیز ہے یعنی نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ۔ اللہ کی نصرت اور قریبی فتوحات۔ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹-۱۴/۶۱) اے رسولؐ! جماعتِ مومنین کو اس کی خوشخبری دیدے۔

آپ نے غور فرمایا کہ خدا کی نصرت کن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے؟

پہلے کہا جا چکا ہے کہ کسی مقصد میں کامیابی کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ آپ کو اس مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم ہو۔ اس کے بعد، دوسری شرط یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو اسباب و ذرائع درکار ہوں، وہ مہیا کئے جائیں اور ان کا استعمال قاعدے اور قانون کے مطابق کیا جائے۔ دیکھئے قرآن کریم نے ان دونوں شرائط کو کس وضاحت سے بیان کیا ہے۔ سورۂ حدید میں ہے کہ "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح قوانین دے کر بھیجا، یعنی ان کے ساتھ آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"۔ یہ تو ہی آسمانی ہدایت۔ اس کے بعد کہا وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ ...... اور ان ہدایات کے ساتھ ہم نے "شمشیرِ خارہ شگاف" بھی نازل کی۔ اس میں بڑی سختی اور صلابت ہوتی ہے اور جب اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ نوعِ انسانی کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی ہے۔ یہ سب انتظام ہم نے اس لئے کیا لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَ رُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ (۲۵/۵۷)۔ تاکہ خدا دیکھے کہ تم میں سے کون، اس کی اور اس کے رسولوں کی امداد "بالغیب" کرتا ہے۔ یہاں "بالغیب" کا لفظ بڑا غور طلب ہے۔

نصرت کے لئے تلوار کی ضرورت

دینِ خداوندی کے پروگرام کے ابتدائی مراحل میں، مشکلیں ہی مشکلیں اور مصائب ہی مصائب ہوتے ہیں۔ اس میں مسلسل محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور کوئی محسوس نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ اس زمانے میں، اس قدر جانکاہ مشقتیں وہی برداشت کر سکتا ہے جسے (کسان کی طرح) اس بات کا یقین ہو کہ یہ پروگرام، ایک دن بڑے شاندار نتائج مرتب کرے گا۔ اس پروگرام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان ہی انسان کو اس قدر مسلسل محنت پر آمادہ کر سکتا اور ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ اسے "ایمان بالغیب" کہتے ہیں، جسے، قرآنِ کریم کے آغاز میں، کامیابی کی بنیادی شرط قرار دیا گیا ہے (۲/۳)۔ اسی "نصرت بالغیب" کا ذکر (۲۵/۵۷) میں آیا ہے۔

ضمناً، ہم، خدا کی طرف سے تائیدِ غیبی کی توقعات وابستہ کرتے ہیں اور خدا ہم سے "تائیدِ غیبی" کا مطالبہ کرتا ہے! اسی کے لئے اس نے کہا ہے کہ اے جماعتِ مومنین! کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ (۶۱/۱۴)

تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ یہی بات حضرت عیسیٰ نے بھی اپنے متبعین سے کہی اور انہوں نے اس پر کس طرح لبیک کہا۔ [یہ ایک الگ داستان ہے جسے میں نے اپنی کتاب "شعلۂ مستور" میں تفصیل سے بیان کیا ہے]۔

اس نصرت کا عملی مظاہرہ، سب سے پہلے، بدر کے میدان میں ہوا جہاں ایک طرف وہ جماعت تھی جو دینِ خداوندی کے قیام کی خاطر، شمشیر بدست میدان میں نکل آئی تھی — اسے قرآن نے " قتال فی سبیل اللہ" کہہ کر پکارا ہے۔ اور دوسری طرف مخالفین کی جماعت، جس کا قتال " فی سبیل الطاغوت" تھا۔

بدر کا میدان

جماعتِ مومنین، خدا کی مدد، اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر، کر رہے تھے اور ان کی مدد، خدا کے قانون اور نظام کی حقانیت اور صداقت کر رہی تھی۔ اس مقام پر کہا کہ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (۳/۱۲)۔ اس کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ "جو بھی اس طرح خدا کی مدد حاصل کرنا چاہے — مَنْ يَّشَآءُ — خدا اس کی مدد کرتا ہے"، اور یہ بھی کہ "اس طرح خدا اپنے قانونِ مشیت کے مطابق مدد کیا کرتا ہے"۔ یہ مدد یونہی اتفاقیہ (ACCIDENTALLY) حاصل نہیں ہو جاتی۔ قاعدے اور ضابطے کے مطابق (RATIONALLY) حاصل ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ (۳/۱۲)۔ اس میں اربابِ بصیرت صاحبانِ فکر و نظر کے لئے سامانِ عبرت ہے۔ عبرت کے معنی ہوتے ہیں دلائل و براہین کی رُو سے، اسباب پر غور کر کے نتیجہ تک پہنچنا۔ جو بات اس طرح واقع ہو کہ اس کے متعلق پتہ ہی نہ چل سکے کہ وہ کیسے ظہور پذیر ہو گئی ہے، (تائیدِ غیبی کا تصور ایسا ہی ہوتا ہے) اس پر علم و بصیرت کی رُو سے دعوتِ غور و فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ نصرتِ خداوندی تھی جس کے متعلق کہا تھا کہ وہ جماعتِ مومنین کے لئے فرحت و شادمانی کا موجب بنے گی (۳۰/۵)۔

ملائکہ کے ذریعے مدد

ان معرکوں میں، ملائکہ کے ذریعے جس مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق وہیں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس سے مقصود یہ تھا کہ جماعتِ مومنین کو اطمینانِ قلب حاصل ہو (۸/۹-۱۰) اور اس طرح ان کے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ (۸/۱۲)[1] — یہی ثبات و استقامت ہے جس سے خدا کی نصرت

---

[1] ان امور کی تفصیل میری کتاب "معراجِ انسانیت" میں ملے گی۔

حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا اگر تم مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرو گے اور قانونِ خداوندی کے پابند رہو گے، تو تمہیں نصرتِ خداوندی حاصل ہوگی (۳/۱۲۵-۱۲۲)۔ اگر تم میں سو مجاہد ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔ وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (۸/۶۶)۔ اس طرح خدا، ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس نصرتِ خداوندی کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ ۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْھَبَ رِیْحُکُمْ ۔ باہمی جھگڑا مت کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ وَ اصْبِرُوْا ۔ ثابت قدم رہو۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ؔ (۸/۴۶)۔ یاد رکھو! خدا ان کا ساتھ دیا کرتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں اور جن لوگوں کو اس طرح خدا کی نصرت اور معیّت (رفاقت) حاصل ہو جائے، ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۔ جب خدا تمہاری مدد کریگا تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکے گا۔ وَ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ (۳/۱۵۹)۔ اور اگر وہی تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد تمہاری مدد کون کر سکے گا۔ اس غلبہ و نصرت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ؔ(۳/۱۳۸)

اگر تم مومن ہوئے تو تم سب پر غالب رہو گے۔

یہ ہے وہ جماعت جسے خدا کی نصرت حاصل ہوتی ہے۔

چودھواں باب

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ

(جسے چاہے عذاب دے، جسے چاہے بخش دے؟)

قرآنِ کریم کی بعض آیات میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں۔ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (۳/۱۲۸)۔ اور ان کا لفظی ترجمہ کیا جاتا ہے ـــــ خدا جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دیدے ـــ اور اس ترجمہ کی بنیاد پر جو عمارت استوار کی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ سلسلۂ رشد و ہدایت اور قانونِ مکافاتِ عمل کا آخری نتیجہ یا ماحصل، عذاب و مغفرت ہے۔ اور اگر اس کی بھی یہی صورت ہے کہ اس

عذاب و مغفرت کے معنی

کے لئے نہ کوئی اصول مقرر ہے نہ کوئی قاعدہ اور قانون ـــــ وہ جسے چاہے عذاب دے دے، جسے چاہے بخش دے ـــــ تو اس سارے سلسلہ کی ضرورت کیا ہے؟ یہ تو سعدی کے الفاظ میں "مزاجِ شاہاں" والی بات ہو گئی کہ۔

ـــــ گاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند، وگاہے بہ سلامے بر نجند ـــــ کبھی اچھے موڈ میں ہوں تو گالی دینے والے کو انعام واکرام سے نواز دیں اور اگر موڈ خراب ہو تو سلام کرنے والے کو تختۂ دار پر لٹکوا دیں۔ ظاہر ہے کہ انداز خدا کے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا، ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ قرآنِ کریم سے اس باب میں کیا راہ نمائی ملتی ہے۔

جب ہم عذاب کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں جہنم کا نقشہ آجاتا ہے جس میں "گنہگار" عذابِ الیم میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ جہنم برحق ہے اور اس کا عذاب بھی حقیقت۔ لیکن قرآنِ کریم کی رُو سے عذاب، جہنم تک ہی محدود و مختص نہیں۔ انسان کی ہر غلط روش کے نقصان رساں نتیجہ کا نام عذاب ہے،

جو دنیا میں بھی سامنے آسکتا ہے اور آخرت میں بھی۔ ان نتائج کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ قرآنِ کریم نے مجرم کی اُس سزا کو بھی، جو اُسے عدالت سے ملتی ہے، عذاب کہہ کر پکارا ہے۔

جہاں تک مغفرت کا تعلق ہے اس کے معنی بھی "بخش دینے" کے نہیں (مادہ کے اعتبار سے) اس لفظ کے معنی ہیں سامانِ حفاظت بہم پہنچانا۔ ہم، قانونِ مکافاتِ عمل سے متعلق، چوتھے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیان مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس مہلت کے وقفہ میں، اگر انسان ایسے (اچھے) کام کرلے جن سے اُس نقصان کا ازالہ ہو جائے جو اس کے غلط عمل کی وجہ سے واقع ہونا تھا، تو وہ اس نقصان سے بچ جاتا ہے۔ اسے مغفرت کہتے ہیں۔ (ان امور کی تفصیل میری کتاب "جہانِ فردا" میں ملے گی)۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ عذاب کس طرح وارد ہوتا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو اس کے مورد ہوتے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں، یہودیوں کے جرائم کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنفُسُهُمْ أَن سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ ○ (۵/۸۰)۔ جو کچھ انہوں نے ... اپنے لئے پہلے بھیجا ہے، وہ بہت بُرا ہے۔ اس سے یہ خدا کے غضب کے مستحق قرار پاچکے ہیں اور اسی کی وجہ سے یہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔" مَا قَدَّمَتْ" کی تشریح پہلے سامنے آچکی ہے۔ اس کے معنی انسان کے وہ اعمال ہوتے ہیں جن کا نتیجہ ہنوز سامنے نہیں آیا ہوتا۔ اس آیت سے واضح ہے کہ عذاب انسانوں کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

عذاب، غلط اعمال کے نتیجہ کا نام ہے

سورۂ آلِ عمران میں، یہودیوں کے ان جرائم کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی وجہ سے وہ مستحقِ عذاب قرار پائے یعنی قوانینِ خداوندی سے انکار و سرکشی، انبیاء کا ناحق قتل اور ان لوگوں کا قتل جو حق و انصاف کا حکم دیتے تھے۔ اس کے بعد ہے فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۳/۲۰)۔ اے رسولؐ! تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کردے۔ اس سورہ میں، ذرا آگے چل کر ہے۔ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط (۳/۵۵)۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ دنیا اور آخرت میں شدید عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ ساری دنیا کا مال و دولت بطورِ فدیہ دے کر بھی اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتے۔ (۵/۳۶)۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّھُمُ الْعَذَابُ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ٥ (۶/۴۹)۔ جو لوگ ہمارے قوانین کی تکذیب کرتے ہیں، وہ اپنے فسق کی وجہ سے مبتلائے عذاب ہوں گے (نیز ۷/۱۶۵)۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ان مخالفینِ قریش نے ظلم و ستم پر اس لئے کمر باندھ رکھی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس مال و دولت بھی بہت ہے اور ہمارا جتھّہ بھی بڑا مضبوط ہے اس لئے ہم جو جی میں آئے کریں، ہمیں کون پوچھ سکتا ہے؟ کہا کہ ان کا یہی زعمِ باطل انھیں مبتلائے عذاب کردیگا (۹/۵۵) اور ان پر یہ عذاب تمھارے ہاتھوں میدانِ جنگ میں آئیگا۔ (۹/۵۲)؛ (۹/۸۵)۔

سورۂ ہود میں ہے کہ یہ لوگ نہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں، نہ عقل و ہوش سے۔ نہ کسی کی بات سنتے ہیں، نہ دیکھ کر راستہ چلتے ہیں۔ یہ مبتلائے عذاب نہیں ہوں گے تو اور کون ہوگا؟ (۱۸-۲۴/۱۱)؛ (۲/۷)۔

بعض آیات میں عذاب کے مقابلہ میں رحمت کا لفظ آیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے کہ اے جماعتِ مومنین! دیکھنا، تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے باہمی تفرقہ پیدا کرلیا اور خدا کی طرف سے واضح تعلیم مل جانے کے بعد اختلاف کرنے لگ گئے۔ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ٥ یہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ جس دن اعمال کے نتائج محسوس شکل میں سامنے آئیں گے تو بعض چہرے سیاہ ہوں گے اور بعض نورانی۔ جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے کہا جائے گا کہ تم نے ایمان لے آنے کے بعد پھر سے کفر اختیار کرلیا تھا (یعنی امتِ واحدہ بن جانے کے بعد، تفرقہ پیدا کرلیا تھا) فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا کُنْتُمْ تَکْفُرُوْنَ ٥ لہٰذا، تم اپنے کفر کی وجہ سے عذاب کا مزہ چکھو۔ اور جن لوگوں کے چہرے نورانی ہوں گے فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ (۱۰۲-۱۰۶/۳)۔ وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان اپنے اعمال کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے دوسرے الفاظ میں قانونِ مشیّت کہا جاتا ہے۔ جن آیات میں

من یشاء کا مطلب

مَنْ یَّشَآءُ کا فاعل خدا ہوتا ہے ان میں اس کا یہی قانونِ مشیّت مراد ہوتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے دعا کی کہ بارِالٰہا! ہمارے لئے دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں لکھ دے۔ خدا نے جواب میں کہا کہ عَذَابِیْٓ

اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (تم میرے عذاب سے ڈرتے ہو اور اس سے محفوظ رہنا چاہتے ہو، تو اسے سمجھ لو کہ) میرا عذاب تو میرے قانونِ مشیّت کے مطابق وارد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم یونہی اندھا دھند جسے چاہیں مبتلائے عذاب کر دیتے ہیں۔ لہٰذا، اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ باقی رہی میری رحمت، تو وہ ساری کائنات کو محیط ہے۔ لیکن انسانوں میں سے ہم اسے ان لوگوں کے لئے لکھ دیتے ہیں جو تقویٰ شعار ہوتے ہیں، ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کرتے ہیں اور ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں (آخری دَور میں یہ رحمت ان کے حصے میں آئے گی) جو ہمارے اس نبیٔ اُمّیؐ کا اتّباع کریں گے جس کا ذکر وہ تورات اور انجیل میں موجود پائیں گے۔ جو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا .... (۱۵۵ــ ۱۵۶/۷)۔ یہاں سے واضح ہو گیا کہ عذاب اور رحمت کے لئے اصول اور قانونِ مشیّت کیا ہے اور مَنْ یَّشَآءُ کا مطلب کیا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ اے رسولؐ! میرے بندوں سے کہہ دو کہ آپس میں ہمیشہ اچھی باتیں کیا کریں۔ خوش معاملہ رہیں، کیونکہ شیطان چاہتا ہے کہ تم میں نزاع اور مخاصمت کا بیج بو دے۔ اس کا اتباع نہ کریں۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے بعد ہے رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ۔ خدا تمہارے اعمال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اِنْ یَّشَاْ یَرْحَمْکُمْ اَوْ اِنْ یَّشَاْ یُعَذِّبْکُمْ۔ اگر وہ (اعمال) اس کے قانونِ مشیّت کے مطابق ہوئے تو تم اس کی رحمت کے مستحق قرار پاؤ گے۔ اگر اس کے خلاف ہوئے تو اس کا عذاب تم پر وارد ہو جائے گا۔ اب ان میں سے جس کا جی چاہے، خدا کی رحمتوں کے دروازے اپنے سامنے کھول لے جس کا جی چاہے اس کا عذاب اپنے اوپر وارد کر لے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْهِمْ وَکِیْلًا (۱۷/۵۴)۔ اے رسولؐ! ہم نے تمہیں ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا کہ انہیں زبردستی سیدھے راستے پر چلاؤ تاکہ ان پر خدا کی رحمتوں کا سایہ رہے۔

اب مغفرت کی طرف آئیے۔ اس کی دو شکلیں ہوں گی۔

مغفرت کی دو شکلیں

آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب کسی بستی میں وبائی امراض پھیلتے ہیں تو کمزور آدمی ان کا جلد شکار ہو جاتے ہیں اور جن میں قوّتِ مدافعت (POWER OF RESISTANCE) زیادہ ہوتی ہے، وہ ان سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ وہ سامانِ مغفرت

(حفاظت) ہے جو انسان کو حُسنِ عمل سے حاصل ہوتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ مبتلائے عذاب ہوتا ہی نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بیماری نے حملہ کر دیا۔ بیمار کی جان تو بچ گئی لیکن وہ بہت کمزور ہو گیا۔ اس پر، معالج اس کے لئے ایسی دوائیاں اور غذا تجویز کرتے ہیں جن سے اس کی کھوئی ہوئی قوت عود کر آئے بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقت ور ہو جائے تاکہ اس پر مرض دوبارہ حملہ نہ کرے۔ یہ مغفرت کی دوسری شکل ہے۔ یہ توبہ سے حاصل ہوتی ہے۔

توبہ کے معنی

اس مقام پر توبہ کا قرآنی مفہوم بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ آپ نے کسی گاؤں جانا ہے۔ راستے میں کوئی دوراہا آیا اور آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا۔ کچھ دُور جا کر آپ کو احساس اور علم ہوا کہ راستہ غلط ہے۔ اس مقام پر آپ کیا کریں گے؟ پچھلے پاؤں اس مقام کی طرف لوٹ آئیں گے جہاں سے آپ کا قدم اس غلط راستے کی طرف اُٹھا تھا۔ اس مقام پر اس طرح واپس آجانے کو **توبہ** کہتے ہیں۔

لیکن اس مقام پر واپس آجانا ہی تو کافی نہیں۔ وہاں سے پھر صحیح راستے پر چلنا بھی تو ضروری ہے۔ اسے عملِ صالح (یعنی صحیح کام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھئے قرآنِ کریم اسے کس وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ... (۴/۱۷)۔ قانونِ خداوندی کے مطابق توبہ ان لوگوں کی ہے جو سہواً کوئی غلط قدم اٹھا لیں اور اس کے بعد جونہی اس کا احساس ہو، فوراً پیچھے کی طرف لوٹ آئیں۔ یہ ہیں وہ جن کی طرف خدا بھی لوٹ کر آجائے گا۔ یہ توبہ کا پہلا قدم ہے۔ اس کا اگلا قدم ہے فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ۝ (۲۸/۶۷)۔ اس طرح واپس آجانے کے بعد، وہ اس حقیقت پر یقینِ محکم رکھے کہ سیدھا راستہ کونسا ہے اور اُلٹا کونسا اور پھر صحیح راستے پر گامزن ہو جائے۔ تب توبہ مکمل ہوگی۔

حسنات سے سیّات کا ازالہ ہو جاتا ہے

یہ مغفرت کی دوسری شکل ہوگی اس کے لئے اصول یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ یاد رکھو! اچھے کاموں کے خوشگوار نتائج، غلط کاموں کے نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی جو شخص غلطی ہو جانے کے بعد اس پر اڑا رہے، وہ عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ جو اس سے باز آ کر اپنی اصلاح کر لے، وہ عذاب سے بچ جائے گا۔ دیکھئے! قرآن کریم نے اس حقیقت کی کس طرح وضاحت کی ہے۔ سورۂ مائدہ میں پہلے کہا کہ سارق (چور) کی سزا یہ ہے۔ اس کے بعد کہا کہ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ لیکن جو مجرم اپنے کئے پر نادم ہو اور اس روش سے باز آ جائے۔ اور اپنی اصلاح کر لے، تو خدا اس کی طرف لوٹ آئے گا۔ یقیناً خدا مغفرت اور رحمت عطا کرنے والا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ عذاب اور مغفرت (عام الفاظ میں سزا اور معافی) کو ساتھ ساتھ رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ سوال اس لئے اُبھرتا تھا کہ یہودیوں کے ہاں سزا ہی سزا تھی، معافی کی گنجائش نہیں تھی۔ اور عیسائیوں کے ہاں رحم (MERCY) ہی رحم (MERCY) تھا، سزا کا تصور ہی نہیں تھا۔ اس کے جواب میں کہا کہ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اس عظیم سلسلۂ کائنات میں خدا کا اقتدار کس طرح کارفرما ہے؟ یہ اس کے قوانینِ مشیّت کی رو سے کارفرما ہے۔ اسی قسم کے قوانینِ مشیّت، انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ انہی کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ سزا کسے ملنی چاہیئے اور درگذر کس سے کر دینا چاہیئے۔ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۵/۴۰-۳۸)۔

سزا اور معافی

آپ نے غور فرمایا کہ عذاب (سزا) کس مجرم کو دیا جاتا ہے اور مغفرت کس کی ہوتی ہے؟ کیا اس کا فیصلہ اس طرح ہوتا ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے سزا دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے؟ نہیں۔ اصول یہ بیان ہوا ہے کہ جو مجرم اپنے کئے پر نادم ہو کر اپنی اصلاح کر لے، اسے معاف کر دیا جائے (یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ) اور جو جرائم سے باز نہ آئے اسے سزا دی جائے۔ (وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ)۔

یہ ہے ان الفاظ کا قرآنی مفہوم، اور یہ ہے وہ اصول جس کے مطابق اس امر کا فیصلہ ہوتا ہے کہ ملزم مستحقِ سزا ہے یا سزاوارِ عفو۔ اس سلسلہ میں کہا کہ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ

اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡہُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِہِ اللّٰہُ جو کچھ تمہارے دل میں ہے تم اسے ظاہر کر دیا پوشیدہ رکھو، خدا کے قانونِ مکافات پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ وہ تمام امور کا حساب کر لیتا ہے۔ فَیَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (۲۸۴/۲)۔ اس کے بعد اس امر کا فیصلہ ہوتا ہے کہ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق، کسے مغفرت مل سکتی ہے اور کون مستحقِ عذاب ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡحَمُ مَنۡ یَّشَآءُ (۲۹/۲۱) جو شخص، خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق، سزا بھگتنا چاہے، وہ ویسی روش اختیار کر لے، جو مستحقِ رحمت بننا چاہے، وہ ویسے کام کرے۔

خدا کی کوئی چاہیتی اولاد نہیں

سورۂ مائدہ میں ہے کہ یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چاہیتی اولاد ہیں اس لئے ہو نہیں سکتا کہ خدا ہمیں عذاب دے۔ اس کے جواب میں پہلے یہ کہا کہ اگر حقیقت یہی ہے جیسے تم کہتے ہو تو اُخروی عذاب کی بات کو چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ کہ اگر تم واقعی اس کی چہیتی اولاد ہو تو فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ۔ خدا تمہارے جرائم کے بدلے تمہیں اس دنیا میں سزا کیوں دیتا ہے۔ اس کے بعد کہا کہ خدا کی کوئی چہیتی اولاد ہے، نہ سوتیلی۔ اس کے ہاں تو مکافاتِ عمل کا قانونِ مشیت کارفرما ہے جس کا تمام انسانوں پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ۔ اسی قانون کے مطابق عذاب و مغفرت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ وَ لِلّٰہِ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ۔ (۵/۱۸)۔ اس کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے۔

اسی سورۃ میں یہ واضح کر دیا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝ (۵/۹)۔ جو لوگ ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں، خدا نے ان سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے ـــ سورۂ فتح میں، مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗ کی خصوصیاتِ کبریٰ اور محاسنِ جلیلہ گنانے کے بعد کہا کہ "اللہ نے ایمان اور اعمالِ صالح والوں سے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ (۴۸/۲۹)۔ سورۂ ہود میں اعمالِ صالح اور استقامت کا بدلہ مغفرت اور اجرِ کبیر بتایا گیا ہے (۱۱/۱۱)۔ اسی کو (۳۳/۳۵) میں دہرایا گیا ہے۔ سورۂ احزاب میں، مسلم مردوں اور عورتوں کی خصوصیات کی فہرست دینے کے بعد کہا ہے کہ اَعَدَّ اللّٰہُ

لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ (۳۳/۳۵)۔ خدا نے ان کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اس کے برعکس، کہیں کہا ہے کہ شرک سے مغفرت نہیں مل سکتی۔ (۴/۴۸؛ ۴/۱۱۶)۔ کہیں یہ کہ جو لوگ کفر اور ظلم کے مرتکب ہوں (اور اپنی ان حرکات سے باز نہ آئیں) انہیں مغفرت نہیں مل سکتی۔ (۴/۱۶۸)۔

یہ ہے صحیح مفہوم، يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کا — یہ عقیدہ کہ خدا کے ہاں کوئی قاعدہ اور قانون مقرر نہیں، وہ جسے چاہے عذاب دے دے، جسے چاہے بخش دے، قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف اور خدا کے صحیح تصور کی نقیض ہے۔ دیکھئے، وہ کتنے پیارے انداز میں کہتا ہے کہ

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ (۴/۱۴۷)۔

اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاؤ اور اس کی نعمتوں کی قدردانی کرو، تو اس نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟

عذاب و مغفرت کے سلسلہ میں، قرآنِ کریم نے ایک اور اہم اصول کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ایک شخص نے ایک مہذب گھرانے میں جنم لیا۔ اس کی تعلیم و تربیت عمدہ پیمانے پر ہوئی۔ اس کا ماحول باشعور ہے۔ وہ قانون سے واقف ہے اور جرائم کے عواقب سے باخبر۔ ایک جرم اس سے سرزد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، اسی جرم کا ارتکاب ایک ایسے شخص سے ہوتا ہے جو جاہل بھی ہے اور گنوار بھی۔ اس کی زندگی ایسے ماحول میں بسر ہوئی ہے جہاں نہ شرافتِ نفس کا کوئی احساس تھا، نہ جرم سے چنداں ندامت۔ قرآنِ کریم کا تجویز کردہ اصول یہ ہے

مجرم کے احوال و کوائف کی نسبت سے سزا

کہ ان مجرموں کو ایک جیسی سزا نہ دی جائے۔ اسی اصول کے مطابق اس نے لونڈیوں[1] کے جرمِ زنا کی سزا، مہذب گھرانے کی مستورات کے مقابلہ میں نصف قرار دی ہے۔ (۴/۲۵) اور خاندانِ نبوی کی محترم خواتین سے کہا ہے

---

[1] ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرہ میں غلام اور لونڈیاں عام تھیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۸ پر دیکھئے)

کہ اگر تم سے کوئی جرم سرزد ہوا تو تمہیں اس کی دگنی سزا ملے گی (۳۰-۳۲/۳۳)۔

انفرادی احوال و کوائف سے آگے بڑھ کر، معاشرہ کی اجتماعی کیفیت کا ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب معاشرہ میں خرابیاں عام ہو جائیں تو اس وقت شر، مستطیر ہو جاتا ہے۔ (۷/۷۶)،

اجتماعی سزا

یعنی اڑ کر جا لگتا ہے۔ جب ایسے معاشرہ پر تباہی آتی ہے تو اس کی لپیٹ میں مجرم اور پاکباز سب آجاتے ہیں۔ اسی لئے اس نے جماعت مومنین سے کہا ہے کہ ایسا انتظام کرو کہ معاشرہ اس قسم کے سیلاب کی لپیٹ میں نہ آجائے۔ وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ..... (۸/۲۵)۔ اس فتنہ کی نگہداشت کرو۔ اس سے بچنے کی تدبیر کرو کہ جب وہ آجاتا ہے تو پھر خاص طور پر انہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جن کے جرائم کی وجہ سے وہ تباہی آئی تھی۔ اس کی زد میں سب آجاتے ہیں۔ مثلاً محکمہ انہار یا تعمیرات کی بددیانتی یا غفلت سے اگر دریا کا بند ٹوٹ جائے تو اس سیلاب سے صرف انہی اہلکاروں کے مکانات منہدم نہیں ہوتے، اس سے بستیوں کی بستیاں غرقاب ہو جاتی ہیں۔ وہ فتنہ کسی خاص حلقے تک مخصوص و محدود نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ 'سیلاب نہ پُرسد کہ در خانہ کدام است' ۔ اس قسم کی اجتماعی تباہیوں میں بے قصور افراد بھی گرفتارِ بلا ہو جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد،

فرد معاشرہ کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے

تقدیر کے ہاتھوں مجبور نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، اجتماعی زندگی کی اصلاح پر زور دیتا ہے اور افراد سے کہتا ہے کہ وہ تقدیر کا رونا رونے کے بجائے، معاشرہ کو صحیح (قرآنی) خطوط پر متشکل کرنے کی کوشش کریں۔ معاشرہ کے بدل جانے سے، افراد کی "تقدیریں" خود بخود بدل جائیں گی۔ الدّین، معاشرہ کے صحیح نظام کا نام ہے۔ ایسے معاشرہ میں نہ کہیں نالہ نیم شبی سنائی دیتا ہے، نہ فغانِ سحری۔ اس میں ہر طرف سے سلاماً سلاماً کی نشیدِ جانفزا فردوسِ گوش بنتی ہے۔

بہرحال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ عذاب و مغفرت کے ضمن میں قرآنِ کریم یہ اصول بیان کرتا ہے کہ اس کے تعیّن کے لئے فرد کے احوال و کوائف اور معاشرہ کی عمومی حالت کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۳۲۷)، (غلام اور لونڈیوں) کا ذکر آیا ہے ان سے اُسی زمانے کے غلام اور لونڈیاں مراد ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے غلامی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

کریم نے جہاں یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ سے پہلے یُحَاسِبۡکُمۡ کہا ہے، تو اس سے مراد بھی ہے کہ اس کا حساب کرتے وقت، خدا کا قانونِ مکافات اس کا پورا پورا لحاظ رکھتا ہے کہ اس جرم میں، فرد، اپنے طور پر کس حد تک ذمہ دار ہے اور وہ عناصر کس حد تک ذمہ دار جن پر اسے اختیار نہیں تھا۔ یہی وہ اصول تھا جس کی رُو سے، حضرت عمرؓ نے اس شخص کے ملازموں کو سزا نہیں دی تھی جو انہیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں دیتا تھا اور جس کی وجہ سے انہوں نے چُرا کر غلہ کھایا تھا۔ انہوں نے ان کے ملازموں کے بجائے، ان کے مالک کو سزا دی تھی۔ اسی طرح انہوں نے قحط کے زمانے میں، بھوک مٹانے کی حد تک غلہ چُرانے کی سزا موقوف کردی تھی۔ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ میں یہ حکمت بھی پوشیدہ ہے، یعنی خدا کا قانونِ مشیّت ان امور کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

خدا سے بخشش کی دعائیں

اس عقیدہ نے کہ نجات اور مغفرت، انسان کے اپنے اعمال سے نہیں ہوتی؛ یہ خدا کے فضل اور اس کی رحمت پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے بخشدے، جسے چاہے عذاب دے، اس قوم کو تباہیوں کے کن عمیق غاروں میں دھکیل دیا ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان کے ہاں یہ تصور عام ہو گیا کہ بدمعاملگیاں اور بد اخلاقیاں جتنی جی چاہے کرو، ہر نماز کے بعد (۳۳) دفعہ "استغفر اللہ" پڑھ لو اور صبح کی نماز کے بعد اس کی تسبیح پوری کر لو، سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ خدا سے ہر وقت "بخشش" کی دعا مانگتے رہو۔ وہ غفور الرحیم ہے، تمہیں ضرور بخش دے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس "بخش دینے" کی تہہ میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ خدا نے کہا تھا کہ تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِیۡۤ اُوۡرِثۡتُمُوۡهَا بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (۴۳/۷) یہ وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے میں، مالک بنایا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کی رُو سے، جنت اعمال کے بدلے میں ملتی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ جنت اعمال کے بدلے میں نہیں ملتی یہ خدا کی بخشش ہے۔ جسے وہ چاہے بخش دے۔ یعنی ان کے عقیدہ کے مطابق، جنت اعمال کے بدلے میں نہیں، خدا سے "بخشش" کے طور پر ملتی ہے۔ اس لئے یہ ہر وقت بخشش کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ ہم جنت بھی، کچھ کرنے سے نہیں، بلکہ خیرات کے طور پر لینا چاہتے ہیں ــــ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است — بہشتے بہرِ اربابِ ہمم است
بگو ہندی مسلماں را کہ خوش باش — بہشتے "فی سبیل اللہ" ہم است

یہ گداگروں کی قوم، بہشت بھی فی سبیل اللہ لینا چاہتی ہے! حالانکہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تاجزائے عملِ تست، جناں چیزے ہست (اقبالؒ)

یہ اس قوم کی کیفیت ہے جس کے خدا نے کہا تھا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ...... کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم ابھی تک ان جانگسل منازل سے گذرے ہی نہیں جن سے، اُممِ سابقہ گذر چکی ہیں. انہیں مخالفین کے مقابلہ میں اس قدر زہرہ گداز مصائب و تصادمات کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے پاؤں تلے سے زمین ہل گئی اور خود رسولؐ اور اس کے ساتھی پکار اُٹھے کہ بارِ الٰہا! تیری نصرت کب آئے گی؟ اس وقت انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ گھبراؤ نہیں! خدا کی نصرت بہت جلد آجائے گی (۲/۲۱۴). یہ ان کے خدا نے کہا تھا اور ان کے رسولؐ نے فرمایا تھا "جنت تلواروں کے سائے میں ہے"— اور اسی قوم کی اب حالت یہ ہے کہ یہ جنت، بھیک کے طور پر مانگتی ہے۔ یاللعجب۔ — دیکھا، مَا یَشَآءُ کے غلط مفہوم نے قوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے!

گنہگار ہونے پر فخر!

یہی نہیں، بلکہ یہ قوم اب اپنے گنہگار ہونے پر فخر کرتی ہے — ان کے ہاں بڑے بڑے پیشوایانِ مذہب تک، اپنے ناموں کے ساتھ "عاصی پُر معاصی" اور "مذنب" جیسے الفاظ لکھتے ہیں — اگرچہ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ الفاظ ازرہِ انکسار لکھے جاتے ہیں، لیکن نفسیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس "انکسار" کی تہہ میں، فخر کا جذبہ مضمر ہوتا ہے. — "عاصی" کے معنی مجرم ہیں. سوچئے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مجرم کہتے ہوئے شرمائیں نہیں، ان کے ہاں جرم کا ارتکاب وجۂ ندامت کس طرح ہو سکتا ہے؟ جرم کا وجۂ ندامت ہونا تو ایک طرف، ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جرم کا مرتکب نہ ہونا، بہت بڑے گناہ کی بات ہے. یہ بات آپ کے لئے شاید وجۂ تعجب ہو اور

اگر گناہ نہ کرو گے تو خدا تمہیں مٹا دے گا

آپ غالباً اسے باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، لیکن ہے یہ حقیقت. حدیث کی دو کتابوں کو صحیحین کہا جاتا ہے — یعنی صحیح ترین کتابیں — ان میں ایک بخاری ہے اور دوسری مسلم. صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ

والذی نفسی بیدہٖ۔ لو لم تذنبوا۔ لذھب اللہ بکم و لجاء بقوم یذنبون۔ فیستغفرون۔

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے[1]۔

جس قوم کے ہاں عقیدہ یہ ہو (اور اس عقیدہ کو وہ منسوب کرے حضور رسالتمآبؐ کی طرف) کہ اگر تم گناہ نہ کروگے تو خدا تمہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جو گناہ کرے گی اور پھر خدا سے بخشش مانگے گی، تو سوچئے کہ اس قوم میں اگر جرائم و معائب عام نہ ہوں گے تو اور کیا ہو گا۔

جب یہی عقیدہ ہمارے شاعروں کے ہتھے چڑھا تو پھر "خدا دے اور بندہ لے"۔۔۔ انہوں نے گناہوں کی اہمیت کو ایسے مزے لے لے کر بیان کیا کہ قوم کے نزدیک گناہ مقصدِ حیات اور حاصلِ کائنات بن گئے۔ کہیں کہا گیا کہ

میرے گناہ زیادہ ہیں یا تیری رحمت
الٰہی تو ہی بتا دے حساب کر کے مجھے!

دوسرا آگے بڑھا تو اس نے کہا۔

نصیبِ ماست بہشت اے خدا شناس برو — کہ مستحقِ کرامت گناہگاراں اند

فارسی اور اُردو کے بعد، پنجابی کی باری آئی تو شاعر دو قدم اور آگے بڑھ گیا اور کہا کہ

اوتھے کیہہ پرواہ اے راقبؔ، اوتھے بے پروائیاں
پھڑ لے عملاں والیاں نوں، چھڈ دیئے اوگن ہاراں نوں

---

[1] صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی حدیثیں کس زمانے میں اور کس مقصد کے لئے وضع کی گئی تھیں لیکن ہمارے ہاں انہیں اس قدر صحیح اور محکم مانا جاتا ہے کہ اسے امام مسلمؒ نے اپنے مجموعہ میں شامل کر دیا اور ہم اسے سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ (ترجمان القرآن جلد اوّل) میں اسے بڑے فخر سے نقل کیا ہے۔ ہم نے مندرجہ بالا ترجمہ بھی وہیں سے نقل کیا ہے تاکہ کسی کو اس میں شک نہ گذرے۔

(اے رقیب! خدا بڑا بے پرواہے[1] ہے۔ اس کی بے پروائیوں کا عالم یہ ہے کہ وہاں نیکوکار پکڑے جاتے ہیں اور گنہگار چھوٹ جاتے ہیں) اور ارباب تصوف کو تو اس قسم کا موقع خدا دے۔ انہوں نے اس باب میں کیا کیا نقش آرائیاں کی ہیں، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی نظروں سے تصوف کا لٹریچر گذرا ہے۔ مثلاً ایک حضرت صاحب فرماتے ہیں کہ ایک زاہد مرتاض نے جنگل میں بارہ برس تک بیٹھ کر خدا کی عبادت کی۔ بارہ سال کے بعد، ندا آئی کہ ہم نے تمہاری عبادت قبول کر لی ہے۔ مانگو، کیا مانگتے ہو؟ اب ان

ارباب تصوف کی لطائف نگاریاں

کی سمجھ میں نہ آئے کہ خدا سے کیا مانگیں۔ وہ اسی شش و پنج میں بیٹھے تھے کہ دیکھا، ایک مرد بزرگ سامنے سے آرہے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ جب انہوں نے بات بتائی تو اس بزرگ نے کہا کہ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ تم نے بارہ سال تک عبادت کی ہے، کہو کہ مجھے عدل چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے خدا سے کہا کہ میں عدل چاہتا ہوں۔ اس پر جواب ملا کہ بہت اچھا، ہم عدل کرتے ہیں۔ تم بارہ سال تک اس پتھر کے اوپر بیٹھے ہو۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اب بارہ سال تک یہ پتھر تمہارے اوپر بیٹھے ــــ اب انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ جسے انہوں نے مرد بزرگ سمجھا تھا شیطان تھا جس نے انہیں بہکا دیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے عدل مانگا تھا، عدل مل گیا۔ بارہ برس تک یہ پتھر کے نیچے بیٹھے رہے! اس کے بعد پھر بارہ برس تک خدا کی عبادت کی اور پھر ندا آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے! انہوں نے کہا کہ بارالہا! میں تیرا فضل مانگتا ہوں، عدل نہیں مانگتا۔ جواب ملا کہ ہم نے تمہیں قطب بنا دیا۔ یاد رکھو! عدل کا مطالبہ شیطان کا ہے۔ ہمارے بندے ہمیشہ فضل مانگتے ہیں!

سینٹ پال کی تعلیم کا اثر

آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کے عقائد کا سرچشمہ کونسا ہے؟ عیسائیت کی وہ تعلیم جسے سینٹ پال نے ایجاد کیا۔ آپ بائبل (عہد نامۂ جدید) میں، سینٹ پال کے خطوط دیکھئے۔ ان میں آپ کو لکھا ملے گا کہ

> تم کو نجات، عقیدہ کی رُو سے ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں؛ خدا کی بخشش ہے۔ یہ تمہارے اعمال کے سبب نہیں۔ (افسیون ۸ ـ ۲/۹)

---

[1] ہمارے ہاں اللہ الصمد کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اللہ بڑا بے نیاز یا بے پروا ہے!

دوسری جگہ ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان، شریعت کے اعمال کی وجہ سے نہیں، بلکہ، ان اعمال کے بغیر، عقیدہ کی بناپر راستباز ٹھہرتا ہے۔ (رومیوں کے نام۔ ۳/۲۸)

اسی بنا پر، عیسائیوں کے ہاں (GOD IS MERCY) کا عقیدہ عام ہوگیا۔ اور یہی وہ عقائد تھے، جو ہمارے ہاں بھی جزوِ دین، بلکہ مغزِ دین بن گئے اور ان کی تائید کے لئے اس قسم کی روایات وضع کرلی گئیں کہ

لن یدخل احد کم الجنۃ بعملہ[1]

تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال کی بدولت جنت میں نہیں جاسکے گا۔

یہ ہے یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ کے غلط مفہوم اور اس کے ترجمہ کا نتیجہ کہ "خدا جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے، جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔"

اور یہ ہیں عقیدۂ جبر (تقدیر) کی کرشمہ زائیاں اور تباہ کاریاں[2]!

---

[1] اس روایت کو تاج العروس نے نقل کیا ہے اور وہاں سے لین نے اپنے قاموس میں (حرف ب کے تحت) درج کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور اس قسم کی دیگر روایات وضعی ہیں۔

[2] عذاب و مغفرت کے متعلق مزید تفاصیل میری کتاب "جہانِ فردا" میں ملیں گی۔

پندرھواں باب

موت کا ایک دن معیّن ہے

کیا یہ حقیقت ہے یا محض شاعری ہے؟ ہمارے ہاں کا مروجہ عقیدہ تو یہی ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ ہر شخص کی عمر پہلے سے لکھی ہوتی ہے اور اس میں ایک ثانیہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی کی موت کا وقت نہیں آتا، اسے کوئی مار نہیں سکتا اور جب اجل آجاتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ موت ہی نہیں، بلکہ بیماری تک کے متعلق پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ فلاں وقت آئے گی اور پھر فلاں وقت چلی جائے گی، یا مریض کو ختم کر دے گی۔ لیکن اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں کو آپ دیکھئے۔ بیماری آتی ہے تو وہ اس کے علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ بیماری ذرا لمبی ہو جاتی ہے تو علاج بدلتے ہیں۔ بار بار پوچھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! بچے کا بخار کب تک ٹوٹے گا؟ یہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی ایسی دوائی دیجئے کہ بخار جلد ٹوٹ جائے — اور اگر یہ محسوس ہو کہ بیمار بچتا نہیں تو پھر اس کے لئے جس قدر تگ و دو کی جاتی ہے وہ ہمارے سامنے ہے — بڑے سے بڑا ڈاکٹر، قیمتی سے قیمتی دوائیاں، خدا کے لئے منتیں، نذر، نیاز، درگاہوں پر سجدہ ریزیاں، حضرت صاحب سے دعائیں، یہ سب کاہے کے لئے؟ اس لئے کہ بیمار موت سے بچ جائے۔ اس وقت کوئی یہ نہیں کہتا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے۔ وہ اس سے پہلے آ نہیں سکتی اور اگر اس کا وقت آگیا ہے تو آپ کے ہزار علاج معالجے اور لاکھ منتیں اور دعائیں اسے ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹال نہیں سکتیں۔ اگر مریض جانبر ہو جائے تو بڑے فخر سے کہیں گے کہ ہم نے یہ

ہمارا عقیدہ اور عمل!

علاج کرایا اور وہ کوشش کی۔ اور اگر وہ مرجائے تو پھر کہا جائے گا کہ ہم نے تو سب کچھ کر دیکھا لیکن اس کی لکھی ہی اتنی تھی۔ موت کا کیا علاج ہو سکتا ہے! اور اس وقت ان سے کوئی نہیں پوچھتا (نہ وہ خود ہی سوچتے ہیں) کہ جب موت نے اپنے وقت پر آکر رہنا تھا تو اس تگ و دو سے حاصل کیا تھا۔ یہ کچھ کیا کیوں؟ عقیدہ وہ اور عمل یہ! اور عقیدہ اور عمل کا تفاوت ہے جس سے قومیں تباہ ہوتی ہیں۔ اس سے نہ ارادے میں پختگی پیدا ہوتی ہے نہ عمل میں ثبات۔ کانپتے ہاتھوں سے کبھی نشانہ ٹھکانے پر نہیں بیٹھتا۔

اس عقیدے کی حکمت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس سے انسان کا دل خوف و ہراس سے مامون ہو جاتا ہے۔ وہ موت سے ڈرتا نہیں۔ اس میں بلا کی جرائیں اور قیامت کی بے باکیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے سپاہیوں کو بتایا اور سکھایا جاتا ہے کہ جس گولی پر تمہارا نام نہیں لکھا وہ تمہیں چھو تک نہیں سکتی اور جس پر تمہارا نام لکھا ہے، اس سے تم بچ نہیں سکتے ــــ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اس کی بھی تاکید کی جاتی ہے کہ اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان کرو۔ اپنے آپ کو جان بوجھ کر خطرے میں نہ ڈالو ــــ عقیدہ وہ بتایا جاتا ہے، عمل یہ سکھایا جاتا ہے!

موت ہر ایک کے لئے ہے

انسانی جسم کی مشینری، خدا کے قوانینِ طبیعی کے مطابق چلتی ہے اور انہی قوانین کے مطابق اس کی حرکت رُک جاتی ہے۔ اس مشینری کی حرکت کے اس طرح رُک جانے کو موت کہتے ہیں۔ موت ہر متنفس کو آنی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (۳/۱۸۴)۔ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (۴/۷۸)۔ خواہ تم کیسے ہی محکم اور مضبوط قلعوں کے اندر بھی پناہ گزیں کیوں نہ ہو، وہاں بھی آجائے گی۔ تم اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ (۶۲/۸)۔ حتیٰ کہ خود حضور رسالتمآب کے متعلق فرمایا کہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (۳۹/۳۰)۔ انہوں نے (تمہارے مخالفین نے) بھی مرنا ہے اور تم بھی وفات پاؤ گے۔

موت باذن اللہ کے معنی

سورۂ آلِ عمران میں ہے وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (۳/۱۴۴) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ کیا جاتا ہے ــــ کسی شخص کو خدا کے حکم (اذن) کے بغیر موت نہیں آسکتی۔ یہ ایک ایسی اجل ہے جو لکھی ہوئی ہے ــــ اس آیت میں اذن، کتاب اور اجل کے

الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ان الفاظ کا قرآنی مفہوم، اس سے پہلے (چھٹے باب میں) تفصیل سے بیان کیا جاچکا ہے۔ وہاں سے آپ دیکھیں گے کہ اذن کے معنی قانونِ خداوندی کے ہیں۔ اجل کے معنی میعاد یا وقفہ کے ہوتے ہیں اور جس مقام پر وہ میعاد ختم ہوتی ہے اسے بھی اجل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔ ان معانی کی رُو سے، مندرجہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی اور موت، قانونِ خداوندی کے تابع ہے۔ انسان کی پیدائش اور موت کے درمیانی وقفہ (اجل) کو اس کی عمر کہا جاتا ہے۔ اور اس وقفہ یا میعاد کا تعیّن، قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے۔ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸)۔ ہر میعاد اور وقفہ کے لئے ایک قانون ہے۔ جب اس وقفہ کا آخری لمحہ آجاتا ہے (جسے موت کہا جاتا ہے) تو اس وقت اس میں کمی بیشی (تاخر و تقدم) نہیں ہو سکتی (۶۳/۱۱) یعنی موت کہتے ہی اس لمحہ کو ہیں جب انسان کی عمر ختم ہو جائے، لہٰذا اس لمحہ کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ پہلے آگیا ہے یا بعد میں۔ سوال یہ ہے کہ پیدائش اور موت کے درمیان جو وقفہ ہے اور جسے عمر کہا جاتا ہے، وہ گھٹ بڑھ سکتا ہے یا نہیں، اس میں کمی اور بیشی ہو سکتی ہے یا نہیں۔

کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے

اس قسم کے الفاظ تو ہم ہر روز بولتے ہیں لیکن اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ اس نے بڑی لمبی عمر پائی ہے یا وہ چھوٹی عمر میں مر گیا۔ لمبی یا چھوٹی، (یا اسی قسم کے دیگر الفاظ) اضافی (RELATIVE TERMS) ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ایک گز لمبی لکڑی لاؤ۔ وہ اگر چار فٹ لمبی لکڑی لے آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ زیادہ لمبی ہے اور اگر دو فٹ کی لے آتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ چھوٹی ہے۔ لمبی اور چھوٹی، کمی اور بیشی، یا گھٹنے اور بڑھنے کے سلسلہ میں ایک پیمانہ مقرر کرنا ہوتا ہے اور اس پیمانہ کی نسبت سے یہ الفاظ بولے جا سکتے ہیں۔ اب سوچئے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اس شخص نے بڑی لمبی عمر پائی ہے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگوں کی جتنی عمر ہوتی ہے یہ شخص اس سے زیادہ عرصہ تک زندہ رہا ہے۔ کسی ملک یا قوم کے لوگوں کی عام (اوسط) عمر کو، عمرِ طبیعی کہا جاتا ہے۔ اور اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قومیں، حفظانِ صحت کے اصولوں کی کاربندی، عمدہ خوراک، امراض کی روک تھام کی تدابیر، معیارِ زیست کی بلندی وغیرہ سے اپنے ہاں کی "عمرِ طبیعی" بڑھا

لیتی ہیں ــــــ اور بڑھائے جا رہی ہیں۔ ان کے برعکس، جو قومیں ان امور کا خیال نہیں کرتیں، ان کے ہاں کی عمرِ طبیعی، نسبتاً کم ہوتی ہے ــــــ اقوام کی طرح افراد کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جو لوگ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں اور ان اسباب و ذرائع پر نگہداشت جن سے جسم کی مشینری عمدگی سے چلتی ہے، وہ (اگر کوئی حادثہ نہ ہو جائے) تو لمبی عمر تک جیتے رہتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ہاتھوں اپنی صحت کا ستیاناس کر لیتے ہیں، وہ جلدی مر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خودکشی کرنے والا جس وقت چاہے اپنی عمر کو ختم کر سکتا ہے۔

اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَ مَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ (۳۵/۱۱) ــــــ نہ کسی کو لمبی عمر ملتی ہے، نہ کسی کی عمر میں سے کچھ کم کیا جاتا ہے، بجز اس کے کہ یہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص کی عمر کا تعین پہلے سے کیا جا چکا ہو، (یعنی اس کی پیدائش سے پہلے ہی یہ لکھ دیا گیا ہو کہ اس کی عمر اتنی ہوگی) تو پھر اس کی عمر کے، اس سے کم یا زیادہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق خدا نے لکھ دیا کہ اس کی عمر پچاس برس کی ہوگی۔ خدا کے اس فیصلے (تقدیر) کے بعد، یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ پچاس برس سے پہلے مر جائے، یا اس کے بعد زندہ رہے۔ عمر کے بڑھ جانے یا گھٹ جانے کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عمر کا تعین پہلے سے نہ ہو چکا ہو۔ بنابریں، مندرجہ بالا آیت اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ عمروں کا تعین پہلے سے نہیں ہو جاتا۔ طبیعی زندگی، طبیعی قوانین کے مطابق گزاری جاتی ہے۔ ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان لمبی عمر پاتا ہے۔ انکی خلاف ورزی کرنے سے وہ اپنی عمر گھٹا لیتا ہے۔ واضح رہے کہ جب ہم طبیعی قوانین کہتے ہیں تو اس میں ماں باپ کی طرف سے منتقل ہونے والے وراثتی اثرات، رحمِ مادر میں جنین کی مناسب حفاظت و پرورش، پیدائش کے بعد، اس کی غذا اور حفظانِ صحت کی دیکھ بھال، عام معاشرتی حالات، اعصابی سکون و توازن کے اسباب و علل، علاج معالجہ کے انتظامات، حادثات کی روک تھام کی تدابیر وغیرہ سب شامل ہیں۔ یہی وہ پیمانے ہیں جن کے مطابق عمروں کا تعین ہوتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں نَحْنُ

موت کے پیمانے (قوانین)

قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (۵۶/۶۰)۔ ہم نے تمہارے لئے موت کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔ جو قوم، یا جو افراد

جس قسم کا پیمانہ چاہیں اپنے لئے منتخب کریں۔ اس کے لئے تاکید کردی گئی کہ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵)۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو[۱]۔ سوچئے کہ اگر ہلاکت کا وقت پہلے سے متعین ہوتا تو اس تاکید سے مطلب کیا تھا؟ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ پہلے سے طے تھا کہ فلاں شخص نے، فلاں دن اور فلاں وقت، فلاں طریق سے مرجانا ہے، تو جو شخص کسی کو قتل کردے، اسے مجرم کیوں قرار دیا جائے۔ قرآن کی رُو سے، قتل تو سنگین ترین جرم ہے جس کی سزا موت ہے۔ لیکن اگر "تقدیر کی رُو سے" مقتول کی موت اسی طرح، اس کے ہاتھوں، واقع ہونی تھی تو اس میں مجرم کا کیا قصور؟ قرآنِ کریم نے قتلِ عمد (بالارادہ کسی کو قتل کر دینے) اور قتلِ خطا (کسی کے ہاتھوں، سہواً یا بلاارادہ کسی کی موت واقع ہوجانے) میں فرق کیا ہے اور ان کی سزائیں مختلف تجویز کی ہیں۔ قتلِ خطا میں خوں بہا لیا جاسکتا ہے لیکن قتلِ عمد میں سزا دی جاتی ہے۔ (۹۲- ۴/۹۳) "عمد اور خطا" کے اس فرق سے بھی ظاہر ہے کہ اس باب میں مجرم کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ پہلے سے مقدر ہو تو پھر مجرم کا جرم کیا اور اس کی نوعیت میں فرق کے کیا معنی؟ (ان امور کے متعلق تفصیلی گفتگو آئندہ چل کر کی جائے گی)۔

اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ سورۂ مائدہ میں ہے کہ یاد رکھو۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت (فساد) کے جرم کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہو، یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (۵/۳۲)۔ اور جس نے کسی ایک متنفس کو بھی زندگی عطا کردی (اس کی جان بچادی) تو یوں سمجھو گویا اس نے تمام نوعِ انسان کو زندگی عطا کردی۔

اگر موت کا ایک دن معین ہے تو کوئی شخص کسی کی جان کیسے بچا سکتا ہے! کسی کو مار دینے یا اس کی جان بچا دینے کا امکان تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب یہ امور پہلے سے فیصلہ شدہ نہ ہوں

---

[۱] اگرچہ اس آیت کا تعلق قوموں کی اجتماعی حیات و موت سے ہے، لیکن یہی اصول افراد پر بھی کارفرما ہے۔ فرد بھی تو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈال لیتا ہے جس سے اُسے روکا گیا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ، اور تو اور، میدانِ جنگ میں، سر بکف نکلنے والے سپاہیوں تک سے بھی تاکید کر دی کہ خُذُوا حِذْرَكُمْ (۴/۷۱)۔ اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان ساتھ رکھو۔ ہر قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کرو۔ حتیٰ کہ، یہاں تک بھی تاکید کر دی کہ خطرہ کے عالم میں اجتماعِ صلوٰۃ کے لئے یہ شکل اختیار کرو کہ ایک گروہ شاملِ اجتماع ہو تو دوسرا گروہ پیچھے کھڑا ان کی حفاظت کرے اور ایک سجدہ کے بعد، وہ گروہ پیچھے آکر کھڑا ہو جائے اور محافظ دستہ شاملِ اجتماع ہو جائے۔ (۴/۱۰۲) ظاہر ہے کہ اگر کسی سپاہی کو وہ گولی لگنی ہی نہیں جس پر اس کا نام نہ لکھا ہو اور جس گولی پر اس کا نام لکھا ہو، اس سے وہ بچ ہی نہیں سکتا، تو اس قسم کی حفاظتی تدابیر بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اب رہا یہ کہ انسان کا سینہ کس طرح خوف دہراس سے مامون ہو سکتا ہے اور وہ موت کے ڈر پر کس طرح قابو پا سکتا ہے، تو اس کے لئے، موت اور حیات کا وہ نظریہ سامنے لانا چاہیئے

ایمان بالآخرت سے انسان موت سے بے خوف ہو سکتا ہے

جسے قرآن اس شرح و بسط سے پیش کرتا ہے وہ نظریہ یہ ہے کہ زندگی، یہی طبعی زندگی نہیں۔ اس کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ حیات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، پیکرِ انسانی تک پہنچتی ہے۔ اس سطح پر جو انسان قرآن کے تجویز کردہ پروگرام کے مطابق، زندگی بسر کرے، اس میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان ارتقائی منازل کا اگلا میدان موت کے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) موت اور حیات کا سلسلہ پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو (TEST) کر سکو کہ تم میں زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی کس قدر صلاحیت پیدا ہو چکی ہے۔

اب آپ سوچیئے کہ جس نظریہ کی رُو سے، موت، زندگی کے وسیع تر، رفیع تر، حسین تر، امکانات وا کرنے کا باب (دروازہ) ہو، اس نظریہ کے حاملین کے نزدیک موت کوئی ڈرنے کی چیز ہوگی؟ وہ موجودہ زندگی کی حفاظت کے لئے کوشش اس لئے کرے گا کہ اسے اپنی صلاحیتوں کے بیدار اور اپنی ذات کو مستحکم کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ اور اس کے بعد جب موت سامنے آکر اس منظر پر

سے پردہ اٹھا دے گی جہاں زندگی کی درخشندہ ترشمعیں فروزاں ہوں گی، تو وہ موت کو لپک کر گلے سے لگا لے گا۔ یہی وہ اربابِ ایمان و عمل، سعادتمند افراد ہیں جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید، تبسم برلبِ اوست

جو طالب علم، امتحان میں کامیابی کے بعد، اگلی جماعت میں چلا جاتا ہے، اسے پچھلی جماعت کے چھوڑنے کا صدمہ نہیں ہوتا وہ تو اس پر جشنِ مسرت مناتا ہے۔

جن اعمالِ حیات سے، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے، ان کی تفصیل تو طول طویل ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب زندگی کے کسی طبعی تقاضے اور مستقل قدر میں تصادم ہو (ان میں ۳۱۴ پڑھ جائیے) تو اس وقت مستقل قدر کو طبعی تقاضے پر ترجیح دی جائے۔ جس قدر وہ طبعی تقاضا زیادہ جاذب، عزیز اور گراں بہا ہوگا، اسی قدر اس عمل کا وزن زیادہ ہوگا۔ طبعی زندگی کے تقاضوں میں، تحفظِ خویش (جان کی حفاظت) کا تقاضا سب سے زیادہ شدید اور گراں بہا ہوتا ہے۔ جب ایسا وقت آجائے کہ مستقل قدر (حق) کی حفاظت کے لئے جان تک دیدینی پڑے، تو قرآن کہتا ہے کہ اس طرح جان دینے والے کو مردہ کہو ہی نہیں — بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (۲/۱۵۴) زندہ درحقیقت وہی ہے لیکن تم طبعی زندگی کے شعور کی سطح سے، اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اقبالؒ اسے (مستقل اقدار کیساتھ) عشق سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

مقتولین فی سبیل اللہ کا مقام

کھول کے کیا بیان کروں، سرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ حیاتِ بے شرف

یہ ہے وہ ایمان جس سے مردِ مومن کا قلب، رعد آسا جراٴتوں اور برق تمثال بے باکیوں کا شعلۂ جوّالہ بن جاتا ہے اور وہ "بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتا ہے" اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

خودی ہے زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

وہ خاکِ مجبور کی طرح "موت کے متعیّن وقت" کا انتظار نہیں کرتا، بلکہ، حق و باطل کی آویزش میں، موت

کو خود آواز دے کر بلا لیتا ہے کہ اس کی ہم آغوشی سے اُسے حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔
اس کا ایمان ہوتا ہے کہ ______ ہے کبھی جاں، اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
اگر موت کا وقت، مقام، اور طریق پہلے سے متعین ہوتا تو ان مردانِ مجاہد کو، حق کی خاطر، اپنے پروگرام کے مطابق، مخالفین کی جان لینے اور اپنی جان دیدینے کی تاکید کیوں کی جاتی۔

سولھواں باب

آہ، بیچاری بدقسمت!

مَیں نے طلوعِ اسلام کنونشن، منعقدہ مارچ ۱۹۶۶ء سے خطاب کرتے ہوئے "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا، جو بڑا مقبول ہوا تھا۔ اس کے ابتدائیہ میں، میں نے تمثیلی انداز میں کہا تھا۔

نور خاں کی بیوی کے 'اوپر تلے' چار لڑکیاں پیدا ہو گئیں۔ ہر لڑکی کی آمد پر گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی۔ چوتھی لڑکی کی پیدائش کے بعد، ماں باپ، عزیز و اقارب کے اصرار سے نور خان دوسری شادی کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ بیوی نے ہزار منتوں سماجتوں سے اسے روکا۔ وہ اُس وقت تو رُک گیا لیکن بیوی سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر پھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ ضرور دوسری شادی کر لے گا ــــ اور بے چاری کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ پانچویں بار پھر لڑکی پیدا ہو گئی۔ نور خاں کی بیوی کو غش پر غش آ رہے تھے۔ دل کے دورے پڑتے تھے۔ لیکن گھر والے سب اس سے ناراض تھے۔ خاوند ادھر کا رُخ تک نہیں کرتا تھا۔ وہ تنہا چارپائی پر پڑی روتی رہتی۔ گلی محلّے کی عورتیں آتیں اور اسے تسلّی دیتیں کہ یہ سب خدا کی مرضی پر منحصر ہے وہ جسے چاہے لڑکے دے جسے چاہے لڑکیاں دے۔ تمہارے رونے دھونے سے کیا حاصل ہے۔ جب خدا کا لکھا ہی ایسا تھا تو اسے کون مٹا سکتا ہے ــــ مرضیٔ مولا برہمہ اولیٰ۔ صبر شکر کر کے مصیبت برداشت کرو۔ خدا جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ وہ مالک ہے۔ جس حال میں چاہے رکھے۔ (حضرت اسلیمانؑ نے ایک دفعہ دل ہی دل میں کچھ شکوہ شکایت کیا تھا۔ بارہ برس تک بھٹیاری کا بھٹ جھونکنا پڑ گیا۔ اس لئے کوئی ایسی ویسی بات زبان پر نہ لانا۔ وہ

بڑا بے پردا ہے

لڑکی کی پیدائش پر صفِ ماتم

یہ بات تو ہم بعد میں دیکھیں گے کہ "خدا جسے چاہے لڑکیاں دے، جسے چاہے لڑکے دے"، کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

پہلے یہ دیکھیں کہ لڑکی کی پیدائش پر جو گھر میں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے، اس کی وجہ کیا ہے۔ اور یہ صفِ ماتم، جہلاء کے گھروں ہی میں نہیں بچھتی۔ بڑے بڑے مہذّب اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک آدھ لڑکی تک تو خیر، وہاں کچھ نہیں کہا جاتا۔ لیکن جب نوبت، دو چار تک پہنچ جائے تو رونا وہاں بھی شروع ہو جاتا ہے ــــ اس رونے کے آنسو آنکھ سے نہ بھی نکلیں، تو بھی دل کی کلی تو ضرور مرجھا جاتی ہے' خواہ منہ رکھنے کو میاں صاحب کتنا ہی کیوں نہ کہیں کہ نہیں! ہم تو لڑکے اور لڑکی میں کوئی فرق نہیں کرتے ــــ اس میں فرق ضرور کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فرق کیوں کیا جاتا ہے اور لڑکی کی آمد وجہ افسردگی کیوں ہو جاتی ہے! اس میں شبہ نہیں کہ اس کی ایک وجہ اقتصادی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں، عورتیں، معاشی طور پر مردوں کی دست نگر ہوتی ہیں اور لڑکیوں کے لئے مناسب بر تلاش کرنے اور ان کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے، تقاضوں کے پورا کرنے میں جو جانکاہ دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا احساس لڑکی کے والدین کو پژمردہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد، اگر شادی کامیاب نہیں ہوتی اور لڑکی، دو چار بچوں کے ضمیمے سمیت، میکے میں آ بیٹھتی ہے تو یہ حادثہ بھی کچھ کم جانکاہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس صفِ ماتم کی وجہ صرف اقتصادی نہیں۔ اس کی بنیاد ہی کچھ اور ہے ــــ اور وہ یہ کہ عورت کو مرد کے مقابلہ میں

عورت کو فروتر سمجھا جاتا ہے

سمجھا ہی فروتر جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت، محض عورت ہونے کی جہت سے، مرد سے کمتر ہوتی ہے یا یہ خیال مرد کا پیدا کردہ ہے!

ہندوؤں نے تو عورت کا شمار انسانوں کی صف میں کیا ہی نہیں۔ انہوں نے اسے ایک جنس قرار دیا جو کسی نہ کسی کی ملکیت میں رہتی ہے۔ بیٹی ہے تو باپ کی ملکیت میں، بیوی ہے تو خاوند کی ملکیت میں اور ماں ہے تو بیٹے کی ملکیت میں۔ وہ کسی شے کی مالک نہیں ہو سکتی۔ اسے جو کچھ دیا جاتا ہے بطور دان

مذاہبِ عالم میں عورت کی حیثیت

(خیرات) دیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس کے بیوی ہونے کا تعلق ہے، ایک عورت کے بیک دفعہ متعدد خاوند

ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مہابھارت میں ہے کہ دروپدی کے پانچ خاوند تھے اور انہوں نے اُسے جوئے میں ہار دیا تھا۔ پرانوں کی روایت کے مطابق ترکسی کنیا سے سات رشیوں نے بیاہ کیا تھا۔ وارکشی نامی منی کنیا سے پرچیتانامی دس برہمن بھائیوں نے بیک وقت شادی کی تھی۔ یہ بھائی، ویدوں کے رشی بھی تھے۔ چونکہ ہندو دھرم شاستر برہمنوں کا وضع کردہ ہے، اس لئے اس میں، برہمنوں کو خاص مراعات دی گئی ہیں۔ چنانچہ اتھروید نیز رگ وید میں ہے کہ

> اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے گا کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک ہوتا ہے۔

ان حالات میں، ہندو سوسائٹی میں (ان کے دھرم کی رُو سے) عورت کا جو مقام ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

تورات کی رُو سے عورت کی پوزیشن

یہودیوں کے ہاں (تورات میں) ہے کہ خدا نے آدم (مرد) کو پیدا کیا، تو وہ تنہائی کی وجہ سے اداس اداس سا رہنے لگا۔ اس کا دل بہلانے کی خاطر، خدا نے، اس کی پسلی سے حوا کو پیدا کر دیا۔ یعنی مقصود بالذات تو مرد کی پیدائش ہی تھی۔ عورت اس کے لئے کھلونے کے طور پر پیدا کر دی گئی۔ پھر، عورت شیطان کے فریب میں آ گئی اور اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ عیسائیوں کے ہاں، اسی افسانہ کی رو سے

عیسائیت کی رُو سے

عورت کو تمام برائیوں کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ انسانی بچہ، اپنے اوّلیں ماں باپ کا یہ گناہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے جس کے ازالہ کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لایا جائے۔ گناہوں کا سرچشمہ ہونے کی وجہ سے، ان کے ہاں عورت کو ایسا قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے کہ اسے چھو جانا بھی خباثت کا موجب تصور کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے (SAINTS) تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ عیسائیت کے دورِ اوّل میں (VALESIANS) نامی ایک فرقہ تھا جو اپنے آپ کو خصّی کر کے، مقربینِ خداوندی کے زمرہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ عیسائیت کا عقیدہ ہے کہ عورت، جنت میں نہیں جا سکتی۔ اس سے یہ دشواری سامنے آئی کہ پھر (حضرت) مریمؑ کا کیا کیا جائے۔ اس کے حل کے لئے یہ کہا گیا کہ آخرت میں سب عورتیں مرد بنا دی جائیں گی۔ اور اس طرح جسے جنت میں جانا ہوگا، وہ مرد کی حیثیت سے جنت میں جائے گی۔ سینٹ پال

اس تعلیم کو عام کرتا تھا کہ "آدمی، عورت سے پیدا نہیں کیا گیا۔ عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے قانون کی رُو سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں کمتر درجہ پر رہنا چاہیئے۔" آپ عیسائیوں کا مذہبی لٹریچر دیکھئے۔ اس میں عورت کی تصویر ایسی قابلِ نفرت کھینچی جاتی ہے کہ اس کے تصور سے گھن آنے لگ جاتی ہے۔

مذہب کی دنیا سے نیچے اُتر کر، عالمِ فکر کی طرف آیئے تو وہاں بھی عورت کے ساتھ اسی قسم کا سلوک

فلاسفرز کے نزدیک

ہوتا دکھائی دے گا۔ ارسطو، جسے فلاسفرز کا ابو الآباء کہا جاتا ہے، یہ "فلسفہ" پیش کیا کرتا تھا کہ عورت ہر گوشہ میں مرد سے فروتر واقع ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ (وہ کہتا تھا کہ) مرد کے منہ میں بتیس دانت ہوتے ہیں اور عورت کے منہ میں اٹھائیس۔ (اسے اپنے اس فلسفہ کی صداقت پر اتنا یقینِ محکم تھا کہ اس نے کبھی اتنی سی زحمت گوارا کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ اپنی بیوی کا منہ کھول کر دیکھ لے کہ اس میں کتنے دانت ہیں!)۔ اس کا قول تھا کہ "عورت کے کردار کے متعلق ہمیں بس یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت کے پروگرام میں ایک کمی رہ گئی ہے۔" (PLAUTWS) کہا کرتا تھا کہ "عورت کے معاملہ میں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی یہ کہے کہ میں اچھی عورت کا انتخاب کروں گا ــــ اس انتخاب سے ہر دوسری عورت، پہلی سے بدتر نکلے گی۔" یہ تو پھر بھی پرانے زمانے کی باتیں ہیں، روسو جس نے عصرِ جدید میں یورپ (بلکہ دنیا) کو انسانی حقوق اور تصورِ جمہوریت سے روشناس کرایا، کہا کرتا تھا کہ "عورت کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ مرد کی مطیع و فرمانبردار رہے اور اس کی ناانصافیوں کو برداشت کرے۔" انیسویں صدی تک کے محققینِ مغرب کی تحقیق یہ تھی کہ "زمانۂ قدیم میں مرد نے سب سے پہلے جس جانور کو گھریلو بنایا، وہ عورت تھی۔" ابھی کل کی بات ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں جب انگلستان میں عورتوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تحریک چلائی تو ملکہ نے (یاد رکھیئے، کسی مرد بادشاہ نے نہیں، خود عورت، ملکہ نے) انتہائی غصے کے عالم میں اعلان کیا کہ

> حضور ملکۂ معظمہ کی دلی خواہش ہے کہ ہر وہ دانشور جو، عورتوں کی اس پاگل پن اور حماقت آمیز روش کو روکنے کے لئے کچھ لکھ سکتا یا کہہ سکتا ہے ملکہ کا دست و بازو بنے۔ یہ مسئلہ ایسا غضب آور اور اشتعال انگیز ہے کہ ملکہ معظمہ اپنے آپ پر ضبط نہیں کر سکتیں۔ خدا نے مرد اور عورت کو مختلف حیثیتوں سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے عورتوں کو آپے سے باہر نہیں ہونا

چاہیئے۔

اور اس باب میں، اب بھی کونسی کمی ہو گئی ہے (H. L. MENCKEN) لکھتا ہے کہ "محبّت کا تصوّر اس امر کی فریب دہی (یا فریب خوری) کے لئے وضع کیا گیا ہے کہ ایک عورت دوسری عورت سے مختلف ہوتی ہے"۔ یہ فریب ہے۔ سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں ___ " انسانی ذہن کی سب سے بڑی ایجاد یہ خیال ہے کہ عورت میں بھی کوئی خوبی ہوتی ہے۔" (C. O. SKINNER)

عصرِ حاضر میں، امریکہ کو بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک کہا جاتا ہے اور وہاں کی عورت کے متعلق تصوّر یہ ہے کہ وہ بڑی آزاد واقع ہوئی ہے اور وہاں مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ میرے سامنے اس وقت، وہاں کا (ایک معنی میں خود حکومت کا ترجمان) رسالہ (DIALOGUE) جلد ۳ شمارہ ۴ (بابت ۱۹۷۰ء) ہے۔ اس میں، ساری تحقیقات کا رُخ اس سمت کو جاتا ہے کہ عورتوں کو مردوں کے ہمدوش تصوّر نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ ہے وہ پوزیشن جو عورتوں کو مردوں کی طرف سے ملتی چلی آرہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی جانور نے بھی اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ کیا ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت، عیسائیت کا دَور دورہ تھا اور عورت کے خلاف تحقیر و تذلیل کے جذبات انتہائی شدت تک پہنچ چکے تھے۔ ایسے میں قرآن آیا اور اس نے پوری قوّت کے ساتھ اعلان کیا کہ

قرآن کا اعلان

یہ تمام خیالات مردوں کے خود وضع کردہ ہیں جنہیں حقیقت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور جو خصوصیّات انسان کو حاصل ہیں اور جس شرف و مجد کا وہ حامل ہے، ان میں مرد اور عورت، دونوں برابر کے شریک ہیں۔ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱)۔ اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا، ایک جرثومۂ حیات سے کی اور اسی سے نر اور مادہ کو پیدا کیا۔ جب ان کی زندگی کا سرچشمہ ایک ہے تو پیدائش کے اعتبار سے تفریق کیسی! یہ درست ہے کہ طبعی زندگی میں (BIOLOGICALLY) ان کے وظائفِ حیات میں فرق ہے، لیکن وہ فرق صرف تقسیمِ کار کا ہے، شرف و مجد کا نہیں۔ جہاں تک انسانی صلاحیتوں کا تعلق ہے، وہ دونوں میں یکساں طور پر موجود ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے، جو کچھ ایک (مرد) بن سکتا ہے وہی کچھ دوسرا (عورت) بن سکتی ہے۔ سورۂ احزاب کی اس آیۂ جلیلہ کو دیکھئے اور غور

کیجئے کہ قرآنِ کریم، مصافِ زندگی میں کس طرح مردوں اور عورتوں کو شانہ بشانہ چلتے دکھاتا ہے۔ ارشاد ہے

مرد اور عورت شانہ بشانہ

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ ۔ اگر مردوں میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرسکیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے۔ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۔ اگر مرد اس جماعت کے رُکن بن سکتے ہیں جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عامہ کی ذمہ دار بنتی ہے تو عورتیں بھی اس کی رکن بن سکتی ہیں۔ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ ۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ اس کا استعمال خدائی پروگرام کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے۔ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ اگر مرد اپنے دعوائے ایمان کو عمل سے سچ کر دکھانے کے قابل ہیں تو عورتیں بھی اس کے قابل ہیں۔ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ اگر مرد اس قابل ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں نشوونما پاتی جائیں وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے اور زیادہ جھکتے جائیں تو عورتیں بھی اس قابل ہوتی ہیں۔ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی یہ مادہ موجود ہوتا ہے وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابطِ خداوندی کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۔ اگر مرد، قوانین کو سمجھنے اور انہیں ہر وقت اپنے پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ تمام صلاحیتیں، مردوں اور عورتوں، دونوں میں، یکساں طور پر موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ لہٰذا، اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۳۳/۳۵)۔ خدا نے ان سب کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

آپ قرآنِ کریم کی ان تصریحات کو دیکھیں اور پھر غور کریں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے لیکن عورت میں نہیں۔ یا یہ کہ مرد میں اس کی زیادہ صلاحیت ہے اور عورت میں کم۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش

اعمال یکساں طور پر نتیجہ خیز ہوں گے۔ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا ○ (۴/۱۲۴)۔ اور تم میں سے جو کوئی بھی اعمالِ صالحہ کرے گا، وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو وہ جنّت میں داخل ہوگا اور اس کے اعمال میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔

جہاں تک میاں بیوی کی زندگی کا تعلق ہے، قانونی نقطہ نگاہ سے قرآن نے اعلان کر دیا کہ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (۲/۲۲۸)۔ قاعدے اور قانون کی رُو سے، عورتوں کی جتنی ذمّہ داریاں ہیں اتنے ہی ان کے حقوق ہیں۔ البتہ ایک بات میں مرد کا درجہ فائق ہے اور وہ یہ کہ طلاق یا بیوگی

حقوق اور ذمّہ داریوں میں برابری

کی صورت میں، عورت، عدّت کی مدّت میں دوسری جگہ شادی نہیں کر سکتی، مرد ایسا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت ظاہر ہے کہ اگر عورت کے بطن میں بچہ ہے تو اس کی ولدیت کے تعیّن میں کوئی التباس نہ ہو (اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے. جو احباب اس کی تفصیل سے دل چسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" یا "اسلام کیا ہے" میں عورت سے متعلق باب ملاحظہ فرمالیں)۔

جہاں تک ہمارے ہاں کے اس مروّجہ خیال کا تعلق ہے کہ مرد، عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں اور مردوں کو حق حاصل ہے کہ وہ بیوی کو مار پیٹ بھی لیں، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا؛ اس مقام پر ہم صرف ایک نکتہ سامنے لانا چاہتے ہیں. قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے۔ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا ۔ وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ۔ تاکہ تم میں سکون و رحمت اور محبّت پیدا ہو۔ اس کے بعد ہے ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۳۰/۲۱)۔ جو لوگ غور و فکر سے کام لیں گے انہیں اس میں حقیقت تک پہنچنے کے لئے نشانیاں ملیں گی. تھوڑے سے غور و فکر کے بعد بھی یہ حقیقت سامنے آ سکتی ہے کہ اگر میاں بیوی کے متعلق یہ عقیدہ اور تصوّر ہو کہ خاوند بیوی پر حاکم ہے، داروغہ ہے. عورت کو ہر حال میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہیئے. اگر وہ ایسا نہ کرے تو خاوند اسے مار پیٹ بھی سکتا ہے تو کیا، اس قسم کے تعلق اور سلوک سے باہمی محبّت کا رشتہ استوار ہو سکتا ہے اور گھر میں سکینت اور رحمت کی فضا پیدا ہو سکتی ہے! اس سے مستبد حاکم اور بےکس محکوم کا تعلق تو

ازدواجی زندگی کا مقصد

پیدا ہو سکتا ہے، رفاقت اور محبّت کا تعلق کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ایک طرف، ہر وقت، رعونت اور بالادستی اور دوسری طرف، احساسِ کمتری اور خوف دہراس کے جذبات تو اُبھر سکتے ہیں، ہمنوائی اور ہم آہنگی، رفاقت اور یگانگت کے جذبات کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ لہذا، قرآن کی رُو سے یہ تصوّر باطل ہے کہ مرد کو عورت پر کوئی فوقیت حاصل ہے، عورت، مرد کے مقابلہ میں فروتر واقع ہوئی ہے اور میاں بیوی کے تعلقات حاکم اور محکوم کے ہیں۔ مرد اور عورت دونوں نوعِ انسان کے افراد ہیں اور انسانی صلاحیتوں کے یکساں حامل۔ میاں بیوی کی حیثیت سے ان کے حقوق اور ذمہ داریاں ایک جیسی ہیں اور ان کے تعلقات، محبّت اور رفاقت کے ہیں جن کے لئے مساوات بنیادی شرط ہے۔ جسے اپنے سے فروتر سمجھا جائے اور جو اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں ذلیل خیال کرے، ان میں کبھی رفاقت کے تعلقات وابستہ نہیں ہو سکتے۔

پھر کیا ہوا؟ یہ تھی اس باب میں قرآنِ کریم کی تعلیم۔ لیکن اس کے بعد جب مسلمانوں نے خدا کی اس کتابِ عظیم کو بالائے طاق رکھ دیا تو عورت کے متعلق جو عقائد و تصورات دیگر اہلِ مذاہب کے ہاں رائج تھے، وہ ایک ایک کر کے ان کے ہاں در آئے اور رفتہ رفتہ جزوِ اسلام بن گئے۔ اس کے لئے ٹیکنیک ایسی اختیار کی گئی جس کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے یعنی جھوٹی روایات وضع کی گئیں اور انہیں منسوب کر دیا گیا اُس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کی طرف جو دنیا میں حقوقِ انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار اور مساواتِ انسانیہ کے عظیم داعی تھے۔ سب سے پہلے، تورات (عہد نامہ عتیق) سے یہ عقیدہ مستعار لیا گیا کہ خدا نے پہلے آدمؑ (یعنی مرد) کو پیدا کیا لیکن جب وہ اداس ہوا تو اس کی تنہائی رفع کرنے کے لئے، اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

وضعی روایات صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ ٹیڑھی ہے۔ پس تو اگر اسے بالکل سیدھا کرنا چاہے گا تو اسے توڑ دے گا۔ اور اگر اس میں کجی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

صحیح بخاری میں، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا۔ اور اگر حوا نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی۔

بخاری ہی کی ایک اور روایت میں ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے بعد، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعثِ مضرت نہیں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ نحوست تین چیزوں میں ہے ــــ عورت، گھر اور گھوڑا۔ (بخاری، کتاب النکاح)۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی اور دوزخ کو دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔

اس قسم کی متعدد روایات، کتبِ احادیث میں داخل کر دی گئیں۔ جہاں تک میاں بیوی کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں بھی اس قسم کی روایات کی کمی نہیں جن میں مرد کو حاکم اور داروغہ قرار دیا گیا ہے۔ پہلے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں اور پھر ان کی رُو سے قرآنی آیات کی تفسیر مرتب کی گئی۔ اسی سلسلہ میں، بڑے شد و مد سے سورۃ النساء کی اس آیت کو پیش کیا جاتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ .... (۴/۳۴)۔ اور جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کی تفسیر

ــ مرد، عورتوں پر داروغہ ہیں۔ (حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ عورتوں کا زیادہ وقت اولاد کی پیدائش اور تربیّت و پرورش میں صرف ہو جاتا ہے اور مرد ان موانعات سے فارغ ہوتا ہے، اس لئے، تقسیمِ کار کے پیشِ نظر اصول یہ مقرّر کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو سامانِ زندگی بہم پہنچانا، مردوں کے ذمے ہے۔ عربی زبان کی رُو سے قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ کے یہی معنی ہوتے ہیں[1])۔ اس کے معنی "حاکم اور داروغہ" کرنے کے لئے اس کی شانِ نزول میں کہا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبیؐ اکرم سے شکایت کی کہ اس کے خاوند نے اسے تھپڑ

---

[1] اس آیت کے متعلق تفصیلی بحث، میری کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" میں ملے گی۔

مارا ہے۔ آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا کہ یہ آیت نازل ہوگئی اور حضورؐ کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ آپ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ عورتیں آپ کے حکم کو سن کر اپنے خاوندوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔ اس پر آپؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دے دی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار پیٹ شروع ہوگئی اور بہت سی عورتیں شکایت لے کر آپؐ کے پاس آئیں۔ اس پر آپؐ نے مردوں سے کہا کہ جو لوگ عورتوں کو مارتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے۔ لیکن جب آپؐ نے عورتوں کو اس کا بدلہ دلوانا چاہا تو یہ آیت نازل ہوگئی۔ لہذا یہی حکم رہا کہ چونکہ مرد، عورتوں پر حاکم ہیں اس لئے وہ انہیں مار پیٹ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عمرؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اشعثؓ تین باتیں یاد رکھو جو میں نے رسول اللہ سے سن کر یاد رکھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے بیوی کو کس بنا پر مارا۔ دوسرے یہ کہ وتر پڑھے بغیر نہ سونا۔ اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔

یہی نہیں کہ مردوں کو عورتوں پر حاکم مقرر کیا گیا ہے بلکہ ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ وہ ماسوا اللہ کے کسی کو سجدہ کرے، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

حضرت علیؓ کی طرف منسوب کردہ اقوال

نہج البلاغۃ میں اس قسم کے اقوال حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں کہ آپ نے فرمایا:

> لوگو! عورتوں کا عقیدہ، ان کا حصہ اور ان کی عقلیں ناقص ہوتی ہیں۔ (لہذا) تم بدکردار عورتوں سے بچو اور نیکوں سے بھی محتاط رہو۔ اور نیک کاموں میں بھی ان کا حکم نہ مانو تاکہ وہ برے کاموں میں تمہاری اطاعت کی توقع نہ رکھیں۔

دوسری جگہ ہے کہ آپ نے کہا۔

> عورت خوش معاشرت بچھو ہے۔ ساتھ رہو تو خوشی ضرور ہوتی ہے لیکن ڈنک مارنے سے نہیں چوکتی۔

ایک اور مقام پر ہے کہ آپ نے فرمایا:

عورت سراپا شر ہے اور اس سے بھی زیادہ شر یہ ہے کہ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔
لیکن ایک طرف اس قسم کی وضعی روایات ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "بہشت ماں کے قدموں کے نیچے ہے"۔ گویا ماں کا شمار عورتوں میں نہیں ہوتا!
اس قسم کی روایات ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوئیں[1]۔ جب کیفیت یہ تھی کہ عورتیں بازاروں میں بکا کرتی تھیں۔ احمد امین مصری، ضحی الاسلام میں لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں۔

> بغداد میں غلام اور لونڈیوں کی تجارت عام تھی۔ ایک بازار کا نام ہی شارع دار الرقیق (غلاموں کا بازار) تھا۔ اس تجارت کے کرنے والوں کو نخاس کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ دراصل مویشیوں کی تجارت کرنے والوں کے لئے تھا۔ بعد میں غلام اور لونڈیوں کے تاجروں کے لئے بولا جانے لگا حکومت کی طرف سے ان پر انسپکٹر مقرر ہوتا تھا جسے قیم الرقیق کہتے تھے۔
>
> خلیفہ متوکل کے حرم میں چار ہزار لونڈیاں ممتوعہ تھیں۔

اس قسم کے عقائد اور مسلک سے، عورت کی کس قسم کی تصویر سامنے آتی ہے اس کی جھلک ہمیں اپنے لٹریچر سے ملتی ہے۔ مثلاً نظامی گنجوی لکھتا ہے کہ

اگر نیک بودے سرِ احوالِ زن	زناں را مزن نام بودے، نہ زن
چہ خوش گفت جمشید بارائے زن	کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن
مشو ایمن از زن کہ زن پارساست	کہ خربتہ بہ گرچہ دزد آشناست

اور جب بات وارث شاہ تک پہنچے تو پھر پوچھئے نہیں کہ اس بیچاری کی کیا درگت بنتی ہے!
مسلمانوں میں تصوف کا فلسفہ ایران سے آیا تھا لیکن انہوں نے مسلکِ خانقاہیت، عیسائیوں سے سیکھا تھا۔ عیسائیوں کے ہاں، عورت کی جو پوزیشن تھی اس کا تھوڑا سا عکس ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے صوفیا بھی (عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کی طرح) تجرد کی زندگی پسند کرتے اور عورت کو تمام برائیوں کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) لکھتے ہیں کہ

---

[1] ہماری تاریخ اور جملہ کتبِ احادیث عہدِ عباسیہ میں مرتب ہوئی تھیں اور نہج البلاغۃ ان سے بھی بعد میں مدون ہوئی تھی۔

بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کی اصل عورت تھی ــــ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا ــــ یعنی ہابیل قابیل کی لڑائی ــــ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ غور فرمائیے کہ جس قوم میں اس "جنسِ کاسد" کے متعلق یہ خیالات عام ہوں، اس کی آمد پر، گھروں میں صفِ ماتم نہیں بچھے گی تو کیا مسرت کے شادیانے بجائے جائیں گے؟ اور وہ اگر احساسِ کمتری (INFERIORITY COMPLEX) میں مبتلا ہو کر، اپنے آپ کو منحوس، بدقسمت اور بدنصیب تصور نہیں کرے گی تو اور کیا ہوگا! کہا جائے گا کہ اب ہم تعلیم یافتہ اور مہذب ہو گئے ہیں۔ اس لئے عورت کے متعلق اس قسم کے خیالات باقی نہیں رہے ــــ تہذیب و تعلیم کا یہ ادعا بجا اور درست لیکن

ہمارے مہذب معاشرہ کی حالت

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ یہ جو ہمارے نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں نہایت خوبصورت، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، منتخب کردہ، لڑکی کو اپنے ہاں بیوی یا بہو بنا کر لانے کے عوض، کوٹھی، موٹر کار، ہزار ہا روپیہ کے جہیز کا مطالبہ ہوتا ہے، یہ (عورت کے متعلق) کس قسم کے "حسنِ خیال" کا غماز ہے؟ اس سے تو ہم، اُس دورِ جہالت سے بھی پست سطح پر گر گئے ہیں۔ اُس زمانے میں عورت کو خرید کر لایا جاتا تھا تو اس کی کچھ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ اب ہم عورت کو لاتے ہیں تو اس کے ساتھ لاکھوں روپے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ پھر، ہمارے مروجہ قوانین کے تحت (جنہیں بدقسمتی سے قوانینِ شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے)، عورت کی جو حالت ہوتی ہے، اس کی مثالیں ہر دو قدم پر ملیں گی۔ ان قوانین کی رُو سے، مرد کو اس کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے کہ جب جی چاہے، عورت کو طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کرے۔ اس کے برعکس، عورت پر ہزار مظالم ہوں، اُسے جابر و ظالم خاوند کے استبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں اور وہاں، ان بےچاری شریف زادیوں کا جو حشر ہوتا ہے اس کے احساس سے یہ مظلوم، انصاف حاصل کرنے کے مقابلہ میں، گھروں میں دم گھٹ کر مر جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر یہ کسی طرح، ہزار ذلتوں کے بعد، چھٹکارا حاصل بھی کر لیتی ہیں تو ان کے لئے بقایا زندگی گذارنے کا سوال اور بھی وجۂ سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔ اس میں معاشی مسئلہ ہی وجۂ پریشانی نہیں ہوتا، حفاظت اور عزت کا سوال بھی ہزار خوف پیدا کرنے کا موجب

ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں، عورت کی حفاظت کے لئے مرد کی چھت لاینفک سمجھی جاتی ہے۔ اگر عورت کسی طرح اپنی طبیعی حفاظت کا انتظام کر بھی لے تو بھی اسے اس بات کا احساس ہر وقت چھلاوے کی طرح ڈراتا رہتا ہے کہ اگر کسی بدمعاش نے کسی وقت بھی ایک بات اس کے خلاف مشہور کردی تو وہ معاشرہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی ــــ اور بدمعاشوں کی زبان کا روکنا کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہوتا ــــ یہ تو پھر بھی دُور کی داستان ہے۔ آجکل ہمارے ہاں یہ عام ہو رہا ہے کہ ایک معصوم، بھولی بھالی بچی اسکول یا کالج جا رہی ہے اور راستے میں اسے غنڈے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس مظلوم و معصوم کو ماں باپ، بہ ہزار دشواری واپس لے بھی آتے ہیں تو وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ اس کی بقایا ساری زندگی جہنم میں گزرتی ہے ــــ اور یہ کس جرم کی پاداش میں؟؟ خدا نے، جہلائے عرب سے، جو اپنی معصوم بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، کہا تھا کہ بتاؤ! جب اس بچی سے پوچھا جائے گا کہ

بِأَيِّ ذَنۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (۸۱/۹)

تمہیں کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا تھا۔

تو تم اس کا جواب کیا دو گے۔ لیکن ہمارے معاشرہ کی معصوم و مظلوم بچیاں خود خدا سے پوچھتی ہیں ــ اور یہ کوئی فرضی افسانہ نہیں، اس قسم کی بچیاں خود مجھ سے یہ سوال کیا کرتی ہیں ــــ کہ ہم نے کیا جرم کیا تھا جو تُو نے ہمیں لڑکی بنا کر پیدا کر دیا۔ اور ہمارے بھائی نے کونسا تیر مارا تھا جو اسے لڑکا بنا دیا، تو اس کا جواب انہیں کہیں سے نہیں ملتا۔ برہمن نے تو پھر بھی اس کا جواب تراش لیا تھا کہ یہ تمہارے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا ہے جسے بھگتنے کے لئے برہما نے تمہیں عورت بنا دیا۔ آپ اس کی اِس منطق کی نامعقولیت پر ہنس دینگے لیکن سوچئے کہ اس سوال کا جو جواب آپ کے ہاں سے ملتا ہے اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ آپ کے ہاں سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہ خدا کی مرضی ہے۔ وہ جسے چاہے لڑکا بنا دے، جسے چاہے لڑکی۔ جسے چاہے عزت دیدے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تم اس سے پوچھ نہیں سکتیں کہ اس نے ایسا کیوں کر دیا ہے۔ سوچئے کہ آپ کی یہ "منطق" انسان کو کس نتیجہ پر پہنچاتی ہے۔ برہمن کی منطق غلط سہی، لیکن اس سے برہما کے سر پر کوئی الزام نہیں آتا۔ اس کا تصور ایک عادل کا ہوتا ہے جو انسانوں کے اعمال کے مطابق نئے جنم میں، ان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ لیکن آپ کے جواب سے خدا کا جس قسم کا تصور سامنے آتا ہے، اسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

یہ جواب ہمارے ہاں کے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے دیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں آیتیں اور حدیثیں پیش کر دی جاتی ہیں۔ پھر ان کی تائیدِ مزید کے لئے (بزعمِ خویش) دلائل بھی دیئے جاتے ہیں۔ اور وہ

نظامِ فطرت کی غلط مثال

اس قسم کے کہ نر اور مادہ کا پیدا کرنا، خدا کے تخلیقی پروگرام کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ گائے کو یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ اسے گائے کیوں بنایا گیا، بیل کیوں نہیں بنایا گیا۔ نیز، بعض مخلوق کا افضل ہونا اور بعض کا فروتر، یہ بھی فطرت کا پروگرام ہے۔ گدھے کو اس کا حق نہیں کہ وہ شکایت کرے کہ اسے اسپِ تازی کیوں نہیں بنایا گیا۔

فطرت کے یہ پروگرام بجا اور درست، لیکن اس قسم کے دلائل دینے والے اتنا نہیں سوچتے (اگر ان میں سوچنے کی صلاحیت ہو تو وہ ایسے پوچ دلائل دیں ہی کیوں!) کہ وہ مثالیں حیوانوں کی دے رہے ہیں اور یہاں بات انسانوں کے متعلق ہو رہی ہے۔ حیوانات میں عزت اور ذلت کا شعور ہی نہیں ہوتا۔ ان میں، کہتری اور مہتری کا احساس نہیں۔ نہ بیل کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ میں گائے سے افضل ہوں، نہ گائے کو اس کا شعور کہ میں بیل سے فروتر ہوں۔ گدھے کی حماقت ضرب المثل ہے۔ لیکن کسی گدھے کو اس کا شعور و احساس نہیں ہوتا کہ وہ "گدھا" ہے۔ ان کے برعکس، انسان صاحبِ شعور بھی ہے اور ذی احساس بھی۔ اور جب ہم "انسان" کہتے ہیں تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ جب خدا نے کہا تھا کہ ہم نے نوعِ انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (۱۷/۷۰) تو اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس نے مردوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے، عورتوں کو نہیں۔ یا اس تکریم میں کسی قسم کی تفریق کی گئی ہے۔ یاد رکھئے! کسی ذی شعور و ذی احساس (یعنی انسان) کے لئے کسی ایسی بات کو وجہِ تذلیل و تحقیر بنا دینا جس کے لئے وہ ذمہ دار نہ ہو، نہ ہی جسے بدلنے کا اسے اختیار ہو اور نہ ہی اس کے ازالہ کی کوئی صورت، اُس خدا کے شایانِ شان نہیں جس کا اعلان ہے کہ وَ مَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ٥ (۵۰/۲۹)۔ ہم بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔ پیدائش کے اعتبار سے، انسان اور انسان میں کسی قسم کی تفریق، خدائے رؤف الرحیم کا کام نہیں ہو سکتا۔ یہ تفریقات و تخصیصات ہماری پیدا کردہ ہیں اور ہم اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہوئے نہ اس سے ڈرتے ہیں نہ شرماتے۔ اگر ہمارے معتقدات و تصورات، قرآن کریم کے مطابق ہوں اور ہمارا معاشرہ قرآنی اقدار پر متشکل، تو پھر نہ لڑکی کی پیدائش پر گھروں میں صفِ ماتم بچھے گی اور نہ ہی عورت کو اپنی "قسمت" پر رونا پڑے گا۔ فطری وظائفِ حیات کے لئے، مرد اور عورت میں حیاتیاتی (BIOLOGICAL)

فرق ضرور ہے لیکن اس تفریق سے، مرد اور عورت کے مقامِ انسانیت پر کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔ اس کے لئے اصول یہی ہے کہ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹)۔ ہر ایک کا مقام اس کے اعمال (سیرت و کردار) کے مطابق متعین ہوگا۔ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى (۳/۱۹۴)۔ وہ عورت ہو یا مرد۔ فطری فرائض کی سرانجام دہی کے لئے مرد اور عورت میں جو تفریق ہے اس میں بھی یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی رو سے مرد، عورتوں سے فائق ہیں۔ اس میں کہا گیا کہ وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴/۳۵-۳۲)۔ بعض امور میں مرد عورتوں سے افضل ہیں، بعض میں عورتیں، مردوں سے افضل، لہذا ان میں سے کسی نوع کو بھی، یہ سمجھ کر کہ دوسری نوع بہر حیث افضل ہے، یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اسے کاش! مجھے وہ خصوصیت کیوں نہ مل گئی، یا میں ایسا کیوں نہ بن گئی۔ آجکل چونکہ عورت مظلوم ہے اس لئے وہ سرد آہ بھر کر کہتی ہے کہ اسے کاش! میں مرد ہوتی۔ جب اور جن اقوام میں (MATRIARCHY) عورتوں کی بالادستی تھی، اس وقت مرد کہتا ہوگا کہ اسے کاش! میں عورت ہوتا۔ قرآنِ کریم نے مرد اور عورت کی مساوات سے، ان دونوں خلش آور احساسات کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی رو سے، وجہِ امتیاز و اعزاز، سیرت و کردار کے جوہر قرار پا گئے نہ کہ جنسی تفریق ــــ معلوم نہیں کہ خود فریبیوں میں ڈوبا ہوا انسان، قرآن کی اس سطح پر کب آئے گا!

لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش

جہاں تک لڑکے اور لڑکیوں کی پیدائش کا تعلق ہے قرآنِ کریم میں ہے کہ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۙ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (۴۲/۵۰-۴۹)۔ مَنْ يَّشَآءُ کا ترجمہ جسے چاہتا ہے اور قَدِيْرٌ کا ترجمہ "ہر بات پر قادر ہے" کی رو سے اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ جسے چاہے لڑکیاں دے، جسے چاہے لڑکے یا لڑکے اور لڑکیاں دونوں اور جسے چاہے بے اولاد رکھے۔ وہ ہر بات کا علم رکھنے والا اور ہر شے پر قادر ہے ــــ اگر لڑکے اور لڑکی میں (محض لڑکا اور لڑکی ہونے کی وجہ سے) کسی قسم کا فرقِ مراتب یا (DISADVANTAGE) نہ سمجھا جائے تو پھر "جسے چاہے" میں کچھ مضائقہ

نہیں ہوسکتا لیکن اگر ان دونوں میں وہ فرق رکھا جائے جس کی تفصیل پہلے بیان کی جاچکی ہے تو پھر "جسے چاہے"، پر وہ اعتراض ضرور وارد ہوتا ہے جسے، مظلوم بچوں کے سوال کی شکل میں سامنے لایا جاچکا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) مرد اور عورت میں، انسان ہونے کی جہت سے کوئی فرقِ مراتب نہیں۔ لیکن، اس کے باوجود، مَنْ يَّشَآءُ سے مراد یہ ہے کہ اولاد کا مسئلہ خدا کے قانونِ مشیّت کی رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جہاں تک عقیم (بانجھ) ہونے کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے، حضرت زکریاؑ کے قصہ میں خود بتا دیا ہے کہ ان کی بیوی عقیم تھی اور اس لئے وہ اولاد کی طرف سے مایوس تھے لیکن اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۲۱/۹۰)۔ اس کی بیوی کا وہ نقص دور ہوگیا اور ان کے ہاں لڑکا (حضرت یحییٰؑ) پیدا ہوگیا۔ اور اب تو (مرد و عورت دونوں کے) بانجھ پن کا علاج عام طور پر ہوجاتا ہے، اس لئے کہ انسان نے اس سلسلہ میں خدا کے قانونِ مشیّت (قانونِ فطرت) کو سمجھ لیا ہے اور اس باب میں مزید تحقیقات ہو رہی ہیں۔

جہاں تک لڑکے یا لڑکی کی پیدائش کا تعلق ہے، اس ضمن میں بھی یورپ میں بڑی ریسرچ ہو رہی ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ (۳/۵)۔ رحمِ مادر میں جنین کو (FORM) خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق عطا ہوتی ہے ـــــ اس ریسرچ کی رُو سے یہاں تک تو معلوم کرلیا گیا ہے کہ خدا کا وہ قانونِ مشیّت کیا ہے، جس کے مطابق، رحمِ مادر میں جنین کے (نر یا مادہ ہونے کی) تشکیل ہوتی ہے۔ اب وہ اس تحقیق میں مصروف ہیں کہ خدا کے اس قانون کے مطابق، ان عناصر میں کس طرح تبدیلی پیدا کی جائے جن کی رُو سے جنین کی جنسی ترکیب طے پاتی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ریسرچ مکمل ہوجائے تو لڑکا یا لڑکی اپنی مرضی کے مطابق پیدا کرلیا جاسکے گا۔ خدا نے جب کہا تھا کہ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲/۳۱)۔ خدا نے انسان میں "تمام اشیائے فطرت کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی"، تو اس سے مراد یہ تھی کہ انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ عالمِ خلق میں خدا کے جس قدر قوانین کارفرما ہیں (جنہیں قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے) وہ ان سب کا علم حاصل کرسکتا ہے۔ اور جب ان کا علم حاصل کرسکتا ہے تو انہی قوانین کے مطابق وہ تخلیقی ترکیبات میں تبدیلیاں کرکے، انہیں، حسبِ منشاء نئی نئی شکلیں بھی دے سکتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں انسان جس قدر تنوّعات پیدا کر رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ، خدا کے قانونِ

مشیّت کا علم حاصل کر کے، لڑکا یا لڑکی اپنی مرضی کے مطابق پیدا کیا جا سکے گا، تو یہ اُسی خصوصیّت کے مظاہرہ کی ایک کڑی ہوگی جس کی رو سے، آدم کو مسجودِ ملائکہ قرار دیا گیا تھا (۲/۳۴)۔ خدا کا تخلیقی قانون غیر متبدّل ہے (لَا تَبۡدِیۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِؕ ۳۰/۳۰)۔ اور اس قسم کی تبدیلیاں اسی قانون کا علم حاصل کرنے سے ممکن ہیں۔

اس طرح انسان رفتہ رفتہ، "خود تقدیرِ یزداں[1]" بنتا جا رہا ہے ___ لیکن یہ صرف مقامِ آدم ہے جب آدم، اپنے آپ کو ان قوانین کے تابع بھی لے آئے گا جو وحی کی رُو سے (قرآن میں) عطا ہوئے ہیں، تو وہ مقامِ مومن تک پہنچ جائے گا ___ اور مقامِ مومن کی بلندیوں کی تو کوئی انتہا نہیں۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

(اقبالؒ)

---

[1] اقبال کے الفاظ میں۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

سترھواں باب

دُعا

اب ہم اپنے سفرِ تحقیق کی اُس وادی میں اُتر رہے ہیں جہاں (بقولِ کسے) فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ ہمارے موضوع کے اس گوشے کا تعلق قلبِ انسانی کے نازک ترین گوشے سے ہے۔ دُعا کا رشتہ خالصتہً انسانی جذبات سے ہے اور قرآنِ کریم کی تلقین و تاکید یہ ہے کہ تم، تمام مسائلِ حیات کے متعلق فکر و تدبّر سے کام لو اور ان پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کرو۔ فکر و جذبات کا یہی وہ تصادم ہے جس کے پیشِ نظر ہم نے کہا ہے کہ اب ہم اس وادی میں اُتر رہے ہے جہاں فرشتوں کے بھی پَر جلتے ہیں۔ جب تاریخ کے اسٹیج پر اوّلیں انسان ہمارے سامنے آتے ہیں، تو ہم انہیں کسی مافوق الفطرت، ان دیکھی قوّت (یا قوّتوں) سے دعائیں مانگتے پاتے ہیں۔ اور یہ منظر، تاریخ انسانیّت کے ہر دَور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم میں

جذبۂ دُعا کی عالمگیریّت

مسلسل اور متواتر ہمارے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں ہزار اختلاف ہو، ان کے طرزِ بود و ماند اور اندازِ معاشِ و معاشرت میں، لاکھ تفاوت ہو، ان کی تہذیب ایک دوسرے سے مختلف اور ان کا تمدّن الگ الگ ہو، وہ مختلف زبانیں بولیں، ان کی نسلیں بھی الگ الگ ہوں، مختصر الفاظ میں، ان میں کوئی شے بھی مشترک نہ ہو، اس کے باوجود ان میں ایک چیز بطورِ قدرِ مشترک ضرور پائی جائے گی ــــ اور وہ ہوگی، کسی مافوق الفطرت قوّت سے دعائیں مانگنا۔ اس قوّت کے متعلق ان کے تصوّرات الگ الگ ہوں گے[1]۔ اس سے دعائیں

---

[1] ہمارا مقصد وحی کی رُو سے عطا کردہ خدا کا تصوّر نہیں۔ اس میں، زمان و مکاں کے بُعد و اختلاف سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا مطلب، ذہنِ انسانی کا تراشیدہ تصوّر ہے۔

مانگنے کی رسوم اور آداب مختلف ہوں گے۔ ان کی طلب اور تقاضے بھی متنوّع ہوں گے۔ لیکن ان تمام محسوس پیکروں کے پیچھے جذبۂ محرّکہ ایک ہی ہوگا ـــــ یعنی اپنی مدد کے لئے کسی ان دیکھی قوّت سے التجا کرنا، اس سے کچھ مانگنا۔ اسی کو دُعا کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جسے پرستش کہا جاتا ہے، وہ بھی درحقیقت دعا، یا دعا کی تمہید ہوتی ہے۔ پرستش کے ہر پروگرام کا اختتام دُعا پر ہوتا ہے۔ اُس ان دیکھی قوّت کے حضور جو نذر نیاز پیش کی جاتی یا منّت مانی جاتی ہے، وہ بھی دعا کی قبولیّت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے۔ "اگر میری فلاں مراد پوری ہوجائے تو میں یہ کروں" کے الفاظ ہر دور میں سنائی دیتے ہیں۔ دعا، ہر بے سہارا کا سہارا، ہر بے آسرا کا آسرا، ہر لاچار کا آخری چارہ، ہر ضعیف و ناتوان کا سامانِ تقویّت، ہر بے نوا کے لئے نوائے حیات، ہر مایوس کے لئے شمعِ امید، ہر قلبِ مضطر کے لئے سامانِ تسکین، ہر جگرِ سوزاں کے لئے مرہمِ تشفّی، ہر چشمِ گریاں کے لئے پنبۂ تسلّی اور ہر راندہ و درماندہ کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔ جب فکر و تدبّر کی دنیا کا خاتمہ ہوجاتا ہے تو دُعا کی دنیا کا آغاز ہوتا ہے اور سب سے زیادہ پُرخلوص اور پُرسوز وہ دُعا ہوتی ہے جس میں فکر و تدبّر کی ذرا سی بھی آلائش نہ ہو۔ دُعا میں جتنی زیادہ محویّت ہوگی اتنی ہی اس کی قبولیّت کی توقع زیادہ ہوگی ـــــ اور محویّت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس میں اس قدر جذب ہوجائے کہ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ رہے۔

آپ سوچئے کہ جس جذبہ کی کیفیّت یہ ہو اس کے متعلق فکر و تدبّر سے غور کرنا اور اسے علم و بصیرت کی رُو سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنا، دیوانگی نہیں کہلائے گا تو اور کیا ہوگا؟ لیکن قرآن کے طالبِ علم کی مجبوری یہ ہے کہ وہ اس قدر نازک مقامات میں بھی فکر و بصیرت کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔ جو قرآن، آخرت جیسی ماورا الطبیعیاتی حقیقت پر بھی غور و فکر کی تاکید کرتا ہے (۲۱۹ ـ ۲۲۰/۲)۔ وہ کسی موضوع کی نزاکت کی بنا پر اسے گردابِ جذبات کے حوالے کرنے کی اجازت کب دے سکتا ہے۔ وہ اسے بھی علم و بصیرت کی رُو سے سمجھاتا، اور فکر و شعور کی رُو سے سمجھنے کی تاکید کرتا ہے، بالخصوص اس لئے کہ اس (دُعا) کا تقدیر کے مسئلہ سے بڑا گہرا تعلق ہے اور عمل کی دنیا سے بڑا بنیادی رشتہ۔ ہم اس موضوع پر اسی انداز سے غور کریں گے اور اپنے قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ بھی اسے اسی انداز سے سمجھنے کی کوشش کریں اور اس میں اپنے جذبات کو (جنہیں ہوسکتا ہے کہ بعض مقامات پر ٹھیس بھی لگے) عناں گیر نہ ہونے دیں۔ راستہ دشوار گزار اور پُرخار ہے ـــــ ایسا دشوار گذار اور پُرخار کہ

یہاں حکیم الامت جیسے دیدہ ور کو بھی کہنا پڑا کہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

لیکن ہمیں اُمید ہے کہ اگر ہم نے اس منزل میں قرآن جیسے خضرِ راہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو ہم چشمۂ حیواں تک بآسانی پہنچ جائیں گے کہ وَ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (۲۹/۶۹). اس کا ارشاد ہے۔

دُعا کا عام مفہوم

ہمارے ہاں دُعا کا عام مفہوم، خدا سے کچھ مانگنا لیا جاتا ہے۔ اس میں مانگنے کا تصوّر ایسا غالب اور عمیق ہوتا ہے کہ ہم "دُعا مانگنے" کے الفاظ بھی عام طور پر بولتے ہیں، حالانکہ اگر خود دعا سے مفہوم "مانگنا" لیا جائے تو "دعا مانگنا" کی ترکیب بے معنی اور بے ربط ہو جائے گی۔ عربی زبان میں دُعا کے معنی مانگنا نہیں، بلکہ کسی کو آواز دینا، بلانا، پکارنا ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر کسی کو مدد کے لئے پکارا جاتا ہے، اس لئے اس کے معنی مدد مانگنے کے لئے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی لفظ ان لوگوں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے جو حضرات انبیاءؑ کرام کے لائے ہوئے دینِ خالص کے نہیں، بلکہ اس کی محرّف شکل 'مذہب' کے پیرو ہوتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بھی جو دینِ خالص (قرآن) کے متبع ہوتے ہیں۔ جب وہ ایک لفظ کو اوّل الذکر کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے وہی مفہوم لیتا ہے جو ان کے ہاں مروّج ہوتا ہے اور جب اسی لفظ کو ثانی الذکر کے ضمن میں استعمال کرتا ہے تو اس سے صحیح قرآنی مفہوم لیتا ہے۔ مثلاً وہ اللہ کا لفظ دونوں کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن مذہب پرستوں کے ہاں اس کا تصوّر کچھ اور ہوتا ہے اور دین کی رُو سے کچھ اور ___ یا جب وہ عبادت کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو مذہب پرستوں کے ہاں اس سے مفہوم پرستش، پوجا پاٹ، (WORSHIP) ہوتا ہے، لیکن دین کی رُو سے اس کے معنی احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت ہوتا ہے۔ دین میں پرستش کا تصوّر نہیں بلکہ اطاعت اور محکومیّت کا تصوّر ہوتا ہے اور اللہ سے مفہوم وہ بلند و بالا صاحبِ اقتدار ہستی، جس کے احکام و قوانین کی اطاعت کی جائے۔ اسی

طرح جب وہ دَعَا۔ یَدۡعُوۡ وغیرہ کے الفاظ، مذہب پرستوں کے لئے لاتا ہے تو اس سے ان کا وہ تصوّر مقصود ہوتا ہے جس کی رو سے وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارتے ہیں لیکن جب یہی لفظ خدا کے سلسلہ میں استعمال کرتا ہے تو اس سے مقصود محض "پکارنا" نہیں ہوتا، خدا کی اطاعت کرنا بھی ہوتا ہے۔ دعا کا قرآنی مفہوم سمجھنے کے لئے اس بنیادی فرق کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے پہلے ہم قرآن کے وہ مقامات سامنے لاتے ہیں جن میں یہ لفظ، اطاعت کے معنوں میں آیا ہے۔

سورۃ المومن میں ہے۔ هُوَ الۡحَیُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ؕ...... وہ (خدا) زندہ ہے اور زندگی بخش۔ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس لئے

دُعا کے معنی اطاعت کرنا

تم اطاعت اور محکومیّت کو اس کے لئے خالص اور مختص کرتے ہوئے اسے "پکارو" (ہم اس کا ترجمہ "پکارو" ہی کریں گے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ قرآن کی رُو سے خدا کے پکارنے سے مراد اس کی اطاعت کرنا ہے)۔ اس کے بعد ہے قُلۡ اِنِّیۡ نُهِیۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ..... (اے رسولؐ!) ان سے کہہ دو کہ مجھے اس سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں، ان کی عبودیّت (محکومیّت، اطاعت) اختیار کروں جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر "پکارتے ہو" یہاں دیکھئے۔ دعَا (پکارنا) اور عبادت (اطاعت کرنا) کے الفاظ مرادف معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور آخر میں ہے وَ اُمِرۡتُ اَنۡ اُسۡلِمَ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (۶۵ ـ ۴۰/۶۶)۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں صرف خدائے رب العالمین کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کروں۔ "اسلم" نے دعَا اور عبادت کے الفاظ کا مفہوم بالکل واضح کر دیا، یعنی احکامِ خداوندی کے سامنے جُھک جانا۔

سورۂ مریم میں، حضرت ابراہیمؑ کے تذکارِ جلیلہ کے ضمن میں کہا کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔ میں تم سے بھی قطع تعلق کرتا ہوں اور ان سے بھی جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر "پکارتے ہو" وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ۔ میں اپنے رب کو "پکارتا ہوں"۔ اس کے بعد ہے فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ...... (۴۸ ـ ۱۹/۴۹)۔ چنانچہ جب اس نے ان سے اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے، ان سے قطع تعلق کر لیا۔ یہاں بھی دیکھئے تَدۡعُوۡنَ اور یَعۡبُدُوۡنَ کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

سورۂ مومن میں ہے وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۔ تمہارا رب تم سے کہتا ہے کہ تم مجھے "پکارو"۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ "(پکار کا جواب دوں گا" اس کا قرآنی مفہوم آگے چل کر سامنے آئے گا) اس کے بعد ہے، اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ٥ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری عبادت (اطاعت، محکومیت) سے سرکشی اختیار کرتے ہیں، وہ ذلیل و خوار ہو کر داخلِ جہنم ہوں گے۔ یہاں بھی دیکھئے۔ دعا اور عبادت کے الفاظ ہم معنی آئے ہیں۔

سورۂ طور میں۔ ہے کہ اہلِ جنّت سے پوچھنے والے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی وجہ سے تم جنت کے مستحق قرار پا گئے، وہ جواب میں کہیں گے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ (۵۲/۲۸) ہم اس سے پہلے (دنیاوی زندگی میں) خدا کو "پکارا کرتے تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد احکامِ خداوندی کی اطاعت ہی ہو سکتی ہے کیونکہ محض خدا کو پکارنے سے تو کوئی بھی جنّت کا مستحق اور وارث قرار نہیں پا سکتا۔

ایک مقام پر رسول اللہ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَ لَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۷۲/۲۰)۔ ان سے کہو کہ میں صرف اپنے رب کو "پکارتا ہوں" اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یہاں بھی "پکارنے" سے مراد، خدا کی عبودیت اختیار کرنا اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرنا ہے۔ (شرک کے معنی ہی غیر خداوندی اقتدار کی اطاعت ہے)۔

یہی حضرات انبیاء کرامؑ کی عام دعوت تھی کہ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (۲۶/۲۱۳؛ ۲۸/۸۸)۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو نہ "پکارو" (نیز ۷۲/۱۸)۔

سورۂ انعام میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہدو کہ جب مجھے خدا کی طرف سے اس قسم کی روشن ہدایت (راہ نمائی) مل چکی ہے تو اس کے بعد میں بھلا غیر اللہ کو کس طرح "پکار سکتا ہوں" وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۶/۷۱)۔ جبکہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خدائے رب العالمین کے سامنے ہی جھکوں۔ اس کے سوا کسی اور کے احکام کی اطاعت نہ کروں — ہدایتِ خداوندی اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے الفاظ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ "خدا کو پکارنے" سے مراد اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا ہے۔

اس کے بعد ہم ان مقامات کی طرف آتے ہیں جہاں "خدا کو پکارنے" سے مراد (عرفِ عام میں) "دعا مانگنا" ہیں۔ لیکن ان مقامات کو سامنے لانے سے پہلے، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ دعا کے اس مفہوم سے جو شکوک و اعتراضات اُبھرتے ہیں، انہیں بھی سامنے لایا جائے۔

دُعا کا عام مفہوم

اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہو، اسے خدا نے پہلے سے لکھ دیا ہوتا ہے اور یہ (قسمت کا لکھا) اٹل ہوتا ہے، تو پھر دُعا کے کچھ معنی ہی نہیں رہتے۔ مثلاً ایک شخص کے متعلق پہلے سے طے شدہ ہے کہ اس نے اتنے دن بیمار رہ کر مر جانا ہے۔ اب اس کے لئے، وہ خود یا اس کے متعلقین لاکھ دعائیں کریں، قسمت کے لکھے میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ وہ اتنے دن بیمار رہے گا اور اس کے بعد مر جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے تو پھر یہ عقیدہ غلط قرار پائے گا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے ــــ جو فیصلہ بدل سکتا ہے

اس سے پیدا ہونیوالے شکوک

ــــ خواہ وہ دعا سے بدلے یا تدبیر سے ــــ وہ اٹل نہیں کہلا سکتا اور اس کے ساتھ ہی، اس عقیدہ کی رُو سے، خود اللہ تعالےٰ کے متعلق بھی عجیب سا تصور سامنے آتا ہے کہ پہلے اس نے ایک بات کا فیصلہ کر دیا اور کہہ دیا کہ ہمارا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ اس کے بعد وہ انتظار کرنے لگا کہ اگر اس شخص نے (یا اس کے متعلقین نے) ہم سے درخواست کی تو ہم اپنا فیصلہ بدل دیں گے اور اگر یہ خاموش رہے تو وہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ سوچئے کہ خدا کے متعلق اس قسم کے تصور سے کیسے اشکال لاحق ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہر بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ کا فیصلہ ساتھ کے ساتھ کرتا ہے تو اس سے اور بھی زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً زیدؔ اور بکرؔ کا باہمی مقدمہ ہے جس کا فیصلہ عدالت نے کرنا ہے۔ زیدؔ حق پر ہے اور بکرؔ جھوٹا ہے۔ دونوں خدا سے دعا کرتے ہیں کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی دعا قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ مقدّمہ کا فیصلہ لامحالہ ایک ہی کے حق میں ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی دعا قبول ہو گی۔ اگر کہا جائے کہ اس کی دعا قبول ہو گی یا جو زیادہ گڑگڑا کر دعا مانگے، تو ہو سکتا ہے کہ بکرؔ زیادہ خشوع و خضوع سے دعا مانگے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر نہیں اور مقدّمہ کا فیصلہ اُس کے خلاف ہو گا جو برسرِ حق ہے!

اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا اس کی دعا قبول کرے گا جو حق پر ہے (یعنی زید کی)، تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر زید دعا نہ مانگتا تو پھر کیا ہوتا۔ کیا پھر خدا بکر کا ساتھ دیتا کیونکہ اس نے دعا مانگی تھی اور زید نے دعا نہیں مانگی تھی؟

اور اگر کہا جائے کہ خدا بہر حال، حقدار کا ساتھ دے گا، تو اوّل یہ چیز واقعہ کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں عدالتوں سے آئے دن ایسے فیصلے صادر ہوتے رہتے ہیں جو حق کے خلاف ہوتے ہیں ___ حتیٰ کہ کئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھا دیئے جاتے ہیں ___ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ خدا حق کا ساتھ دیتا ہے تو اس صورت میں دعا کا پھر کوئی مطلب نہ رہا۔ حقدار، دعا کرے یا نہ کرے، خدا بہر حال اس کا ساتھ دے گا اور جو حق پر نہیں، وہ لاکھ دعائیں کرے، خدا اس کی سنے گا نہیں۔

اگر کہا جائے کہ خالی دعا نہیں بلکہ دُعا کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔ دعا سے تدابیر کامیاب ہو جاتی ہیں تو اس سے پھر وہی دشواری لاحق ہو جاتی ہے۔ زید اور بکر دونوں تدبیر کرتے ہیں لیکن بکر اس کے ساتھ دعا بھی کرتا ہے اور زید دعا نہیں کرتا۔ تو کیا، اس صورت میں بکر کی تدبیر کارگر ہو جائے گی کیوں کہ اس نے دُعا بھی کی تھی اور زید ناکام رہ جائے گا کیونکہ اس نے دعا نہیں کی تھی۔ (حالانکہ وہ حق پر تھا)۔

یہ ہیں وہ اشکال جو ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد کی رُو سے، دعا کے سلسلہ میں ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہمارے سامنے سورۂ بقرہ کی وہ آیت آتی ہے جسے دعا اور اس کی قبولیت کے ضمن میں بنیادی طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جس کا غلط مفہوم ان دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔

وَ إِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ .... (۲/۱۸۶)

اور اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

(اے رسولؐ!) جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا اور اُسے قبول کرتا ہوں۔

اس ترجمہ کی رُو سے دشواری یہ پیش آتی ہے کہ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مظلوم و مقہور، غریب و نادار، بے کس

ورنہ بس، مصیبت زدہ لوگ گڑگڑا، گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ان کی کوئی مصیبت رفع نہیں ہوتی۔ ان کی ساری عمر ظلم و ستم سہتے سہتے مصیبتوں میں کٹ جاتی ہے۔ لہذا، اس امر واقعہ کی موجودگی میں یہ کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا اور اس کی دعا کو قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں عام طور پر کہہ یہ دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سنتا تو سب کی ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دعا مانگنے والے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ لہذا، اگر کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا ہے اس کے حق میں وہی بہتر تھا۔ لیکن یہ جواب (قطع نظر اس سے کہ ستم رسیدہ، مصیبت زدہ، برسرِ حق مظلوم انسان کا اس سے حقیقی اطمینان نہیں ہو سکتا) بڑے دُور رس (تخریبی) نتائج کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک مظلوم انسان، ظالم کی دست درازیوں کے خلاف خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے بعد دیکھتا ہے کہ اس کی حالت ذرا بھی بہتر نہیں ہوئی، بلکہ اس مستبد ظالم کے ظلم میں اور اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے، تو (مذکورہ بالا جواب کی رُو سے) اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ظالم کا ظلم اس کے حق میں بہتر اور خدا کی منشار کے عین مطابق ہے اس لئے اسے اب نہ اس کے مظالم کے خلاف لب کشائی کرنی چاہیئے اور نہ ہی اس سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچنی۔ غور کیجئے کہ اس قسم کے عقائد، ظالموں کو کس طرح بدلگام چھوڑ دینے کا موجب بن جاتے ہیں۔ اس سے پہلے، ان ظالموں کے خلاف مظلوموں کے دل میں (کم از کم) انتقام کے جذبات تو اُبھرتے تھے اور ہو سکتا تھا کہ وہ ان کے دستِ تظلّم سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر سوچ لیتے۔ لیکن اس عقیدہ کے بعد تو صورت یہ ہوگی کہ مظلوم نہ صرف ظلم و زیادتی کو دل کے پورے سکون کے ساتھ برداشت کرے گا بلکہ ظالم کے حق میں دعائے خیر بھی کرے گا کہ وہ اس کے لئے بہتری کے سامان پیدا کر رہا ہے! یا للعجب۔ آپ نے دیکھا کہ مستبد قوتیں، محکوموں اور زیر دستوں کے لئے کس کس قسم کے عقائد وضع کرتی رہتی ہیں تاکہ وہ انہیں ذبح کریں اور یہ اُن کے شکر گزار ہوں۔

اس سے بھی آگے بڑھئے تو یہ عقیدہ سامنے آتا ہے کہ خدا ہر ایک کی نہیں سنتا۔ وہ اپنے مقبول بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ کو ہر "حضرت صاحب" کے آستانِ عالیہ

خدا اپنے مقبول بندوں کی دعائیں سنتا ہے

پر مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے جو گڑگڑا، گڑگڑا کر، ہاتھ باندھے اور اکثر، ان کے پاؤں چومتے درخواست کرتے ہیں کہ یا حضرت! میرے لئے دُعا کیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا،

برباد ہو جاؤں گا۔ اور یہ سلسلہ "حضرت صاحب" کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا، ان کی وفات کے بعد (جسے وفات نہیں بلکہ وصال کہا جاتا ہے، یعنی ان کا اپنے محبوب — خدا — سے جا کر مل جانا) ان کے مزار شریف سے وابستہ ہو جاتا ہے، جہاں ان سے، سجدوں میں گر گرا التجائیں کی جاتی اور مرادیں مانگی جاتی ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہم گنہگار بندے ہیں اس لئے ہماری خدا تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ حضرات مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں، اس لئے خدا ان کی بات مانتا ہے۔ (یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی قرآنِ مجید کی وہ آیت بھی پڑھی جاتی ہے جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ...... "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہدو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں")۔

ظاہر ہے کہ خدا کے مقربین کی وساطت سے خدا تک درخواست پہنچانے کا یہ عقیدہ ہمارے دورِ ملوکیت کی تخلیق ہے۔ اُس دور میں ذہنوں میں یہ بٹھایا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض، بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا "سایہ" زمین پر دیکھا گیا اُسی قسم کی اس کی "اصل" آسمان پر تصور کر لی گئی۔ اس سایہ کی رُو سے، خدا کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ ظاہر ہے۔ یہاں کے بادشاہوں کی طرح وہ (شاہنشاہِ حقیقی) بھی ایک آمرِ مطلق سمجھا جاتا ہے — نہ کسی قاعدے کا پابند نہ قانون کا — جسے چاہا پکڑ لیا جسے چاہا نواز دیا۔ جسے چاہا بخش دیا جسے چاہا باندھ لیا۔ اسی سلسلہ میں بادشاہ کا دربار سامنے آیا جس میں سب سے پہلے حاجب و دربان کھڑے ملتے تھے۔ پھر اہلِ دربار میں سے مصاحب، امراء، وزراء اور پھر مقربینِ بارگاہِ سلطانیہ سامنے آتے تھے۔ کسی عام آدمی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنی درخواست براہِ راست سلطان المعظم تک پہنچا سکے۔ اس کے لئے اسے مقربین کے وسیلے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہی نقشہ ہم نے دربارِ خداوندی کا متعین کر لیا۔ اس کی رُو سے، خدا تک بات پہنچانے کے لئے اس کے مقربین کی وساطت ضروری قرار پائی۔ یہ ہے وہ ضرورت جس کے پیش نظر، خدا تک دُعا پہنچانے کے لئے کسی "حضرت صاحب" کے وسیلہ کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ ہماری درخواست بھی خدا تک پہنچاتے ہیں اور اس کے ساتھ سفارش بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بات مان لیتے ہیں اور ہماری درخواست (دعا) منظور ہو جاتی ہے۔ درخواست کے ساتھ کچھ نذر نیاز بھی دینی پڑتی ہے، بعینہٖ جس طرح بادشاہوں

السلطان ظل اللہ علی الارض کا عقیدہ

کے حضور نذرانہ گزارنا پڑتا ہے یا ان کے مقربین کی "خدمت" کرنی پڑتی ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو شاہنشاہیت نے ہمارے ذہنوں پر مرتسم کیا اور جس نے رفتہ رفتہ مقدس عقائد کی شکل اختیار کرلی۔ مرورِ زمانہ سے یہ عقائد اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئے کہ اب اگر ان کے خلاف کوئی بات کہی جائے تو اربابِ شریعت کی طرف سے اس پر کفر اور الحاد کے فتوے لگادیئے جاتے ہیں اور دامانِ طریقت سے وابستگان پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے کہ نہ معلوم "حضرت صاحب" کی طرف سے کیسا غضب نازل ہوجائے گا' حالانکہ ان حضرات کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (۷/۱۹۴)۔ وہ تمہارے ہی جیسے انسان (خدا کے بندے) ہیں۔ اور جن مزاروں پر جاکر مرادیں مانگی جاتی ہیں' یا انہیں خدا تک بات پہنچانے کا واسطہ قرار دیا جاتا ہے' ان کے متعلق کہا ہے کہ تم انہیں لاکھ پکارو' وہ تمہاری بات ہی نہیں سُن سکتے۔ اور اگر (بفرضِ محال) وہ سن بھی لیں تو اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے (۳۵/۱۴)۔ تم انہیں جو کچھ پکار پکار کر کہتے ہو' وہ اس سے قطعًا بے خبر ہوتے ہیں (۴۶/۵)۔ انہیں تو خود اپنے متعلق بھی اتنا علم نہیں ہوتا کہ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱)۔ وہ کب اٹھائے جائیں گے۔ جو اپنے حال سے بھی بے خبر ہیں وہ تمہاری کیا سُنیں گے اور کیا مدد کریں گے؟

دعائیں کس کی قبول ہوتی ہیں

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ دعائیں قبول کن لوگوں کی ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس آیت کو لیجئے جس کا ایک حصہ ہم دوبار نقل کرچکے ہیں۔ یعنی "جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔" اس کے بعد ہے کہ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ٥ (۲/۱۸۶)۔ ان سے کہو کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری مانگ پوری ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری راہ نمائی (قوانین) کی صداقت پر پورا پورا یقین رکھو اور میری اطاعت کرو (میری باتوں کا جواب دو)۔ اس طرح کامیابی کا صحیح راستہ تمہارے سامنے آجائے گا۔

سورۂ شوریٰ میں ہے یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲/۲۶) - دعائیں قبول ان کی ہوتی ہیں جو ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں، یعنی ایمان و اعمال صالح کا لازمی او

فطری نتیجہ کامیابی ہوتا ہے اور یہی دعا سے مقصود ہوتا ہے۔

سورۂ مومن میں ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔ لیکن اتنی بات سن رکھو۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (۴۰/۶۰)۔ جو لوگ میری اطاعت سے سرکشی اختیار کریں گے، (ان کی دعائیں قبول نہیں ہوں گی) وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ سورۂ اعراف میں خدا کو پکارنے کے ساتھ ہی کہہ دیا کہ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (۷/۵۵)۔ وہ انہیں پسند نہیں کرتا جو حدود سے تجاوز کر جائیں۔ یاد رکھو! جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کریں، ان کی دعائیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ (۴۰/۵۰)۔ دعاؤں کی مقبولیت کے لئے ایمان شرطِ اوّل ہے۔ اور ایمان کے متعلق بھی سن رکھو کہ "انہی لوگوں کے متعلق سمجھا جائے گا کہ وہ فی الواقعہ ایمان لاتے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کئے جائیں تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیں اور پھر خدا کی صفتِ ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے پوری پوری جدّ و جہد کریں اور کسی حالت میں بھی اطاعتِ خداوندی سے سرکشی اختیار نہ کریں۔ وہ لوگ اس جدّ و جہد میں راتوں کی نیند تک بھی اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ وَیَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۝ (۳۲/۱۵-۱۶) وہ اس طرح بیم و رجا، دونوں حالتوں میں خدا کو پکارتے ہیں اور جو کچھ خدا نے انہیں دے رکھا ہوتا ہے، اسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم متعلقہ آیات کا مفہوم، مفہوم القرآن سے پیش کرتے ہیں۔ فرمایا۔

> جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں، قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیریت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔
>
> ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں، کھڑے بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور کائنات کے تخلیقی پروگرام پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد، علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس کارگاہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو

کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت پیدا کر دے۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم، (علمی تحقیقات اور عملی تجارب کے بعد) اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اسطرح) تباہ کن عذاب سے محفوظ رہیں۔

جو قومیں اس قسم کی تحقیقات نہ کرنے سے اشیائے کائنات کی نفع بخشیوں سے محروم رہتی ہیں، ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں اور وہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں ــــ ــــ اور ظاہر ہے کہ ایسی ذلیل و خوار قوموں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں دنیا کی تباہی کے لئے استعمال نہ کیا جائے، بلکہ نوعِ انسان کی ربوبیتِ عامہ کے لئے صرف میں لایا جائے۔ ایسا کچھ وہی قوم کر سکتی ہے جو خدا کی راہ نمائی پر یقینِ محکم رکھے۔

لہذا، ان اربابِ عقل و بصیرت کی پکار یہ بھی ہوتی ہے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے ایک پکارنے والے کو یہ کہتے سنا کہ آؤ! اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ ہم نے اس کی دعوت پر لبیک کہا اور خدا پر ایمان لے آئے۔

اس کے بعد ان اربابِ علم و ایمان کے سینے میں اس قسم کی آرزوئیں بیدار ہوتی ہیں (وہ دعائیں مانگتے ہیں) کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم سے اگر کوئی بھول چوک ہو جائے تو اس کے مضرت رساں نتائج سے ہمیں محفوظ رکھنا اور ہماری چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں اور تدبیری غلطیوں کے اثرات مٹاتے رہنا۔ اور ہمارا انجام ان لوگوں کی رفاقت میں کرنا جن کے سامنے زندگی کی وسعت اور کشادگی کی راہیں کھل چکی ہوں۔

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے ہم سے، اپنے رسولوں کے ذریعے (وحی کی رُو سے) جن خوشگواریوں اور سرفرازیوں کا وعدہ کیا ہے ان سے ہمیں بہرہ یاب کرنا اور ایسا نہ کرنا کہ اعمال کے ظہورِ نتائج کے وقت ہم دنیا کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تو وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔ (۱۸۹ - ۳/۱۹۴)۔

دعائیں مانگنے والوں کی خصوصیات کو بھی آپ نے دیکھ لیا اور ان کی دعاؤں کو بھی۔ اب خدا کی طرف سے اس کا جواب سنئے۔ ارشاد ہوا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ...... (۳/۱۹۴)۔

خدا نے ان کی دعاؤں کا یہ جواب دیا کہ (ہم نے تمہاری دعاؤں کو سُن لیا ہے۔ لیکن تم یاد رکھو کہ) ہم کسی کام کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کرتے۔ وہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ دیتے ہیں۔

یہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے دعاؤں کا جواب اور ان کی قبولیّت کی شرط۔

انبیاء کرامؑ کی دُعاؤں کی قبولیّت

یہ تو تھی عام مومنین کی کیفیت۔ اب ذرا حضرات انبیاء کرامؑ کی دعاؤں کی قبولیت کی صورت بھی ملاحظہ کر لیجئے تاکہ بات اور بھی واضح ہو جائے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق کہا کہ جب ان کی قوم نے ان کی سخت مخالفت کی تو نَادٰنَا۔ اس نے ہمیں پکارا۔ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ (۳۷/۷۵)۔ تو ہم دعاؤں کا بہترین جواب دینے والے ہیں۔ انکی دُعا کا کیا جواب دیا گیا تھا، غور سے سنئے۔ فَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَ وَحْیِنَا (۲۳/۲۷)۔ ہم نے اس کی طرف وحی کی تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری ہدایات کے مطابق ایک کشتی بناؤ یعنی حضرت نوحؑ کی دُعا کے جواب میں، یہ نہیں کہا گیا کہ تم آرام سے بیٹھے رہو۔ ہم تمہاری حفاظت کا انتظام کردیں گے۔ انہیں وہ تدبیر بتا دی جس سے وہ اور ان کی جماعت آنیوالے سیلاب سے محفوظ رہیں۔

جب حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ وہ فرعون کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں، تو انہوں نے، اس مہم کی سختی اور اس میں پیش آنے والے خطرات کے احساس سے خدا سے بہت سے تائیدی اسباب و ذرائع کی دعا کی تاکہ وہ ان کی تقویّت کا موجب بنیں۔ اس کے جواب میں کہا کہ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی ٥ (۲۰/۳۶)۔ اے موسیٰؑ! جو کچھ تُو نے مانگا ہے ہم نے تجھے عطا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ جب خدا نے اس طرح کہہ دیا ہو کہ ہم نے تیری دعا قبول کرلی اور تیری مانگ پوری کر دی ہے تو پھر کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے کہہ دیا کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰیٰتِیْ وَ لَا تَنِیَا فِیْ ذِكْرِیْ (۲۰/۴۲)۔ تم دونوں (حضرت

موسٰےؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) فرعون کی طرف جاؤ اور یاد رکھو، جو پروگرام تمہیں دیا گیا ہے اس کے بروئے کار لانے میں ذرا سی بھی سستی نہ کرنا۔ دوسری جگہ ہے قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا وَ لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِیْلَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ (۱۰/۸۹)۔ خدا نے کہا کہ میں نے تمہاری دُعا کو قبول کر لیا ہے۔ اب تم اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہو جاؤ اور یاد رکھو، تم کبھی ان لوگوں کا اتباع نہ کرنا جو حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسی طرح حضرت موسٰےؑ نے دعا کی کہ ان کی اُمّت کو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں عطا کر دی جائیں تو جواب میں کہا گیا کہ ایسا ہو جائے گا بشرطیکہ "یہ لوگ نبیٔ آخر الزّمان کا اتباع کریں۔ اس میں شُبہ نہیں کہ ہماری رحمت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے وہ انہی کو ملتی ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں۔ ان کی پوری پوری نگہداشت کریں اور دوسروں کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کریں۔" (۱۵۶ - ۷/۱۵۷)۔

حضرت زکریّاؑ نے بیٹے کے لئے دُعا کی تو انہیں اس کی خوشخبری اسی وقت دے دی گئی۔ لیکن یہ دُعا پوری اس طرح ہوئی کہ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (۸۹ - ۲۱/۹۰)۔ ان کی بیوی میں جو نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہو گئی۔[1]

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ جن دعاؤں کے متعلق یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے انہیں قبول کر لیا ہے، ان کے سلسلہ میں بھی یہ تاکید کر دی کہ ان کی کامیابی کے لئے جن طبیعی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے انہیں بہم پہنچایا جائے اور اپنے پروگرام پر ثبات و استقامت سے عمل پیرا ہوا جائے۔ یہ نہیں کہ دعا مانگ لی اور پھر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ اسی قسم کی دعاؤں کے متعلق سورۂ رعد میں ہے

لبِ دریا پیاسا

کہ تم ذرا اس پیاسے کا تصوّر سامنے لاؤ جو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے دریا کے کنارے کھڑا ہے۔ کیا ایسے شخص کی پیاس بجھ جائے گی؟ کبھی نہیں۔ پیاس اس کی بجھے گی جو آگے بڑھ کر پانی سے چُلّو بھر لے اور اسے پی لے۔ پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کھڑے رہنے سے قیامت تک پیاس دور نہیں ہو سکتی۔ وَ مَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ (۱۳/۱۴)۔

---

[1] حضرات انبیائے کرامؑ کی دعاؤں کے سلسلہ میں مزید تصریحات ذرا آگے چل کر سامنے آئیں گی۔

جو لوگ قانونِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی دعائیں یوں رائگاں جاتی ہیں۔

اس مقام پر کہا جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اپنی جگہ بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا خدا کی خدائی میں، مظلوموں اور مصیبت کے ماروں کی کوئی داد فریاد نہیں! ان کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں۔ ان کی پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں۔ ان کی دعاؤں کا سننے والا کوئی بھی نہیں؟ قرآن ان سوالوں کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کی دعائیں سُنی بھی جاتی ہیں اور قبول بھی کی جاتی ہیں.

مظلوموں کی دعائیں کیسے سُنی جاتی ہیں

لیکن اس کا طریق کچھ اور ہے۔ وہ طریق کیا ہے، اسے غور سے سنیئے۔

برسہا برس کی محنتِ شاقہ اور تگ و تازِ پیہم کے بعد، مدینہ میں جماعتِ مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو گئی لیکن جو مسلمان اس وقت تک مکہ میں محصور تھے، قریش کی طرف سے ان پر مظالم کا سلسلہ شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس انتہائی بے کسی اور مظلومیت کے عالم میں انہوں نے خدا سے دُعا کی کہ ہماری مدد کر اور ہمارے لئے ان ظالمین کے جور و ستم سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت پیدا کر۔ انہوں نے خدا سے دعا کی اور آپ کو معلوم ہے کہ خدا نے کیا کیا؟ خدا نے مدینہ کی جماعتِ مومنین سے کہا کہ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اے جماعتِ مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ کیا تم سنتے نہیں کہ مکہ کے مظلوم و مقہور، بے کس و بے بس، کمزور و ناتواں، مرد، عورتیں، بچے کس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں کہ بارِ الٰہا! ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والوں نے اس قدر ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی ہے۔ اے مملکتِ اسلامی کے علمبردارو! کیا تم ان کی اِن دعاؤں کو نہیں سُن رہے؟ اور اگر سن رہے ہو تو پھر تم کس بات کے انتظار میں ہو۔ تم ان کی امداد کے لئے اٹھتے کیوں نہیں۔ تم نہیں سُن رہے کہ وہ ہم سے کس الحاح و زاری سے کہہ رہے ہیں کہ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِیْرًا o (۴/۷۵)۔ وہ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ تو اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی یار و مددگار پیدا کر۔ کوئی حامی و ناصر بھیج۔

غور کیجئے، مکہ کے مظلوم، خدا سے فریاد کرتے ہیں۔ خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ براہِ راست ان کی امداد کر دیتا اور انہیں دشمنوں سے نجات دلا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اُس مملکت، اُس حکومت، اُس نظام سے کہا جو اس کے نام پر، اُس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے قائم ہوا تھا کہ تم ان کی پکار کا جواب دو۔ تم ان کی مدد کے لئے اٹھو۔

یہ ہے مظلوموں کی دعاؤں کے قبول ہونے کا صحیح طریقہ۔ یہی جماعتِ مومنین، جواب مدینہ میں تھی،

مظلوموں کی دعائیں اسلامی مملکت سنتی ہے

تیرہ برس تک، قریش کے بے پناہ مظالم کا تختۂ مشق بنی رہی۔ انہوں نے اس زمانے میں، خدا سے کچھ کم دعائیں تو نہیں مانگی ہوں گی! لیکن چونکہ اس وقت دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں تھا جو مظلوموں کی دادرسی کے لئے وجود میں آیا ہو، اس لئے ان کی مدد کا کوئی سامان نہ ہو سکا۔ ان سے کہا جاتا رہا کہ تم ہمت و استقلال سے کام لے کر، اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ ایک دن تمہاری حکومت قائم ہو جائے گی تو ان تمام مشکلات کا حل خود بخود مل جائے گا۔ اور اس طرح تمہاری اپنی مشکلات ہی حل نہیں ہو جائیں گی، تم ان مظلوموں کی امداد کے قابل بھی ہو جاؤ گے جو ہم سے (خدا سے) نصرت و اعانت کی دعائیں مانگیں گے۔ دیکھئے، اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے دوسری جگہ کس بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ فرمایا۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ کہو! کہ وہ کون ہے جو قلبِ مضطر کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو دُور کر دیتا ہے! وہ اس کے لئے کیا کرتا ہے وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ (۲۷/۶۲)۔ وہ تمہیں حکومت و مملکت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ہے طریقِ خداوندی جس سے مظلوموں کی مصیبتیں رفع ہوتی ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ حکومت بھی محض دعائیں مانگنے سے عطا نہیں ہو جاتی۔ یہ ان کے ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ ہوتی ہے ۲۴/۵۵)۔

دوسرے مقام پر اسی جماعتِ مومنین کے متعلق کہا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۚ (۴۲/۳۸)۔ " یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس کے احکام و قوانین کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ انہی کی روشنی میں، اپنے امورِ مملکت باہمی مشورہ

سے طے کرتے ہیں۔ اور جو سامانِ زیست خدا نے انہیں دے رکھا ہو اسے رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔" آپ نے غور فرمایا کہ یہاں بھی (مشاورتِ باہمی سے) اشارہ اسی نظامِ مملکت کی طرف ہے جسے دنیا سے ظلم اور ناانصافی دور کرنے کے لئے متشکل کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریق تھا جس سے بنی اسرائیل کو، قومِ فرعون کے مظالم سے نجات دلائی گئی تھی۔ سورۂ قصص میں ہے کہ

> فرعون نے اپنی مملکت میں دھاندلی کی انتہا کر رکھی تھی۔ وہ اپنی قوت کو مستحکم رکھنے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور اس طرح ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور سے کمزور تر کئے چلا جاتا تھا (کہ وہ ابھرنے نہ پائیں)۔ اس کے لئے وہ کرتا یہ تھا کہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اسے جوہرِ مردانگی دکھائی دیتے، ذلیل و خوار کرکے غیر مؤثر بنا دیتا اور جوان جوہروں سے عاری ہوتے انہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس طرح وہ ان میں ناہمواریاں پیدا کئے چلا جاتا۔
>
> اس کی اس سرکشی اور فساد انگیزی کے پیشِ نظر ہمارے قانونِ مکافات کا فیصلہ یہ تھا کہ جس قوم کو وہ اس قدر کمزور کئے جارہا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ یعنی انہیں ملک میں سرداری اور سروری عطا کر دی جائے اور انہیں ایک ایسے خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے، جہاں ان کی اپنی حکومت ہو۔ (۲۸/۶-۴)۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوں اور بیکسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے۔ اس کی ضرورت پیش آتی ہے اس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو۔ ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو۔ کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے۔ جہاں مظلوم کی مدد

دُعا مانگنے کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

کرنے اور ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہ ہو۔ جہاں اس شخص کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو جو معاشرہ میں تہارہ جائے۔ جہاں غنڈہ گردی ایسی ہو کہ شریف انسانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے۔ جہاں افراتفری اور نفسا نفسی کا یہ عالم ہو کہ جو کہیں اتفاق سے گر جائے، سب اسے روندتے چلے جائیں، کوئی اس کے اٹھانے کی فکر نہ کرے۔ جہاں کسی کو اس کا خیال نہ ہو کہ کس کے بچے بھوکے ہیں اور کس کے تن پر کپڑا نہیں۔ جہاں مفلس مریض اس لئے بِن آئی موت مر جائے کہ اس کے پاس علاج کے لئے پیسہ نہیں تھا اور بیوہ ماں

اپنے جوان بیٹے کی موت پر اس فکر میں گھلی جا رہی ہو کہ اسے گور دکفن کیسے مل سکے گا اور اب میرا کیا بنے گا۔
یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بیکسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں)۔ یہی ہے وہ معاشرہ جس سے متاثر ہو کر کہنے والے نے کہا ہے کہ

جو نہیں آشنا مصیبت کا — درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا — جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دُعا کیا ہے
اسے معلوم کیا خدا کیا ہے

صحیح معاشرہ میں یہ کچھ نہیں ہوتا

جب معاشرہ صحیح خطوط (مستقل اقدارِ خداوندی) پر متشکل ہو تو اس میں ہر بات کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر حقدار کو اس کا حق ملتا ہے اور بغیر کسی پریشانی اور تردّد کے ملتا ہے۔ نہ کسی پر کوئی ظلم ہوتا ہے نہ دھاندلی۔ اس میں ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی چلی جاتی ہیں، اس لئے اس میں نہ کوئی محتاج ہوتا ہے نہ بے نوا۔ اس میں نہ کوئی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے نہ بے سہارا۔ ایسے معاشرہ میں کسی کو خدا سے وہ کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی جس کے لئے ہم قدم قدم پر اپنے آپ کو محتاج اور لاچار پاتے اور خدا سے التجائیں کرتے ہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو حضرت عمر فاروقؓ نے ایسے بلیغ اور عمیق انداز میں بیان کیا ہے کہ جب بھی اس پر غور کیا جائے رُوح وجد میں آجاتی ہے۔ ان کا ایک قول اس سے پہلے بھی آپ کی نظروں سے گزر چکا ہے، یعنی جب آپ نے طاعون زدہ علاقہ سے منتقل ہو کر اس علاقہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا جو طاعون سے متاثر نہیں تھا تو آپ سے کہا گیا تھا کہ کیا آپ خدا کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ "ہاں! میں خدا کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔"

حضرت عمرؓ فاروق کا نہایت بلیغ ارشاد

اب آپ انہی کا ایک اور قول ملاحظہ کیجئے اور سوچئے کہ ان دست پروردگانِ رسالتؐ نے دین کی لِم کو کس حسن و خوبی سے سمجھا تھا اور مبدا فیض نے انہیں، ایسے عمیق حقائق کو عام فہم الفاظ میں سمجھانے کا کیسا دلکش انداز عطا فرمایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ لوگو! اسے سُن رکھو:۔

مجھے خلافت کا فریضہ اس لئے سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اللہ اکبر! کتنی بلند حقیقت کو کیسے سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ قیامِ خلافت کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورتمند کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے۔ جب کیفیت یہ ہوگی تو پھر کسی شخص کو اپنی ضروریات کے لئے خدا سے دعا کرنے کی حاجت ہی نہیں رہیگی۔ اور اگر کوئی شخص، اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرتا پایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہا ہوں اور وہ شخص میرے خلاف گویا خدا سے شکایت کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے فوراً احتسابِ خویش کرنا ہوگا اور اس امر کی کوشش کہ میری شکایت بارگاہِ خداوندی تک نہ پہنچنے پائے۔ ضرورت مند کی ضرورت اس سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

یہ ہوتی ہے اس معاشرہ کی کیفیت جو وحی کی راہ نمائی میں متشکل ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو اپنی انفرادی ضروریات کے لئے خدا سے کچھ مانگنا ہی نہیں پڑتا۔ جسے، سب کچھ از خود مل رہا ہو، اسے مانگنے کی کیا ضرورت ہوگی! یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں مومنین کی جس قدر دعائیں مذکور ہیں سب اجتماعی ہیں انفرادی نہیں۔ یہ اجتماعی دعائیں کس مقصد کے لئے کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ خود ان دعاؤں سے لگ سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے مومنین کی چند ایک دعائیں۔

مومنین کی سب دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں

(۱) اے ربّ العالمین! ہمیں زندگی کی سیدھی اور ہموار راہ دکھا دے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تیرے سحابِ کرم کی بارش ہوئی تھی۔ (۵-۱/۷)۔

(۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں اس دنیا میں بھی حسنات عطا فرما اور آخرت میں بھی حسنات۔ (۲/۲۰۱)۔

(۳) مجاہدین کی دعائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ثبات و استقامت عطا فرما تاکہ ہمارے قدموں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اگر ہم سے کہیں بھول چوک ہو جائے تو اس کے نقصان سے ہماری حفاظت فرما دے اور ہمیں مخالفین پر کامیابی عطا فرما۔ (۲/۲۵۰) ؛ (۱۴۷-۳/۱۴۶)۔

(۴) اے ہمارے پروردگار! ہمارے سہو و نسیان سے درگزر فرما۔ ہم جہالت اور غفلت کے اُس

بوجھ تلے نہ دب جائیں جن کے نیچے اقوامِ سابقہ دب گئی تھیں۔ ہمیں اتنی قوت عطا فرما دے جس سے ہم اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہوسکیں۔ ہمیں ان لوگوں پر غلبہ و نصرت عطا کر دے جو تیرے نظام کے مخالف ہیں۔ (۲/۲۸۶) ؛ (۳/۱۵)۔

(۵) اے ہمارے رب! ایسا نہ ہو کہ صحیح راستہ مل جانے کے بعد ہمارے قدم پھر غلط راستے کی طرف اُٹھ جائیں۔ تو ہمیں سامانِ نشوونما عطا فرماتا رہ۔ (۳/۷)۔

(۶) اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے جو وعدے اپنے رسولوں کی وساطت سے ہم سے کئے ہیں انہیں پورا کر دے۔ (۱۹۲۔ ۳/۱۹۳)۔

(۷) ہمارا شمار صالحین کے زمرے میں ہو۔ (۵/۸۴)۔ ظالمین کے زمرے میں نہ ہو۔ (۷/۴۷)۔

(۸) ہمارے اور ہمارے مخالفین کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے۔ (۷/۸۹)۔ [یہ حضرت شعیبؑ اور ان کے متبعین کی دعا تھی۔ انبیاءؑ اور ان کی جماعتیں، مخالفین کے ساتھ تصادمات میں اسی قسم کی دعائیں مانگا کرتی تھیں۔]

(۹) متبعینِ حضرت موسیٰؑ کی دعا کہ بار الٰہا! ہمیں ظالمین کا تختۂ مشق نہ بننا پڑے۔ (۱۰/۸۵)۔ یہی دُعا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھیوں کی تھی۔ (۶۰/۵)۔

(۱۰) عذابِ جہنم سے محفوظ رہنے کی دعائیں۔ (۲۵/۶۵)۔

(۱۱) بیوی بچے آنکھوں کی ٹھنڈک کا موجب بنیں (گھر کی زندگی سکون و اطمینان کی ہو) اور ہم متقین کے امام قرار پائیں۔ (۲۵/۷۴)۔

(۱۲) اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ رخصت ہو چکے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ایسا کر دے کہ ہمارے دلوں میں اپنے بھائیوں کے لئے کدورت نہ رہے۔ (۵۹/۱۰)۔

(۱۳) جنت میں مومنین کی دعائیں کہ ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ (۶۶/۸)۔

یہ ہوتا ہے انداز، مومنین کی دعاؤں کا۔ ان کی ساری دعائیں اجتماعی ہوتی ہیں، جن سے پورے معاشرہ، جماعت، نظام کی خیر سگالی کے جذبات چھلک چھلک کر باہر آتے ہیں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دعائیں اجتماعی ہی سہی، ان سے ہوتا کیا ہے؟ ان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

یہ سوال اہم ہے اور غور سے سمجھنے کے قابل، اس لئے کہ یہی وہ محور ہے، جس کے گرد دُعا کا سارا مسئلہ گردش کرتا ہے۔

دُعا سے ہوتا کیا ہے!

کوئی کام کرنا ہو، اس کے لئے سب سے پہلے، ہمارے دل میں آرزو بیدار ہوتی ہے۔ دنیا میں عمل کی بنیاد آرزُو ہے۔ جس قدر یہ آرزو شدید ہوگی، اس قدر ہمارا ارادہ مستحکم ہوگا اور جس قدر ارادہ مستحکم ہوگا اسی نسبت سے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں گے۔ علامہ اقبالؔ نے بچّوں کے لئے ایک نظم لکھی ہے جسے ہم ابتدائی مدرسے کے ہر طالب علم کی زبان سے ہر روز سنتے ہیں، یعنی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ

لب پہ آتی ہے، دُعا بن کے، تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مصرعۂ اوّل میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ (یوں تو) بچّوں کے لئے ہے لیکن اس میں جو حقیقت بیان ہوئی ہے وہ بڑی عمیق ہے۔ یعنی جب انسان کی دلی تمنا، حروف و الفاظ کی شکل میں زبان پر آتی ہے، تو اسے دعا کہا جاتا ہے۔ جتنی گہری تمنا، اتنی ہی مخلص دُعا۔ جتنی شدید آرزو، اتنی ہی پُرکیف پکار۔ نفسیات کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ آرزوؤں کی بیداری سے انسان کے اندر کس قسم کی

نفسیاتی تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے

نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پھر جس قسم کی وہ آرزو اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی۔ اس نفسیاتی تبدیلی سے انسان کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے، خارجی دنیا میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں؛

ایکہ منزل را نمی دانی ز رہ — قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

اور اگر آپ اس سے زیادہ حسین وجمیل (تغزّل کے) انداز میں بات سمجھنا چاہتے ہیں تو یوں سمجھئے کہ

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزم ہستی کو
کہ جو شے ہے نگاہوں میں حسیں معلوم ہوتی ہے

بلکہ یوں کہ

میں اب سمجھا کہ دنیا کچھ نہیں دنیا میرا دل ہے
بدل جانے سے اس کے رنگ ہر اک چیز کا بدلہ

جیسا کہ میں نے پیش لفظ میں کہا ہے، میں اس کتاب میں، مسئلہ تقدیر اور اس کے تضمنات پر، فلسفیانہ نقطہ نگاہ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا کہ اس سے بات عام فہم بھی نہیں رہیگی اور ہمارا سفر بھی بہت طول طویل ہو جائے گا، ورنہ (SUBJECTIVE IDEALISM) کا تو یہ کہنا ہے کہ خارجی کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں. اس کے احوال و کوائف، ہمارے دل ہی کے پرتو ہوتے ہیں. بیدلؔ کے الفاظ ہیں:۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو وسمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ ، دردل کشا بہ چمن درا

یعنی

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

بہرحال، یہ حقیقت ہے کہ انسان کی شدتِ آرزو سے اس کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے جو اس کا اندازِ نگاہ بدل دیتی ہے اور اس کی آرزو میں جس قدر ارتکاز پیدا ہوتا ہے، اس قدر اس میں توانائیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جو، عشق کی اک جست قصہ تمام کر دیتی ہے[1]، وہ شدتِ آرزو ہی کی پیدا کردہ توانائی کی رُو سے ہوتا ہے۔ اس باب میں جب ہم "زمانۂ جاہلیت" کے عربوں کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ تمدن و تہذیب سے اس قدر عاری اور فلسفہ و منطق سے اس قدر لابلد ہونے کے باوجود، ان کی نگاہ کس قدر بلند اور ان کی فکر کس قدر عمیق تھی۔ اور اس کے مظاہرہ کا ان کے ہاں ایک ہی ذریعہ تھا — یعنی ان کی زبان — لسانِ عربیٔ مبین — وہ (بادیہ نشین) جب اپنے مویشیوں کا دودھ دوہتے تو تھوڑا سا دودھ تھنوں میں باقی چھوڑ دیتے۔ یہ دودھ، اُس دودھ کے نیچے اتارنے کا موجب بن جاتا جسے جانور نے اوپر چڑھا لیا ہوتا۔ اس طرح چھوڑے ہوئے دودھ کو وہ اَلدَّ اعِیَۃُ کہتے

---

[1] عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (اقبالؒ)

اس سے دُعا کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی وہ کیفیت جو انسانی جذبات کو ابھارنے اور اس میں حرکت پیدا کرنے کا موجب بنے جس سے اس کی مضمر توانائیاں (چھپایا ہُوا دودھ)، مشہود ہو کر باہر نکل آئیں۔ شدتِ آرزو سے، جس کا دوسرا نام دعا ہے، یہ ہوتا ہے۔

آرزو کے سلسلہ میں دو باتیں بنیادی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ آرزُو ہے کس قسم کی۔ انسان کے دل میں مختلف آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن قرآن کریم نے، مومن کے سامنے "صحیح آرزو" کا جو معیار رکھا ہے وہ یہ ہے کہ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (۸۱/۲۹)۔ تم وہی چاہو جو خدا چاہتا ہے۔ تم اپنی آرزوؤں کو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھو۔ جس بات کو خدا بُرا سمجھتا ہے، تم بھی اسے برا سمجھو جسے وہ اچھا سمجھتا ہے تم بھی اسے اچھا سمجھو۔ تم ویسا بننے کی کوشش کرو جیسا خدا چاہتا ہے کہ تم بن جاؤ۔

اپنی آرزوؤں کو مشیت سے ہم آہنگ رکھو

قرآن کریم کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ — آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا — یہ تمہیں وہ کچھ بنا دیگا جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ تم ہو۔ واضح تر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز سے مقصود یہ ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جائے۔ اور اس بات کے پرکھنے کا، کہ میری ذات کس حد تک نشوونما پا چکی ہے، معیار یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے کس حد تک صفاتِ خداوندی کا انعکاس ہوتا ہے۔ خدا کی ایک صفات تو وہ ہیں جو اس کی ذات سے مختص ہیں۔ مثلاً هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ — دوسری صفات وہ ہیں جنہیں انسان (علیٰ حدِ بشریت) اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ مثلاً رحیم، کریم، رؤف، رازق، وغیرہ۔ ایک شخص کا کردار جس قدر صفاتِ خداوندی کا پرتو ہوگا۔ یعنی اس کی سیرت و عمل سے جس قدر ان اوصاف کا ظہور ہوگا جو صفاتِ خداوندی کے مماثل ہوں، اسی قدر سمجھا جائے گا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ لہٰذا، انسانی سیرت و عمل کے لئے نقطۂ اوّلیں یہ ہے کہ اس کے دل میں آرزوئیں ہی ایسی پیدا ہوں جو مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ چیز قرآنی اقدار کو سامنے رکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ بنا بریں، سب سے مقدم بات، انسان کی آرزوؤں کی تبدیلی ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو بڑے حسین انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ

تری دُعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دُعا ہے تری آرزُو بدل جائے

انسانی آرزوؤں کی یہ تبدیلی، وحی کی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ وحی کی راہ نمائی کے بغیر تو انسان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ یَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ (۱۷/۱۱)۔ "یہ، بجائے اس کے کہ ان امور کے لئے دعائیں کرے جو اس کے حق میں بہتر ہوں، ان چیزوں کی آرزو کرتا رہتا ہے جو اس کے لئے مضرت رساں ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔" ہم اس کی جلد بازیوں کا مشاہدہ قدم قدم پر کرتے رہتے ہیں — غیروں ہی کی نہیں، خود اپنی جلد بازیوں اور اس کے بعد خفّت اور ندامت کا مشاہدہ بھی۔ اس لئے، سب سے پہلا ضروری مرحلہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ جو آرزو ہمارے دل میں پیدا ہو رہی ہے وہ خدا کی متعیّن کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ ویسی نہ ہو، تو اسے تبدیل کر کے مستقل قدر سے ہم آہنگ کر لینا چاہیئے۔

ذکرِ خداوندی سے کیا مراد ہے

اگلا قدم یہ ہے کہ اس آرزو، اس مقصد، اس معیار کو ہر وقت سامنے رکھا جائے۔ قرآنِ کریم نے مومنین کا جو شعار بتایا ہے وہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (۳/۱۹۰)۔ جو، اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، قوانینِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی آرزو میں پختگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی پاکیزگی بھی ملوث نہیں ہونے پاتی۔ قرآنِ کریم نے، سورۂ حٰمٓ میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ وہ لوگ جو دل کے کامل یقین و اطمینان سے کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ، اللہ ہے اور پھر اس دعوے پر مستقل مزاجی سے قائم رہتے ہیں۔ اس میں ذرا سا بھی تزلزل نہیں آنے دیتے۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ...... اُن پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے جو ان سے کہتے ہیں کہ تم مت خوف کھاؤ۔ مت غمگین ہو اور اس جنّتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق اور مددگار ہیں اور مستقبل کی زندگی میں بھی — اس کے بعد ہے۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰-۳۱) اس میں جو تم چاہو گے وہ ہوگا۔ جو مانگو گے وہ ملے گا۔ اس میں تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی۔ ہر دُعا قبول ہوگی۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ۔ بہت بڑا وعدہ ہے — جو کچھ تم چاہو گے وہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ

ان تصریحات کے مطابق جو پہلے بیان کی جا چکی ہیں، مومن، چاہے گا ہی وہی جو مستقل اقدارِ خداوندی (مشیّتِ ایزدی) کے مطابق ہوگا، اس لئے وہ کسی غلط بات کو چاہے گا ہی نہیں اور وہ مانگے گا ہی وہی جس کے دینے کا خدا نے مومنین سے وعدہ کر رکھا ہے، یعنی ہر قسم کی خوشگواریاں، سرفرازیاں، رزقِ کریم، غلبہ و تسلّط، قوت و اقتدار، یعنی قرآنی معاشرہ کی تمام برکات۔ اس میں یہ کیفیت نہیں ہوگی کہ

بے نیازی کے ترے ناز اٹھائے کیا کیا   جو نہ چاہا وہ ہوا، اور جو چاہا نہ ہوا
مبدءِ فیض سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو   جو نہ مانگا وہ ملا، اور جو مانگا نہ ملا

یہ کچھ جہنمی معاشرہ میں ہوتا ہے، جنتی معاشرہ میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں مومن، جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے، جو مانگتا ہے وہ ملتا ہے۔ کیونکہ اس کی ہر مانگ اور طلب، مشیّتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مومنین کی دعائیں کیسی ہوتی ہیں اور وہ پوری کس طرح سے ہوتی ہے! یہ دعائیں اُس جماعت کی ہوتی ہیں جو دنیا میں خدا کے نظام کی تشکیل و استحکام کے لئے اُٹھے اور سفرِ حیات، وحیٔ خداوندی کی روشنی میں طے کرتی جائے۔ سینے میں مقدّس آرزوؤں کا ہجوم، دل میں حصولِ مقصد کی تڑپ، نگاہوں کے سامنے واضح نصب العین، بازوؤں میں قوّت اور قدموں میں استقامت۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کی ذات، (علیٰ حدِ بشریّت) صفاتِ خداوندی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مومن کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اس کے خیالات، ارادے، مقاصد، مطامح، زوایائے نگاہ اور منتہائے نظر، سب مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ اسی حقیقت کو میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں ان الفاظ کے پیرہن میں پیش کیا تھا۔

> دعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمۂ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا، عروسِ حقیقت کے حسنِ جہاں آرا و جاں نواز کی دل کش رعنائیوں سے یک رنگی کی مچلتی ہوئی آرزو، چکور کے سینے میں چاند کو اپنے اندر سمو لینے کی کہکشاں گیر و فلک پیما، والہانہ امنگ، قلبِ پروانہ میں شمعِ فروزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز و رقص آفریں جوش و خروش، یعنی انسانی خودی کا اپنی متناہیت کو لامتناہیت (حیاتِ جاوداں) میں بدل لینے کا بیتابانہ ولولہ اور اسی ولولہ کی تسکین کے لئے قطرۂ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوئے شاہیں کی طلب۔ بغور دیکھئے تو ایمان، دعا اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور

ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس حقیقت کے اعتراف، کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظامِ عالم کے مرکزِ خیر و خوبی سے ہم آہنگی میں پوشیدہ ہے۔ دعا، اس ہم آہنگی و یکرنگی کی شدید تڑپ ہے اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور اس کے حصول کے لئے کوشش پیہم۔

یہی ہیں مومنین کی وہ دعائیں جو مستجاب ہوتی ہیں۔ انہی کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ ___ وہ نظام، جس میں کسی کو اپنی انفرادی ضرورت اور حاجت کے لئے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں نہیں کرنی پڑتیں۔ یہ نظام "ان کی دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دیتا ہے"۔ وہ اس کا انتظام کرتا ہے کہ ہر صاحبِ احتیاج کی دُعا (مانگ)، بابِ خداوندی سے ٹکرانے سے پہلے ہی پوری ہو جائے۔

باقی رہی ملائکہ کی تائید، سو اس کے لئے قرآنِ کریم نے واضح کر دیا ہے کہ لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ (۸/۱۰) اس سے انسان کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے جس سے اس کے قلب کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۸/۱۱)۔ اور اس سکونِ قلب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے قدموں میں ثبات و استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے جو کچھ دُعا سے ہوتا ہے، یعنی اس سے انسان کے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کس قدر قابلِ صد رشک ہے وہ انداز جس میں اقبالؒ نے، اتنی بڑی رفیع و منیع اور عمیق و دقیق حقیقت کو، دو مصرعوں میں واشگاف کر دیا ہے کہ جس سے بلیغ اور دلکش انداز، تصور میں نہیں آسکتا۔ آپ بھی سنیئے اور رقص کیجئے۔ کہا ہے کہ

> تیری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
> مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس باب میں حرفِ آخر ہے۔ (قضا سے یہاں مُراد قانونِ خداوندی ہے)۔

ایک دوسرے کیلئے دُعائیں کرنا

باقی رہا ہمارا ایک دوسرے کے لئے دُعا کرنا، تو یہ درحقیقت ان کے حق میں ہماری نیک آرزوؤں کا اظہار ہوتا ہے جس سے انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔ معاملات کی دنیا میں، اسے اخلاقی تائید (MORAL SUPPORT) کہا جاتا ہے۔ اس سے خود اس شخص کے اندر ایک قسم کی نفسیاتی قوت بیدار ہو جاتی ہے جس کے اثرات نہایت خوشگوار ہوتے ہیں جس

محبوبِ جاں نواز کے دیکھنے سے (غالب کے الفاظ میں) مریض کے منہ پر رونق آجاتی ہے، اس سے چار کلماتِ تسلّی یا دو الفاظِ تحسین سننے سے جو قلبی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی حیثیت، مُردہ کے لئے دعائے خیر کی ہے۔ اس سے مُردہ پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، اس کے پسماندگان کے غم واندوہ میں کمی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرتی روابط کا بھی فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس نہیں کرتا اور سخت سے سخت جانکاہ مصیبت میں بھی اس کا حوصلہ قائم رہتا ہے۔ اسی لئے حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا تھا کہ یہ لوگ جب اپنے عطیات تیرے پاس لائیں تو انہیں قبول کرنے کے بعد صَلِّ عَلَیۡہِمۡ انہیں شاباش دیا کر۔ ان کے اس عمل کو (APPRECIATE) کیا کر۔ انہیں دعا دیا کر۔ اس لئے کہ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّہُمۡ (۹/۱۰۳)۔ تیری دُعا ان کے لئے بڑی موجبِ تسکین ہوتی ہے۔

انبیائے کرامؑ کی انفرادی دعائیں

قرآن کریم میں حضرات انبیائے کرامؑ کی بعض انفرادی دعاؤں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثلاً حضرت ایوبؑ نے اپنی انتہائی تکلیف میں خدا کو پکارا اور خدا نے ان کی مصیبت کو رفع کر دیا۔ (۲۱/۸۴-۸۳)۔ حضرت یونسؑ نے اپنے غم والم کی اندوہناکیوں میں خدا کو پکارا اور انہیں مصیبت سے نجات مل گئی (۲۱/۸۸-۸۷)۔ سو اول تو قرآنِ کریم نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی کہ ان کے مصائب و آلام دُور کرنے کے لئے کس قسم کے اسباب پیدا کئے گئے تھے۔ دوسرے (اور یہ بات بنیادی ہے) کہ نبوت ایک ایسا مقام ہے[1] جس کی کنہ و ماہیت کا سمجھنا کسی غیر از نبی کے لئے ممکن نہیں۔ ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا اور نبی کا باہمی تعلق کس قسم کا ہوتا تھا۔ خدا نبی سے کس طرح ہمکلام ہوتا تھا۔ نبی خدا سے کس طرح باتیں کرتا تھا۔ لہٰذا، جس حقیقت کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے، اس کے متعلق بحث و گفتگو سے کیا حاصل! ویسے بھی، ختمِ نبوت کے بعد، اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ خدا اور نبی کے اس باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ ختمِ نبوت کے بعد، خدا اور انسانوں کا تعلق، خدا کی اس وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ، خدا سے کسی کے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا نہ امکان ہے، نہ کوئی ذریعہ۔ جو اس کا دعوےٰ کرتا ہے، وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے خواہ اس

---

[1] اب "مقام تھا" کہنا چاہیئے کیونکہ نبوت، حضور رسالت مآبؐ پر ختم ہو چکی ہے۔

کے لئے الفاظ یا اصطلاحات کچھ ہی کیوں نہ استعمال کی جائیں۔ چونکہ اب نبوّت کا دعویٰ باطل ہے اس لئے خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا دعویٰ بھی غلط ہے۔ کشف، الہام وغیرہ قسم کے تصوّرات سب غیر قرآنی ہیں اور دوسروں کے ہاں سے مستعار لئے ہوئے۔ قرآنِ کریم میں تو یہ الفاظ تک بھی نہیں آئے۔

حضور نبئ اکرمؐ کی جو انفرادی دُعا قرآنِ کریم میں آئی ہے، وہ ہر انسان کے لئے، قیامت تک، حُسنِ آرزو کا بلند ترین نمونہ ہے۔ آپؐ سے کہا گیا کہ قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰/۱۱۴) "کہو! اے میرے نشوونما دینے والے، مجھے علم فراواں عطا فرما۔" اے کاش، حضورؐ کے نام لیوا اپنے سینوں کو اس ایک آرزو کا گہوارہ بنا لیتے تو آج ان کا مقام کیا ہوتا!

دُعا رحمت ہے اور رحمت سے مایوسی کفر ہے

کہا یہ جاتا ہے کہ دُعا اور اس کی قبولیت پر عقیدہ نہ رکھنے سے انسان، خدا کی رحمت سے مایوس ہو جاتا ہے اور خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ ایسا کہنے والوں کو یہ معلوم نہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے رحمت کہتے کسے ہیں اور اس سے مایوس کون ہوتا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے توبہ کے مفہوم کو، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک بار پھر سامنے لائیے۔

یہودیوں کی آتشیں شریعت میں توبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر کسی سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو اسے اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑتی۔ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہی کیفیت ہندوؤں کے "کرم یوگ" کے عقیدہ کی رُو سے تھی۔ جس شخص نے اپنے پچھلے جنم میں بُرے کام کئے تھے، اسے، اپنے موجودہ جنم میں ان کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ موجودہ جنم میں اس سے محفوظ رہ سکنے کی کوئی شکل نہیں تھی۔ اگر وہ اچھے کام کرتا تھا تو ان کا پھل اگلے جنم میں جا کر ملتا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولیں ماں باپ (آدم اور حوا) کے گناہ کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے دنیا میں آتا ہے اور وہ کچھ بھی کر لے، اسے اس آلائش سے نجات نہیں مل سکتی۔ جب خدا نے دیکھا کہ اس طرح تو تمام انسان جہنّم میں چلے جائیں گے تو اسے اپنی مخلوق پر رحم آیا۔ چنانچہ اس نے اپنا "اکلوتا بیٹا" دنیا میں بھیجا جس نے صلیب پر جان دے کر نوعِ انسان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کر دیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے کفّارہ پر ایمان لے آئیں ان کی نجات ہو جائے گی۔ یہ وجہ ہے جو ان کا

عقیدہ یہ ہے کہ نجات، اعمال سے نہیں ہوتی، ایمان سے ہوتی ہے۔ ان کے ہاں جو کہا جاتا ہے کہ خدا رحم ہے (GOD IS MERCY) تو اس سے یہی مراد ہے۔

دنیا اسی افراط و تفریط کی آماجگاہ بن رہی تھی ــــ یعنی جہاں عدل تھا وہاں رحم نہیں تھا اور جہاں رحم تھا وہاں عدل کا تصور نہیں تھا ــــ کہ قرآن آیا اور اس نے آکر کہا کہ یہ دونوں عقائد غلط ہیں۔ خدا کے

رحمت کا صحیح مفہوم

قانونِ مکافات میں عدل اور رحم دونوں موجود ہیں لیکن اس میں رحم کا وہ تصور نہیں جو عیسائیوں کے ہاں ہے۔ اس کے رحم کا مفہوم اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا کہ ایک شخص آگ میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اس کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس سے اسے الم انگیز عذاب (درد) ہوتا ہے۔ یہ عدل ہے لیکن جس خدا نے آگ میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ ہاتھ کو جلا دے اسی خدا نے ایسی چیزیں بھی پیدا کر دی ہیں جن سے آگ سے جلے ہوئے کا علاج ہو جائے۔ اس قسم کی چیزوں کا پیدا کر دینا، خدا کی رحمت کہلاتا ہے۔ لیکن ان چیزوں سے فائدہ وہی اٹھا سکتا ہے جو آگ سے جلنے کے بعد، ان چیزوں کی طرف رجوع کرے۔ قرآن کی اصطلاح میں اُسے توبہ کہتے ہیں۔ یعنی غلط قدم اٹھانے سے جو نقصان ہو گیا ہے اس کی تلافی کے لئے جدوجہد۔ خدا کی رحمت سے مایوس وہ ہے جو تلافیٔ مافات کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ جو اپنی لغزش کے بعد اس کی اصلاح نہیں کرتا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ (آدم کے تمثیلی قصہ کی رُو سے) آدم سے بھی لغزش ہوئی اور ابلیس سے بھی۔ جب آدم کو اس کا احساس ہوا تو اسے اپنے کئے پر سخت ندامت ہوئی اور وہ تلافیٔ مافات کے لئے تیار ہو گیا۔ اس نے خدا کی رحمت سے فائدہ اُٹھا لیا۔ ابلیس نے اعترافِ جرم سے انکار کر دیا اور اپنی سرکشی پر بضد قائم رہا۔ وہ رحمتِ خداوندی سے محروم ہو گیا۔

یہ ہے رحمت کا قرآنی مفہوم ــــ یعنی قانونِ مکافات میں باز آفرینی کی گنجائش ــــ دیکھئے قرآنِ کریم اس مفہوم کو کس وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ سورۂ زمر میں ہے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اے رسول! میرے ان بندوں سے جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، کہہ دو کہ وہ خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ خدا نے ہر لغزش کے نقصان سے محفوظ رہنے کا سامان پیدا کر رکھا ہے۔ وہ سامانِ حفاظت عطا کرنے والا اور یوں رحم کرنے والا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ

اَوْ تُنْصَرُوْنَ ۝ (۵۳ - ۳۹/۵۵)۔ اگر تمہارا قدم غلط سمت کی طرف اُٹھ گیا ہے تو وہاں سے لوٹ کر پھر خدا کے تجویز کردہ راستے کی طرف آجاؤ یعنی اس کے احکام و قوانین کے سامنے جُھک جاؤ، قبل اس کے کہ تمہاری لغزش کے نتائج محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ اس صورت میں تمہیں نقصان سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

دوسرے مقام پر اس اصول کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ

اے رسولؐ! جب وہ لوگ جو ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں، تمہارے پاس آئیں تو ان سے کہدو کہ تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے۔

وہ **رحمت** کیا ہے؟

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۶/۵۴)۔

وہ رحمت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص نادانستہ کوئی لغزش کر بیٹھے اور اس کے بعد وہ اس سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کرلے، تو وہ خدا کو غفور اور رحیم پائے گا۔

یہ ہے خدا کی رحمت سے مقصود۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک دفعہ توبہ کر کے پھر جو جی میں آئے کرتا رہے، اس سے باز پُرس نہ ہوگی۔ کہا کہ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ۔ اس طرح خدا تمہیں اپنی رحمت سے نوازے گا۔ وَ اِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا م (۱۷/۸)۔ لیکن اگر تم پھر اپنی غلط روش کی طرف پلٹ گئے تو ہمارا عذاب بھی پلٹ کر تمہاری طرف آجائے گا۔

ظاہر ہے کہ اپنی لغزش سے توبہ وہی کرے گا جسے خدا کے قانونِ مکافات پر یقین ہو۔ جو اس بات پر ایمان ہی نہیں رکھتا کہ غلط روش کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے، وہ اپنی اصلاح کیا کرے گا۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے متعلق کہا گیا کہ وہ رحمتِ خداوندی سے نااُمید ہوتے ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ... (۲۹/۲۳)

جو لوگ قوانینِ خداوندی اور مکافاتِ عمل سے انکار کرتے ہیں، وہ خدا کی رحمت سے نااُمید ہوتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ (۱۵/۵۶)۔ خدا کی رحمت سے

نااُمید وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی کیفیت یہ ہو کہ وہ اگر غلط راستے پر چلے جارہے ہیں تو انہیں لاکھ سمجھاؤ وہ اسی ڈگر پر چلے جائیں گے، صحیح راستے کی طرف کبھی نہیں آئیں گے۔

اس کے برعکس، یہ بھی دیکھ لیجئے کہ رحمتِ خداوندی کے اُمیدوار کون لوگ ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۲/۲۱۸)۔

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا، تو یہ لوگ ہیں جو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ انہی کے لئے خدا کی صفتِ غفور الرّحیمی ظہور میں آئیگی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو رحمتِ خداوندی کے مستحق قرار پاتے ہیں، نہ وہ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا بیٹھے رہیں، یا زیادہ سے زیادہ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ، کی تسبیح پڑھتے رہیں، دیکھئے قرآنِ مجید اس باب میں کیا کہتا ہے۔

جماعتِ مومنین میں سے بھی وہ لوگ جو سہل انگار ہوں ــــ بجز ان کے جو معذور ہوں ــــ اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کریں، کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ خدا نے، جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو ان لوگوں پر بہ اعتبارِ مدارج فضیلت دی ہے جو سہل انگاری سے بیٹھے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نظام کی برکات سے سب مستفید ہوتے ہیں لیکن قاعدین کے مقابلہ میں مجاہدین کے مدارج یقیناً بہت بلند ہیں۔ مدارج بلند اور مغفرت و رحمت۔ یقیناً خدا غفور الرحیم ہے۔

(۴/۱۹۵- ۱۹۶)

اور آخر میں، سورۂ اعراف کی ان آیات کو سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے دُعا کی کہ وہ بنی اسرائیل کو اپنی رحمت سے نوازے، تو اس کے جواب میں کہا گیا کہ اس میں شبہ نہیں کہ رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ۔ ہماری رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے لیکن انسانوں میں سے تو وہ انہی کے حصے میں آسکتی ہے جو تقویٰ شعار ہوں (قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کریں)، ایتائے زکوٰۃ کریں (یعنی نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائیں) اور ہمارے قوانین کی صداقت پر ایمان لائیں اور آخری زمانہ میں اس نبی اُمّی کا اتّباع کریں جس کے تذکار علیہ وہ تورات اور انجیل میں موجود پائیں گے۔ وہ معروف کا حکم دے گا، منکر سے روکے گا، طیّبات ان کے لئے حلال قرار دے گا، خبائث کو حرام ٹھہرائیگا اور ان کی گردنوں سے ہر قسم کی غیر خداوندی غلامی کے طوق اتار دے گا جن میں وہ جکڑے ہوں اور ان کے سروں سے ان بوجھل سلوں

کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ تلے وہ دب رہے ہوں ــــ خدا کی وہ رحمت جو سحابِ کرم کی طرح کائنات کی پہنائیوں کو محیط ہے، اسی صورت میں مل سکے گی۔ اس کے سوا، اس سے بہرہ یاب ہونے کی کوئی شکل نہیں۔

(۱۵۶ ــ ۴/۱۵۷)

یہی ہیں وہ لوگ جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور یہی ہیں جن پر رحمتِ خداوندی کا ابرِکرم سایہ فگن ہوتا ہے۔ دعا، زندگی کے دوراہے پر، قانونِ خداوندی کو آواز دینے کا نام ہے، جس کا جواب، کتابِ خداوندی کی بارگاہ سے ہر اس شخص کو مل سکتا ہے، جو اسے علم وبصیرت کی رُو سے سمجھنے اور تطہیرِ فکر ونظر سے اسے دل کی گہرائیوں میں پیوست کرنے کی کوشش کرے۔ اس سے اس کی داخلی دنیا میں وہ تغیّر واقع ہو جاتا ہے جس پر خارجی دنیا کے انقلابات کا دارومدار ہے ــ اس تغیّر سے "انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے" کہ

تو اگر دیگر شوی، اُو دیگر است

خدا کا محکم قانون ہے اور اس کی رحمت۔ اسی لئے اس نے اپنی کتاب کو بھی رحمت کہا ہے اور اس کے لانے والے کو بھی رحمت۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں ــ حاملِ اُو رحمتہ للعالمینؐ

اٹھارواں باب

نگہِ بازگشت

عمل سے فارغ ہؤا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے بہتر ہے کہ اس پر ایک نگہِ بازگشت ڈال لی جائے تاکہ اس اہم اور نازک ترین مسئلہ کے تمام گوشے از سرِ نو نکھر کر سامنے آجائیں اور قرآنی حقائق اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو زمین و آسمان، دریا اور پہاڑ، شجر و حجر، آگ اور پانی، غرضیکہ جمادات و نباتات میں سے ہر شے کے لئے وہ راستہ پہلے سے مقدر ومتعین کر دیا جس پر اسے چلنا تھا۔ اس کے بعد زندگی کا آغاز ہؤا اور وہ (قرآنی تصریحات کے مطابق) مختلف وادیوں میں سے گزرتی، اپنی ارتقائی منازل طے کرتی، پیکرِ حیوانیت تک پہنچی۔ سلسلۂ تخلیق کی اس کڑی میں بھی، ہر شے کے سامنے ایک ہی

جمادات، نباتات وحیوانات

راستہ تھا جس پر اس نے طوعاً وکرہاً چلنا تھا۔ بالفاظِ دیگر، مخلوقات کی اس منزل تک، کسی کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ اپنے لئے کسی راستے کا خود انتخاب کرلے۔ جب راستہ ہی ایک تھا تو انتخاب و اختیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن جب اس سے آگے بڑھے تو زندگی نے ایک نئی کروٹ بدلی اور وہ ایسے پیکر میں نمودار ہوئی

پیکرِ انسانی

جسے قرآنِ کریم نے "خلقِ آخر" ـــ ایک نئی قسم کی مخلوق کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تھا پیکرِ انسانیت۔ سورۂ مومنون میں ہے۔

ہم نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ پھر ہمارا یہ تخلیقی پروگرام رفتہ رفتہ

اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے۔ اس طرح ہم نے اسے نطفہ بنایا جو رحم کے اندر ٹھہر گیا اور مادہ کے مبیضہ میں قرار گیر ہوگیا۔

پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل) میں تبدیل کیا۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنایا۔

پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔

یہاں تک تخلیقی پروگرام میں حیوانات بھی برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر حیوانی بچہ، رحم مادر میں، انہی مراحل میں سے گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴-۱۲)

پھر ہم نے اسے ایک اور ہی قسم کی مخلوق بنا دیا۔

یہ اور قسم کی مخلوق کیا تھی؟ اس میں اور حیوانات میں کیا فرق تھا۔ وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر یہ مخلوق، تخلیقی پروگرام کی سابقہ کڑیوں سے متمیّز و ممتاز ہوگئی؟ اس سلسلہ میں کہا کہ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ۔ خدا نے اس میں اپنی "روح" پھونک دی۔ عربی زبان میں رُوْح، توانائی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس خصوصیت کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے اس میں الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY) کا شمہ ڈال دیا۔ اس سے کیا ہوا؟ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْئِدَةَ (۳۲/۹) اسے سماعت و بصارت (حواس SENSES) عطا کی اور قلب (MIND) جس سے یہ، اس قابل ہوگیا کہ حواس (PERCEPTION) کے ذریعے جو معلومات قلب تک پہنچیں، اس سے یہ استنباطِ نتائج کرکے کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔

یہ نیا طریقِ کار جس مقصد کے لئے اختیار کیا گیا، اس کی وضاحت، سورۃ الدھر میں، ان الفاظ میں کر دی کہ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ٥ (۷۶/۳-۲)۔ اسے سماعت و بصارت عطا کی۔ پھر اسے راستہ دکھا دیا اور اس سے کہہ دیا کہ جس کا جی چاہے اسے اختیار کرلے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ دوسری جگہ ہے وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۹۰/۱۰)۔ ہم نے اس کے سامنے دونوں راستے رکھ دیئے اور اسے کہہ دیا کہ ان میں سے جونسا جی چاہے اختیار کرلے۔ اس سے پہلی مخلوق کے لئے صرف ایک راستہ متعین کیا گیا تھا اس لئے ان کے لئے اختیار اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انسان کے سامنے دو راستے (TWO POSSIBILITIES) رکھ

دیئے۔ بالفاظِ دیگر، انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا۔ یہ تھی وہ خصوصیتِ کبریٰ جو اس سے پہلے کسی مخلوق کو حاصل نہیں تھی۔ اسے صرف انسان کو ودیعت کیا گیا۔ کائنات میں صاحبِ اختیار و ارادہ صرف خدا کی ذات تھی۔ اب خدا نے اپنی اس خصوصیتِ عظمیٰ کا ایک حصہ انسان کو بھی عطا کر دیا۔ اُسے "نفخِ رُوح" سے تعبیر کیا گیا ہے ـــ یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہے جس سے نبضِ کائنات میں تموّج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا، پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ، اور درندوں چرندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (Zoo) ہوتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخِ روح" کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و تعطّر کا کاشانہ بن گیا۔

اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں

آپ آدم کی تمثیلی داستان میں دیکھئے۔ آدم کا اوّلین تعارف اس سے کرایا گیا ہے کہ اس میں سجدہ ریزی اور سرکشی، دونوں قوّتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ یہی (اختیار و ارادہ کی) قوّت اس کی سرفرازی و سربلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ خلائق ہے۔ کش مکشِ حیات میں پُرکیف جاذبیّتیں ہیں تو اسی سے۔ درکشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیفِ رنگ و تعطّر کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموّج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں، تو اسی کے تحرّک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہے تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بُت ہوتا یا اشیائے کائنات میں سے کوئی ایک شے۔ مسجودِ ملائک و مسخرِ کائنات کبھی نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیازمندی اس کی قابلِ ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذّت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوّت نہیں، اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمّت نہیں اس کا جُھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں تلے تختِ حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ پر کنٹرول رکھنا، یہی شرفِ انسانیت ہے۔ اسی سے استحکامِ خودی پیدا ہوتا ہے[1] اور جس کی خودی میں استحکام ہو، وہی نفسِ

([1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کہہ سکتا ہے کہ

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

اختیار و ارادہ کی انہی بے پناہ قوتوں کا حامل انسان تھا جس کے متعلق کہا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)۔ ارض و سماوات میں جو کچھ ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے ـــــ اس سَخَّرَ لَكُمْ کی تفسیر، اپنے پیش رووں کی نسبت، ہم زیادہ آسانی اور وضاحت سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں جس وقت یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں، ریڈیو سے یہ خبر سُن رہا ہوں کہ امریکہ کا خلانورد جہاز "اپالو ۱۴" اپنے خلانوردوں سمیت بخیر و خوبی، کامیاب و کامران، واپس آ گیا ہے[1]۔ اس تسخیر کا راز کیا ہے؟

کائنات مسخر کر دی گئی

صرف یہ کہ کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے تابع سرگرمِ عمل ہے اور انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کو دریافت کر سکے۔ سائنس کی اصطلاح میں ان قوانین کو، قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے لیکن قرآن کی اصطلاح میں انہیں مشیتِ خداوندی کہہ کر پکارا جائیگا اور ان اشیاء کا، ان قوانین کے تابع چلنا، ان کی تقدیر کہلائے گا۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے، اس کی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک طبیعی زندگی، جس میں انسان اور حیوان مشترک ہیں۔ لیکن اس کی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے، جسے "انسانی زندگی" کہہ لیجئے۔ اس زندگی کے لئے ایک اور ضابطۂ قوانین ہے جسے مستقل اقدار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ضابطۂ قوانین وحی کے ذریعے عطا ہوتا ہے اور اب قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ اگر انسان، فطرت کی قوتوں کو، جو اس کیلئے مسخر کر دی گئی ہیں مستقل اقدار کے تابع رکھے تو اس سے اس کی انسانی زندگی نشوونما پاتی ہے۔ اسی کو اس کی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔

محض فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینا، مقامِ آدم (آدمی کا مقام) ہے۔ لیکن ان قوتوں کو مستقل اقدارِ خداوندی

(صفحہ ۳۹۳ کا فٹ نوٹ) اس موضوع کی اہمیت تھی کہ میری کتاب "ابلیس و آدم" کا یہ ورق میرے سامنے کھل گیا اور میں نے اس میں سے یہ الفاظ اس جگہ درج کر دیئے۔ اس کی مزید تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ اس میں انسان کی پیدائش، آدم، ابلیس، وغیرہ کے متعلق وضاحت سے لکھا گیا ہے۔

[1] ۱۰ فروری ۱۹۷۱ء۔ صبح۔

مقامِ مومن کے تابع رکھنا، مقامِ مومن ہے۔ بالفاظِ دیگر، عام انسان، اپنے اختیار و ارادہ کو اپنے مقاصد اور خواہشات کے تابع رکھتا ہے اور مومن اس کا استعمال وحیٔ خداوندی کی روشنی میں کرتا ہے۔ اس سے اس کی مضمر صلاحیتیں اس انداز سے مشہود ہو جاتی ہیں کہ دوسرے انسان اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ جماعت تھی جسے قرآن نے اَعْلَوْن کہہ کر پکارا تھا (۳/۱۳۸) یعنی سب سے بلند۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ اُو بر نتابد ہمسرے

اعلوٰن ہونے کا یہی وہ جذبہ تھا جس سے سرشار ہو کر، صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین نے، چند دنوں میں قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیئے اور دنیا کے ہر نظامِ باطل کی بساط لپیٹ کر رکھ دی ــــ اور یہی چیز مستبد مفاد پرستوں کی نگاہوں میں کھٹک گئی اور انہوں نے، اس جماعت سے، اپنی شکست و ناکامی کا بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ وہ بادنیٰ تدبر اس نتیجہ پر پہنچ گئے (اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت تھی جسے سمجھنے کے لئے کسی ارسطو کے دماغ کی ضرورت نہیں تھی) کہ یہ قرآن کی تعلیم کا اثر ہے جس نے ان کی رگوں میں حرکت و حرارت کی بے پناہ بجلیاں بھر دی ہیں اور ان پر یہ راز افشا کر دیا ہے کہ انسان اپنی تقدیر اپنے ہاتھوں سے لکھتا اور اپنا مستقبل اپنی قوتِ بازو سے تعمیر کرتا ہے۔ لہٰذا، انہوں نے محسوس کر لیا کہ جب تک انہیں اس عقیدہ سے بیگانہ نہیں بنا دیا جائے گا ان سے انتقام نہیں لیا جا سکے گا۔ اس زمانے میں مجوس کا

جماعتِ مومنین سے انتقام یہ عقیدہ کہ انسان کا مقدر، پہلے سے متعین ہوتا ہے جسے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں ہوتا، ہر مذہب اور ہر قوم میں عام تھا ـــــ قرآن اس زندگی کُش اور انسانیت سوز عقیدہ کے خلاف چیلنج تھا ـــــ لہٰذا، انہوں نے، ایک سوچی سمجھی سازش کے ماتحت، غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر، مسلمانوں میں اس عقیدہ کو پھیلانا شروع کیا۔ پہلے انہیں جبر و قدر کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی نکات آفرینیوں کی پیچیدگیوں میں اُلجھایا اور اس کے بعد وضعی روایات سے، عقیدۂ جبر کو مذہبی تقدس کا دلفریب لباس پہنا دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب قرآنِ مجید کی سب سے پہلی تفسیر (تفسیرِ طبری) لکھی گئی اور صدرِ اوّل کی سب سے پہلی تاریخ (تاریخِ طبری) مرتب ہوئی۔ ان دونوں (تفسیر و تاریخ) کا مدار زبانی روایات پر تھا جنہیں ذاتِ رسالتمآبؐ یا صحابۂ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیا جاتا تھا۔ روایات

کے یہ مجموعے بھی اسی زمانہ میں مرتب کئے گئے تھے۔ اس طرح، رفتہ رفتہ، اس عقیدہ (جبر) کو مذہبی سند بھی حاصل ہو گئی، حتیٰ کہ اسے جزوِ ایمان تک بنا دیا گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے یہ خیال عام ہوتا چلا گیا کہ حکومت اور نکبت، عزت و ذلت، امیری اور غریبی، مسرت اور مصیبت، کامیابی اور ناکامی، سب، خدا کے ہاتھ میں ہے۔

عقیدۂ تقدیر عام کر دیا گیا

ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے، انسان کی فکر و تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا۔ خدا کے حکم کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا۔ اس لئے انسان کو چاہیئے کہ خدا اسے جس حال میں رکھے مطمئن رہے۔ راضی برضا رہنا، مومن کا شعار ہے، جو شخص تمہیں ظالم اور مستبد نظر آتا ہے، وہ مشیتِ خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ اور آلہ ہے اس لئے اس کے خلاف تمہارے دل میں مخالفت یا منافرت کا کوئی جذبہ بیدار نہیں ہونا چاہیئے۔ تیر، جو کسی کا کلیجہ چھلنی کر دے، موردِ الزام نہیں ہوتا، اس کا ذمہ دار وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں کمان ہو۔ اس لئے مظلوموں اور ناداروں کو ہر قسم کا ظلم و استحصال بخوشی برداشت کئے جانا چاہیئے، کہ یہ مرضیٔ مولا ہے۔ اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان تک لانا، خدا کی شان میں گستاخی ہے۔

یہ ہمارا دورِ ملوکیت تھا اور ظاہر ہے کہ مطلق العنان حکمرانوں کو اس قسم کے عقائد بڑے راس آتے ہیں۔ ان سے وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے جائیں، مظلوموں اور ستم زدوں کے دل میں ان کے جور و استبداد کے خلاف احساسِ شکایت تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر، یہ بھی حقیقت ہے کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کوئی فرعون، ہامان کے بغیر اپنی فرعونیت کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے، ان عقائد کو مذہبی تائید حاصل ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اپنی مشہور نظم ـــ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ـــ میں، ابلیس کو فخریہ کہتے ہوئے دکھایا ہے کہ

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا

ان سندوں کو اور زیادہ تقدس کا لبادہ اوڑھانے کے لئے، مسلمانوں میں تصوف جیسا ہلاکت آفریں مسلک

تصوف کی تباہ کاریاں

رائج کر دیا گیا (واضح رہے کہ تصوف کا لفظ نہ قرآن میں ہے اور نہ ہی ہمارے دورِ اوّل میں اس کا کہیں پتہ نشان ملتا ہے۔ یہ بھی ہمارے دورِ ملوکیت کا اضافہ ہے) اس مسلک کی رُو سے، محکوموں اور مظلوموں کو اتنی سی افیون ہی نہیں پلائی گئی کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے خدا

کی مرضی سے ہو رہا ہے، اس میں ان مستبد حکمرانوں کا کوئی قصور نہیں، بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ (معاذ اللہ)

فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے انا ربکم الاعلیٰ، کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی)

حافظ نے اتنا بیباک ہونے کی جرأت نہ کی اور صرف یہ کہدینے پر اکتفا کیا کہ

گناہ گرچہ نبود از خطائے ما حافظ

تو در طریقِ ادب کوش و گو گناہِ من است

علامہ اقبال نے مرشد رومی سے کہا کہ تقدیر کا عقیدہ بڑا لاینحل ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ نہیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ

بال، بازاں را سوئے شاہاں بُرد

بال زاغاں را بہ گورستاں بُرد

اُڑنے کی صلاحیت عقاب و شاہین کو بھی حاصل ہوتی ہے اور چیل کوے کو بھی۔ عقاب، اپنی اندرونی فطرت کے بل پر بادشاہوں کے ہاں سرفرازی حاصل کر لیتا ہے اور چیل اور کوے، اپنی خلقی جبلت کی بنا پر، لاشوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مولانا رومؔ نے مشاہدہ پرندوں کا کیا جنہیں خالقِ فطرت نے مجبور پیدا کیا ہے اور اپنے اس مشاہدہ کا نتیجہ انسان پر منطبق کر دیا جسے خدا نے بال و پر دے کر یہ کہہ دیا ہے کہ تم ان کا استعمال جس طرح جی چاہے کرو۔ یوں، تصوف نے عقیدہ جبر کو مسلمانوں کے خون کے ذرات تک میں حلول کر کے رکھ دیا۔ تصوف کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد و تصورات کو محسوس تشبیہات اور تمثیلات کے ذریعے پیش کرتا ہے اور انہیں بطورِ اصول منوا لیتا ہے۔ یہ تشبیہات اور تمثیلات بڑی جاذب اور دلکش ہوتی ہیں — یہ دراصل "شاعری" ہوتی ہے۔ اسی لئے صاحبؔ نے کہا تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است — یہ تشبیہات انسان کے دل و دماغ سے چپک جاتی ہیں اور وہ انہیں محکم اصول خیال کر کے، ان معتقدات کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اربابِ تصوف انہیں کبھی دلائل و براہین کی رُو سے پرکھنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ان کے نزدیک فکری دلائل یکسر ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں — عقل و فکر کے تو وہ جانی دشمن ہوتے ہیں، بلکہ علم و بصیرت کے بھی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مسلکِ خانقاہیت نے، قناعت، توکّل، صبر، شکر، راضی برضا، وغیرہ کے غیر قرآنی مفاہیم سے، اس قوم کے اعصاب پر اس طرح موت طاری کر دی کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ یہی وہ مرگ آفریں عقائد ہیں جو ہمیں صدیوں سے متوارث چلے آرہے ہیں اور جنہیں ہر محراب و منبر سے مسلسل و متواتر دہرایا جاتا اور ہر زاویہ و خانقاہ میں، دلوں کی گہرائیوں میں اتارا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہی قوم، جس کی نگاہوں سے کبھی دنیا کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، آج خود، ہر وقت اپنی تقدیر کا رونا روتی رہتی ہے۔ وہ جسکی پیشانی کے تیوروں سے قوموں کی بساطِ زندگی اُلٹ جایا کرتی تھی، آج اپنی "پیشانی کے لکھے" کے ہاتھوں مجبور و مقہور، سر بزانو بیٹھی ہے۔ وہ جس کے متعلق کہا تھا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستاروں کو تمہارے لئے مسخّر کر دیا گیا ہے، اس کی حالت یہ ہے کہ، دنیا کے "کافر و ملحد" تو چاند اور سورج پر کمندیں پھینک رہے ہیں اور یہ "خدا پرست" اپنی تقدیر کو ستاروں کے تابع سمجھ کر، منجموں سے فالیں لیتا پھر رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابعِ ستارہ نہیں

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی آسمان کی آنکھ نے کبھی دیکھا ہے؟ آپ نے غور کیا کہ ایک عقیدہ کے بدل جانے سے کس طرح قوموں کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ عقائد کی قوت بڑی ناقابلِ شکست اور ان کی گرفت ایسی محکم ہوتی ہے کہ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور قوت نہیں کر سکتی۔

لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ چونکہ یہ عقیدہ کہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے، عملی دنیا میں چل نہیں سکتا، اس لئے ہم، ایک کش مکش میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں۔ کوئی شخص ہمارے کسی عزیز کو

ہماری دوعملی

قتل کر دیتا ہے۔ عقیدہ ہمارا یہ ہے کہ یہ سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ مقتول کی عمر ہی اتنی تھی۔ اس کے مقدر میں اسی طرح قتل ہونا لکھا تھا۔ قسمت کے لکھے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔ زبان سے یہ کچھ کہتے جاتے ہیں اور قاتل کے خلاف استغاثہ بھی دائر کر دیتے ہیں۔ استغاثہ دائر کرتے ہیں تو، ایک طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے، لیکن اس کے ساتھ، مقدمہ کی کامیابی کے لئے ہر ممکن تدبیر بھی اختیار کرتے ہیں۔۔۔ حتیٰ کہ اس میں جائز اور ناجائز تک کی تمیز بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کامیابی ہوتی ہے تو اپنی حسنِ تدبیر کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ ناکامی ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ خدا کو منظور ہی ایسا تھا۔

بچہ بیمار ہوتا ہے تو عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ خدا نے پہلے سے لکھ رکھا ہوتا ہے کہ اس نے کب بیمار ہونا ہے۔ کتنے دن تک بیمار رہنا ہے اور اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ لیکن عمل یہ ہوتا ہے کہ اس کے علاج کے لئے دوڑے دوڑے پھرتے ہیں۔ افاقہ نہیں ہوتا تو علاج بدلتے ہیں۔ ڈاکٹر سے ہر روز پوچھتے ہیں کہ بخار کب ٹوٹے گا۔ منت سماجت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب! کچھ کیجئے جس سے بچّہ جلد اچھا ہو جائے۔ وہ اچھا ہو جاتا ہے تو ہر ایک سے اپنی تدبیر کی داد طلب کرتے ہیں اور معالج کی حذاقت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ وہ مر جاتا ہے تو اسے قضائے الٰہی کہہ کر پکارتے ہیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ ہم نے اسکے علاج میں تو کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن جب اس کی لکھی ہی اتنی تھی تو اس میں ہم کیا کر سکتے تھے اور اگر کوئی پوچھے کہ اگر یہ ٹھیک ہے کہ جو کچھ ہونا ہوتا ہے پہلے سے مقدّر ہوتا ہے اور قسمت کے لکھے کو کوئی بدل نہیں سکتا، تو تم اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتے ہو۔ کیا اس سے قسمت کا لکھا بدل جاتا ہے! تو اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا برحق ہے، لیکن تدبیر کرنا بھی فرض ہے!

ہر شخص اس قسم کے الفاظ دہرا دیتا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں! اگر تقدیر اٹل ہے تو پھر تدبیر کیوں فرض ہے!

ایک طرف یہ ایمان ہے کہ تقدیر اٹل ہے۔ اس سے انکار کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ ہم کافر نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف، اس سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اگر علاج نہ کرایا تو بچّہ مر جائے گا۔ سعی و کاوش نہ کی تو مقدمہ ہر جائے گا۔

یہ ہے وہ کش مکش جس میں ہم غیر شعوری طور پر، زندگی کے ہر موڑ پر مبتلا رہتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس تذبذب اور بے یقینی کی وجہ سے ہماری تدبیریں بھی ناکام رہ جاتی ہیں — کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کوئی نشانہ ٹھیک مقام پر جا کر نہیں بیٹھ سکتا — اگر قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر ہمارا ایمان ہو، تو اپنی ناکامی

اس کش مکش کا نتیجہ

پر ہم کھڑے ہو کر سوچیں کہ کس مقام پر ہمارا قدم متعلقہ قانون کے خلاف اٹھ گیا تھا۔ ہماری تدبیر میں کونسی کمی رہ گئی تھی۔ ہمارے پلان میں کونسا نقص تھا اور جب اس کا پتہ لگا لیں، تو اس کے لئے از سرِ نو کوشش کریں۔ ہو نہیں سکتا کہ کوشش، قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو کامیابی نہ ہو — بیج، زمین اور حفاظتی تدابیر صحیح ہوں تو فصل کیوں نہ اُگے؟ اور اگر ایمان یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے، خدا کے حکم سے ہوتا ہے، انسان کی تقدیر اَمِٹ ہے، تدبیر اسے بدل نہیں سکتی، تو پھر

پیش آمدہ معاملات کے لئے تدبیر کیوں کی جائے۔ اطمینان سے گھر بیٹھے رہیں۔ جو ہوتا ہے ہونے دیں۔ اور رفتہ رفتہ کشمکشِ حیات سے فرار کی راہ اختیار کر کے، غاروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے رہیں —

منکرمے بودن وہم رنگ مستاں زیستن — کا شعارِ زندگی تو انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔

یہ ہے وہ کشمکش جس میں یہ اُمت صدیوں سے مبتلا چلی آ رہی ہے اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ خدا کی زندہ و پایندہ کتاب ہمارے پاس ہے جو ہمارے عقائد و مسالک کے لئے سند و حجت ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے ہر مروجہ عقیدہ کو اس کتاب کی روشنی میں پرکھیں۔ جس کی تائید اس سے ہوتی ہو اسے قابلِ قبول سمجھیں۔ جس کی وہ تردید کرے، اسے مسترد کر دیا جائے۔ جب ہم اس طرح صحیح قرآنی نظریات کے حامل ہو جائینگے تو ہماری عظمتِ رفتہ ہمیں پھر سے مل جائے گی۔ اس لئے کہ

صحیح راہِ عمل

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

قرآنی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ، قانونِ مکافاتِ عمل ہے، یعنی یہ قانون کہ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ اس کے سامنے آکر رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار تسلیم کیا جائے۔ اگر صورت یہ ہو کہ جو کچھ وہ کرے اس میں اس کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہ ہو، اس سے مشین کی طرح سب کچھ کرایا جائے تو اس کے لئے جزا اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس تصور کی رُو سے، قانونِ مکافاتِ عمل، خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت اور حیاتِ آخرت، سب بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس سے نیچے اُتریئے، تو عقیدۂ جبر کی رُو سے، دنیاوی نظامِ عدل بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ جب ملزم کی صفائی (DEFENCE) کی دلیل یہ ہو کہ میں نے یہ جُرم اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں کیا، خدا نے ایسا لکھا تھا اس لئے ایسا ہو گیا، نہ اس نے ایسا لکھتے وقت مجھ سے پوچھا تھا اور نہ ہی مجھے اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ لہٰذا، مجھے مجرم کیوں قرار دیا جائے — اگر اس دلیل کو صحیح قرار دے دیا جائے تو پھر کوئی ملزم، مجرم قرار نہیں پا سکتا۔ اور جب کسی کو مجرم ہی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کے کئے کی سزا کیسی؟

نظامِ عدل ہی نہیں، اس عقیدہ کی رُو سے ضابطۂ اخلاق کی بھی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ جب انسان کو مجبور تسلیم کر لیا جائے تو کوئی شخص نہ اچھے کاموں کے لئے مستحقِ تحسین قرار پائے گا اور نہ ہی بُرے کاموں کے لئے سزاوارِ سرزنش۔ ہم نہ تو بکری کو خوش اخلاق کہہ سکتے ہیں، نہ شیر کو بدکردار۔۔۔ اس لئے کہ نہ وہ اپنی مرضی سے منکسر المزاج ہے اور نہ ہی یہ اپنے اختیار و ارادہ سے خوئے درندگی کا حامل۔۔۔ حسنِ خلق اور بدکرداری کا سوال بھی وہیں پیدا ہوتا ہے جہاں کسی کو صاحبِ اختیار تسلیم کیا جائے۔

آپ نے غور فرمایا کہ کسی زاویہ سے بھی دیکھئے، تقدیر کا مروجہ عقیدہ، قابلِ تسلیم قرار نہیں پاتا۔ اس کے برعکس، اس کی تباہ کاریوں کی زندہ شہادت، خود ہماری حالت ہے۔ قرآنِ کریم کا بنیادی قانون ہے کہ وَ مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰) تمہیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو تمہاری کوئی اپنی غلطی ہوتی ہے اور یا اس کا ذمہ دار تمہارے معاشرہ کا غلط نظام ہوتا ہے۔ اگر قرآن کی یہ تعلیم ہمارے سامنے ہوتی اور اس پر ہمارے عقیدہ اور عمل کی عمارت استوار ہوتی تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم ذلت اور پستیوں کے ان عمیق اور مہیب غاروں میں گر جاتے اور اگر کسی حادثہ کی وجہ سے ان میں گر بھی گئے تھے تو ان سے نکلنے کی کوشش نہ کرتے۔ یاد رکھئے! خدا نہ تو کسی قوم کو یونہی ذلتوں کے غاروں میں دھکیلتا ہے اور نہ ہی ان غاروں میں گری ہوئی قوم کو خود اٹھا کر باہر نکالتا ہے۔ عالمِ امر میں، خدا کی مشیت کارفرما ہے جس میں انسان دخل نہیں دے سکتا۔ عالمِ کون و فساد (کائنات) میں انسان کو صاحبِ مشیت بنایا گیا ہے، جس میں خدا، اپنے لامحدود اختیارات کے باوجود، دخل نہیں دیتا۔ انسانی آزادی کا یہ تصور، قرآنِ کریم کی منفرد تعلیم ہے جو دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ اگر خدا کو اس طرح قوانین کا پابند بنا دیا جائے تو اس کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ یہ اعتراض سطح بینی اور غلط نگہی پر مبنی ہے۔ اگر کوئی اور ہستی خدا کے اختیارات پر کسی قسم کی پابندی

ایک اعتراض

عائد کرے تو اس سے واقعی خدا کے قادرِ مطلق ہونے پر حرف آتا ہے۔ اگر خدا خود، اپنی مرضی سے، اپنے اوپر کوئی پابندی عائد کرتا ہے تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار ہونے میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ یہ تو بلکہ اس کے صاحبِ اختیار و اقتدار ہونے کی ایک اور دلیل اور شہادت ہے۔ جب وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کچھ قوانین متعین کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی کہہ دیتا

ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)۔ ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہوگی، تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار ہونے پر کیا حرف آتا ہے؟ بے شک وہ ان قوانین میں تبدیلی کرسکتا ہے لیکن جب اس نے خود ہی فیصلہ کردیا کہ وہ ان میں تبدیلی نہیں کرے گا تو پھر ان میں کون تبدیلی پیدا کرسکتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے، خدا کی ذات درمیان میں سے نکل جاتی ہے۔ اطاعت خدا کی نہیں اس کے قوانین کی رہ جاتی ہے۔ یہ اعتراض کرنے والے وہ لوگ ہیں جو دن رات کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر احکامِ خداوندی کی اطاعت سے، خدا درمیان میں سے نکل نہیں جاتا تو قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے خدا کس طرح درمیان میں سے نکل جائے گا۔ جب ہم کسی مملکت کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں تو وہ اگر اس مملکت کی اطاعت نہیں ہوتی تو اور کس کی اطاعت ہوتی ہے۔ ایسے اعتراضات کرنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ (۱) جب کوئی حکم مستقل طور پر دے دیا جائے، یعنی کہہ دیا جائے کہ یہ حکم غیر متبدّل رہے گا۔ اور (۲) اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا جائے کہ اس کے مطابق عمل کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا، تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ خدا کے غیر متبدّل احکام ہی اس کے قوانین ہیں جن کی اطاعت ضروری ہے۔ خدا نے پانی کو حکم دیا کہ وہ نشیب کی طرف بہے اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ہمیشہ ایسا کرے۔ تو خدا کا یہ حکم، اس کا قانون بن گیا۔ خدا کے جو احکام کائنات میں نافذ تھے

غیر متبدّل حکم، قانون بن جاتا ہے

(اور ہیں) وہ شروع ہی سے (قوانینِ فطرت کی شکل میں) غیر متبدّل تھے۔ انسانی زندگی سے متعلق اس احکام، جو وحی کے ذریعے دیئے جاتے رہے، ختمِ نبوت کے بعد، خود بخود غیر متبدّل قرار پاگئے اور قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کیا نتائج مرتّب ہوں گے اور ان سے سرکشی کا نتیجہ کیا۔ لہٰذا ان کے قانون ہونے میں بھی کیا شبہ رہ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ خدا کی "مرضی" یا اس کا "حکم" کیوں نہ کہا جائے۔ اس کے "قانون کی اطاعت" کیوں کہا جائے۔ الفاظ میں کیا دھرا ہے جو ان کی تبدیلی کو اس قدر اہمیت دی جائے۔ غوّاص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے۔ یہ درست ہے کہ الفاظ مقصود بالذات نہیں ہوتے اس لئے ان کی تبدیلی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن جب کچھ الفاظ یا اصطلاحات ایسا مفہوم اختیار کرجائیں جو اس مقصد کو نگاہوں سے اوجھل کردے جس کے لئے ابتداءً انہیں تجویز کیا گیا تھا اور وہ غلط مفہوم عام ہوجائے، تو اس صحیح مقصد

کو پھر سے سامنے لانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان الفاظ کی جگہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو صحیح مفہوم کے حامل ہوں۔ "خدا کی مرضی" یا "خدا کے حکم" سے ہمارے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہر آن بدل سکتے ہیں۔ آج اُس کی مرضی کچھ اور ہے، کل کچھ اور ہو جائے گی۔ قانونِ خداوندی کہنے سے اسکا غیر متبدل ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

لیکن "حکم یا مرضی" کے تصور کا اس سے بھی زیادہ دُور رس نتیجہ ایک اور ہے اور وہ بہت اہم ہے۔ ایک شخص اپنے ملازم کو حکم دیتا ہے کہ یہ چھٹی فلاں صاحب کو دے آؤ۔ اب اسے نہ اس کا علم ہے کہ اس چھٹی میں کیا لکھا ہے، نہ یہ معلوم کہ یہ چھٹی ان صاحب کو کیوں بھیجی جا رہی ہے۔ اس کا کام اس حکم کی تعمیل ہے اور بس۔

حکم اور قانون میں فرق

نہ ہی وہ اپنے آقا سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس نے اُسے ایسا حکم کیوں دیا۔ حتیٰ کہ اس چھٹی اور اس کی ترسیل میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس میں اس کے آقا کا کوئی مقصد مضمر ہوتا ہے۔ اگر اس سے پوچھا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے گا کہ میں اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس خوش اسلوبی سے اس لئے کرتا ہوں کہ اس سے وہ خوش ہوتا ہے۔ مجھے اس کی خوشنودی مقصود ہے۔

ہم (حکم اور مرضی کے تصور کے ماتحت) احکامِ خداوندی کی جو اطاعت کرتے ہیں تو اس کا انداز بعینہٖ یہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس کے قانون کی اطاعت کی جائے تو اس کی شکل اور نتیجہ کچھ اور ہو گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر آپ سے کہتا ہے کہ یہ دوائی لو، اسے اس طرح استعمال کرو اور اس کے ساتھ یہ پرہیز کرو۔ اس سے، زیادہ سے زیادہ، تین دن میں تمہاری تکلیف رفع ہو جائے گی۔ آپ اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ اگر تین دن کے بعد آپ کی تکلیف رفع نہیں ہوتی تو آپ سوچتے ہیں کہ اس پروگرام میں کہاں نقص واقع ہو گیا ــــ ڈاکٹر کی تشخیص غلط تھی۔ نسخہ صحیح تجویز نہیں ہوا۔ دوائی اصلی نہیں ملی۔ اس کے استعمال میں کوئی غلطی ہو گئی۔ پرہیز ٹھیک ٹھیک نہیں ہو سکا اور اس تحقیق کے بعد، اس نقص کو رفع اور غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ــــ اور ایسا کرتے رہتے ہیں، تا وقتیکہ آپ کی تکلیف رفع نہیں ہو جاتی ــــ بالفاظِ دیگر جب قانون پر عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ سے پرکھا جا سکتا ہے کہ اس پر صحیح طریق سے عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

قرآنِ کریم نے جتنے احکام دیئے ہیں، ان کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ مرتب ہو گا۔ (قرآنِ کریم کی اصطلاح میں حکم کو "کتاب" اور اس کی غایت یا نتیجہ کو "حکمت" کہا جاتا ہے۔

اس نے جو کہا ہے کہ "کتاب و حکمت" دونوں منزّل من اللہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے یہ قوانین متعیّن کئے ہیں اسی نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا)۔ اب ہمیں دیکھنا ہوگا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس کا نتیجہ وہ کچھ مرتّب ہو رہا ہے یا نہیں جو خدا نے بتایا تھا۔ اگر ویسا نتیجہ مرتّب نہیں ہو رہا تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے۔ اور پھر اس کا ازالہ کرنا ہوگا۔ مثلاً قرآنِ کریم نے "اقامتِ صلوٰۃ" کا حکم دیا تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (۲۹/۴۵)۔ یقیناً صلوٰۃ، بے حیائیوں اور فریب کاریوں کو روک دے گی۔ اقامتِ صلوٰۃ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد اور معاشرہ میں بے حیائیاں اور فریب کاریاں باقی نہیں رہیں گی۔ ہم صلوٰۃ کے "حکم" کی تعمیل کر رہے ہیں اور ہو یہ رہا ہے کہ نمازیں پڑھی جا رہی ہیں اور افراد (بلکہ خود نمازیوں) اور معاشرہ میں بے حیائیاں اور فریب کاریاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ صدیوں سے ہمارا یہ عمل جاری ہے اور صدیوں ہی سے معاشرہ میں یہ برائیاں عام ہو رہی ہیں۔ ہم کبھی کھڑے ہو کر نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اقامتِ صلوٰۃ کو قانونِ خداوندی سمجھتے اور اس کا نتیجہ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ، تو جب اس کا یہ نتیجہ مرتّب نہ ہوتا تو ہم کھڑے ہو کر سوچتے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے تھے کہ (معاذ اللہ) کہنے والے نے غلط کہا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کا ایسا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ہمیں لامحالہ یہی کہنا پڑتا کہ ہمارے اس عمل میں کوئی غلطی ہے جس سے اس کا موعودہ نتیجہ مرتّب نہیں ہو رہا۔ اور اس کے بعد ہم، قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ دیکھ لیتے کہ وہ غلطی کیا ہے۔ اس کا ازالہ کرتے تو اس کا موعودہ نتیجہ متشکل ہو کر سامنے آجاتا۔

عمل کا نتیجہ مرتّب ہو رہا ہے یا نہیں

یہ تو ہم نے محض ایک مثال دی ہے۔ قرآنِ کریم کی ساری تعلیم کا یہی نہج ہے۔ اس میں ہر حکم اور اصول، قانون کی حیثیت سے دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا مرتّب ہوگا، اور وہ کس طرح اسی دنیا میں ہمارے سامنے آجائے گا۔ (آخرت کا نتیجہ اس پر مستزاد ہے) اگر قرآن میں اس کی وضاحت نہ کی جاتی تو ہمارے پاس، اس بات کے پرکھنے کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا کہ ان احکام پر صحیح طور پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہم نے قرآن کی اس حکمت کو نظر انداز کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم ان احکام کی (بزعمِ خویش) پابندی میں اس قدر مشقتیں بھی اٹھاتی ہے اور اس کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ "مذہب" اور "دین" میں فرق یہ ہے کہ مذہب میں احکام کی تعمیل کی جاتی ہے اور اس سے مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور بس۔ دین میں

قوانینِ خداوندی کی تعمیل کی جاتی ہے جس کا جیتا جاگتا، درخشندہ و تابندہ نتیجہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جب اسلام، دین کی حیثیت سے ہمارے سامنے تھا تو خدا کا تصور؛ قانون دینے والے کا سا تھا اور اس کے احکام کی تعمیل کی صحت و سقم کا اندازہ ان کے نتائج سے لگایا جاتا تھا۔ خدا کا بھی یہ تصور تھا اور اس کے نام پر قائم ہونے والی مملکت کا بھی یہی تصور۔ اس میں بھی اطاعت قانون کی ہوتی تھی، حکمرانوں کی مرضی کی نہیں۔ اس کے بعد جب دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا تو خدا کا تصور بھی ایک آمرِ مطلق کا سا ہوگیا اور حکمرانوں کی حیثیت بھی ڈکٹیٹروں کی سی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج "احکام کی اطاعت" کا مطلب تو ہماری سمجھ میں آتا ہے" قانون کی اطاعت" کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ یاد رکھئے، کسی قوم میں جس قسم کا خدا کا تصور ہوگا، اسی قسم کا، اس قوم کے معاشرہ کا نقشہ ہوگا۔ قرآنی تصور کا خدا، اپنی لاانتہا قوتوں کے باوجود، قاعدے اور قانون والا خدا ہے، اس لئے اسے ماننے والی قوم، دنیا میں انتہائی درجہ کی قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے والی قوم ہوگی۔ یہی تقدیر کا عملی مفہوم ہے یعنی اپنے اختیار و ارادہ سے قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔

اگر تقدیر کا یہ مفہوم قوم کے سامنے آجائے، تو اس قوم کی "تقدیر" دنوں میں بدل جائے۔ قرآن کی تعلیم کی تو کیفیت یہ ہے کہ

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود

اور

جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

والسلام

کتبہ عبدالجبار خوشنویس، کامونکے

اِنڈکس

اس کتاب میں جو آیات آئی ہیں (خواہ وہ پوری آیت ہو یا محض آیت کا حوالہ) انہیں صفحہ کیساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے تاکہ اگر آپ دیکھنا چاہیں کہ فلاں آیت کا مطلب کیا ہے تو اسے تلاش کرنے میں دِقت نہ ہو۔ حوالہ میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔